رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱ جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت:- پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتبی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبیؐ عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتداء میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات، اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بہ روایات صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں،

پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق و فضائل، اور آداب کے عنوانوں اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے،

قیمت بڑی تقطیع	حجم	قیمت اصلی	قیمت رعایتی	قیمت چھوٹی تقطیع	حجم	قسم اول	قسم دوم
سیرۃ النبیؐ حصہ اول	×	×	×	سیرۃ النبیؐ حصہ اول	۵۶۱	×	للعہ
،، ،، دوم	۳۵۱	سے ۲ز	للعہ	،، ،، دوم	۴۳۸	صہ	سے ۸
،، ،، سوم	۵۹۶	للعہ	عا ۸	،، ،، سوم	۷۹۴	صعہ	صہ
،، ،، چہارم	۶۰۶	سے	للعہ	،، ،، چہارم	۸۰۰	۸سعہ	۸عہ
،، ،، پنجم	۳۶۰	للعہ	۸عا	،، ،، پنجم	۴۹۲	صہ	سے ۸
،، ،، ششم	۶۱۲	صہ	للعہ	،، ،، ششم	۸۶۲	۸سعہ	۸عہ

جلد ۵۳ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۴ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اُردو اور ہندوستانی کے مقابلہ میں ایک نئی زبان "ہندی ہندستانی" کی پُرفریب اصطلاح سب سے اوّل "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کے اجلاس ناگپور ۱۹۳۶ء میں وضع ہوئی، پھر یہیں "ودیا مندر" کی اُردو کش تعلیمی سکیم مرتب ہوئی، آج بھی اُردو نوازی میں صوبہ متوسط بہت "نیک نام" ہے، اس لئے یہاں اردو کے بقا و تحفظ کے لئے خدامِ اردو کی خاص توجہ کی ضرورت تھی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب عرصہ سے اس فرض کو انجام دے رہے تھے، اب اس سلسلہ میں کل ہند انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء کو نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی صدارت میں بڑے اہتمام سے ناگپور میں منعقد ہو رہا ہے اور اس میں اردو زبان و ادب کی اشاعت و ترقی کے لئے بہت اہم تجاویز پیش ہونگی، توقع ہے کہ یہ اجلاس اردو کی عام نشر و اشاعت خصوصاً صوبہ متوسط میں اس کے تحفظ اور ترقی کے مفید عملی نتائج پر مشتمل ہوگا،

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے عربی کے دس دیوان ہیں، اب تک ان کے مکمل چھپنے کی نوبت نہیں آئی، عرصہ ہوا حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان میں پہلے سات دیوانوں کا جو سبعہ سیارہ کے نام سے موسوم ہیں انتخاب شائع کیا تھا، آسی پریس نے اس انتخاب کو علٰحدہ کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا تھا جو شاید اب بھی کتب فروشوں کے یہاں ملتا ہو، آخری تینوں دیوان یعنی آٹھویں نویں اور دسویں مکمل کمیاب تھے، مولانا راغب صاحب بدایونی لکچرار شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈہ نے ان کو تلاش کرکے حاصل کیا ہے اور ان کو تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں،

جن اصحابِ علم کے پاس ان دواوین یا آزاد کی مثنوی مظہر العجائب کا کوئی نسخہ ہو وہ مہربانی کرکے مولانا موصوف کو اس سے مطلع فرمائیں، یہ ایک علمی خدمت ہوگی، دسویں دیوان کے آخر میں آزاد کے قلم سے دسوں دیوانوں کی تصنیف کے مختصر حالات ہیں، مثنوی مظہر البرکات کا ایک عمدہ نسخہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہے،

انجمن عربی صوبہ متحدہ الہ آباد کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مسلمان طلبہ میں عربی زبان کی تعلیم کی ترغیب وتشویق اور ان کی حوصلہ افزائی کا کام عرصہ سے انجام دے رہی ہے، اس سلسلہ میں اس نے گذشتہ سال ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب لکچرار عربی گورنمنٹ کالج لاہور کے انگریزی رسالے "ہم عربی زبان کیوں سیکھیں" (why we Learn The Arabic language) کی بہت سی کاپیاں لکھنؤ، الہ آباد اور علی گڈہ کی یونیورسٹیوں کے ایم اے کے طلبہ میں مفت تقسیم کیں، اب وہ ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کے عربی طلبہ میں تقسیم کرنے کے لئے اس کا اردو ترجمہ شائع کرنا چاہتی ہے، کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اس میں کافی مصارف ہوں گے، جس کا تحمل تنہا انجمن مذکور کے لئے دشوار ہے، اس لئے جو اصحاب خیر اس میں مالی مدد دینا چاہیں وہ پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب نمبر ۲ ایلجن روڈ الہ آباد سے خط وکتابت فرمائیں،

حیدرآباد کے ایک خانگی کتب خانہ میں حافظ ابن قیم جوزی کی جانب منسوب ایک کتاب "احکام اہل الذمہ" دستیاب ہوئی ہے، مصنف کے کل پچاس ساٹھ سال بعد کی لکھی ہوئی ہے، اس کی ضخامت چھ سو صفحات ہے، کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ "دوسرے حصہ میں دلیل خاص سے بیان شروع ہوگا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور بھی حصے ہیں، ابن جوزی کی معلوم کتابوں میں اس کتاب کا نام نہیں ہے اور نہ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کی فہرستوں میں اس کا کوئی ذکر ہے، اگر کسی صاحب علم

کی واقفیت میں اس کتاب کا کوئی اور نسخہ خصوصاً دوسرا حصہ ہو تو اس سے مطلع فرمائیں،

دارالمصنفین میں تاریخ اسلام کا جو وسیع سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ بحمداللہ ختم کے قریب ہے، اس میں تیرہ صدیوں کے اندر دنیائے اسلام میں جتنی بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں ان سب کی سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ ہوگی، اس سلسلہ کی تیسری جلد بنی عباس کی تاریخ کا پہلا حصہ زیر طباعت ہے، عباسی حکومت کسی نہ کسی شکل میں تقریباً چھ سو برس تک قائم رہی اور اس کے گوناگوں علمی و تمدنی کارنامے ہیں، اس لئے اس کو تین حصوں میں تقسیم کردینا پڑا، پہلے حصہ میں عہد عروج کی تاریخ ہے، دوسرے میں دور زوال کی، تیسرا حصہ علمی اور تمدنی کارناموں پر مشتمل ہوگا، تاریخ ہند کے سلسلہ کے بعض حصے بھی تیار ہیں، امید ہے کہ اس سال اس کا پہلا حصہ جو سندھ میں اسلامی حکومت کی تاریخ کے متعلق ہے، پریس میں چلا جائے،

گذشتہ معارف میں حیات شبلی کی تیاری کی اطلاع دی جاچکی ہے، صرف تصویروں کے بلاک کی تیاری میں کچھ دیر ہوگئی تھی، اب تصویریں بھی چھپ گئی ہیں، اور کتاب بالکل تیار ہے، اس کی ضخامت مع مقدمہ اور دیباچہ وغیرہ کے ۹۲۰ صفحے ہے، دارالمصنفین، ندوہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور شبلی انٹر کالج کی عمارتوں کے ۱۳ ہاف ٹون بلاک فوٹو ہیں، کاغذ اور دوسرے سامان طباعت کی موجودہ گرانی کے اعتبار سے کتاب کی تیاری پر بڑی لاگت آئی ہے، لیکن شائقین کی سہولت اور عام اشاعت کے خیال سے علاوہ محصول ڈاک کل آٹھ روپیہ قیمت رکھی گئی ہے،

علم و ادب کے ایک شائق کے پاس نظامی گنجوی کی مثنوی شیریں خسرو کا ایک قدیم قلمی نسخہ اچھی حالت میں ہے، صفحات کی تعداد دو سو ستر اور مجدول مطلا ہے، وہ اسے الگ کرنا چاہتے ہیں، جو صاحب ذوق اس کو خریدنا چاہیں وہ جناب حامد حسن صاحب ایم اے قیصرین راہپور روڈ دہرہ دون سے خط و کتابت کریں،

مقالات

تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۵)

ملوکیت کے بعد کلام مجید کے نزول اس کی ترتیب و تدوین کی تاریخ اور تفسیر قرآن کی بحث ہے، اول الذکر خالص تاریخی ہے، اس لئے مصنف کو اس میں اپنے ذاتی خیالات کی آمیزش اور تدلیس کا بہت کم موقع ملا ہے اور ایک دو معمولی فروگذاشتون کے علاوہ باقی ان کے بیانات صحیح ہین، لیکن تفسیر کی بحث مین اونھون نے حسب معمول صحیح اور غلط واقعات کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے، اور ان سے ایسے غلط نتائج نکالے ہین، کہ اس سے تفسیرون کا اعتبار اوٹھ جاتا ہے، اس بحث مین انھون نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے، کہ صحابۂ کرام نے تفسیر قرآن کی جانب زیادہ اعتنا نہین کیا، سب سے اول تابعین نے تفسیر لکھنے کی طرف توجہ کی لیکن اس دور مین پورے قرآن کی تفسیر نہین لکھی گئی، اس کا آغاز چوتھی صدی سے ہوا، اس دور مین بیرونی اثرات کی وجہ سے بہت سے غیر قومون کے خیالات اور ان کی دور از کار روایات تفسیرون میں شامل ہوگئین چنانچہ لکھتے ہین :-

"قرآن کریم کا زیادہ حصہ آیات محکمات پر مشتمل تھا جن میں اوامر و نواہی و فرائض کے احکام وغیرہ ہوتے تھے، جن پر مسلمان اسی وقت عمل شروع کر دیتے تھے، .... جو آیات متشابہات نازل ہوتی تھین .... ان پر عوام

کو بحث و مباحثہ کی ممانعت کر دی گئی تھی، لیکن ساتھ ہی قرآن کریم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس پر تدبر و فکر کی دعوت بار بار دی گئی ہے، اور جس کے سمجھنے کی انسان کو ضرورت ہے،... معمولی انسان اوامر و فرائض سے متعلق آیات کو فوراً سمجھ لیتے تھے، لیکن بہت سے مضامین ایسے ہوتے تھے، جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھے، اس لئے جب صحابہ کرام کو کسی آیت کے صحیح مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی، تو وہ خود رسول کریم کی خدمت میں حاضر ہو کر سمجھ لیتے تھے،.... اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی آیاتِ الٰہی کی ضروری تشریح صحابہ کرام کے سامنے کر دیا کرتے تھے"

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ کسی نے تفسیر لکھنے کی کوشش کی، نہ تفسیر کے متعلق زیادہ روایات ہیں،.... وہ تمام تفسیری روایتیں جو صحابہ کرام کے ذریعہ رسول سے آئیں، کل بیس صفحات پر مشتمل ہیں (ص ۱۴۳)

"خلفاے راشدین، حضرت عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب اور زید بن ثابت نے بہت سی آیاتِ قرآنی کی تفسیریں روایت کیں، لیکن پہلی صدی کے اخیر تک کوئی تفسیر کتابی شکل میں نہیں لکھی گئی" [۱۴۳]۔

"عہدِ صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا، اس وقت سب سے پہلے تفسیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اور مسلمانوں کو اس طرف توجہ ہوئی اور انھوں نے احادیثِ رسول اور تفسیروں کو لکھنے کا ارادہ کیا، (ص ۱۴۴)

"سب سے پہلی تفسیر مجاہد بن جبیر المتوفی ۱۰۳ھ نے لکھی، تاریخ القرآن میں سعید بن جبیر کو پہلا مفسر قرآن بتایا گیا ہے، لیکن ابن خلکان کے بیان کے مطابق سب سے پہلی تفسیر اسلام میں ابن جریج نے لکھی، یہ ۸۰ھ میں ایمان لائے، اور ۱۵۰ھ میں وفات پائی، اس زمانہ میں ان کے علاوہ عطا ابن دینار المتوفی ۱۲۶ھ، مقاتل بن سلیمان المتوفی ۱۵۰ھ، سفیان ثوری المتوفی ۱۶۱ھ اور دیگر چند علما نے تفاسیر میں کتب کی تصنیف کا آغاز کیا، لیکن تیسری صدی کے آخر تک پورے قرآن کی

تفسیر کا ثبوت نہیں ملتا، ہارون رشید کے زمانہ میں جب جعفر برمکی نے کاغذ کو رائج کیا، تو کتابت کا شوق بڑھا، اس زمانہ مین پورے قرآن کی تفسیرین بھی لکھی گئین، (ص ۱۴۴)

"اسلام کے دور اول یعنی خلافت راشدہ کے ختم ہونے تک رومی اور عجمی عقائد کی زہریلی ہوائین اس کے مضبوط حصار مین داخل نہ ہونے پائی تھین،..... لیکن جب خلافت کو سلطنت کا جامہ پہنا دیا گیا، اور خلفاء کے بجائے ملوک و سلاطین مسلط ہوئے، جنھون نے حکومت کو اپنے خاندان مین محفوظ رکھنے کے لئے خود قرآن کریم کے مستقر اول یعنی مکہ اور مدینہ دونون بلاد امنا کو میدان کارزار و فتنہ و فساد بنا ڈالا، اور اسلام اپنے وطن سے بیگانہ سا ہوگیا تو رومی اور عجمی عقائد کی طوفان خیز ہواؤن کو کون روک سکتا تھا، جب چمن کا باغبان غافل ہو تو گلچین کے دست برد سے اس کو کون محفوظ رکھ سکتا ہے.... جب عرب کے یہود و نصاریٰ اور ایران کے مجوسیون نے اسلام مین داخل ہونا شروع کیا تو یہ سب اپنے آبا و اجداد کے مذہبی تخیلات قدیم و پارینہ روایات اپنے ساتھ لے کر آئے، ادھر کوئی طاقت ان کو روکنے یا اصلاح کرنے والی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان قصص و روایات اور اسرائیلیات و خرافات کا ایک بے پناہ سیلاب اسلام مین داخل ہوگیا، اور اس کے سیدھے سادے اور فطری اصول و عقائد کے صاف و شفاف چشمون کو اپنے ساتھ لائی ہوئی گندگیون مین آلودہ کر دیا، (ص ۱۴۶)

"تکوین عالم، تخلیق آدم اور گذشتہ انبیا کے واقعات و قصص جب مسلمانون کے سامنے قرآن مجید مین آئے تو انھون نے ان کو یہودی علماء سے دریافت کرنا شروع کر دیا، کیونکہ ان تمام چیزون کا ذکر ان کی کتابون میں آچکا تھا، (صفحہ ۱۴۷)

مصنف کا یہ بیان اگرچہ انفرادی واقعات کی حیثیت سے ایک حد تک صحیح ہے لیکن اغلاط سے پاک نہیں، اور ان واقعات کا صرف ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے، خصوصاً جس نہج اور ترتیب سے اس کو پیش کیا گیا ہے، اور اس سے جو نتائج نکلتے ہیں، وہ سراسر غلط ہین، اس بیان کے پڑھنے سے یہ اثر پڑتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ مین

تفسیر قرآن کا زیادہ اہتمام نہ تھا، کلام اللہ کا بڑا حصہ صحابہ خود سمجھ لیتے تھے جو نہ سمجھ سکتے تھے، اس کو آنحضرتؐ
پوچھ لیا کرتے تھے، یا آپ خود اس کی تشریح فرمادیا کرتے تھے، اسی لئے نہ صحابہ سے تفسیر کی زیادہ روایتیں
نہ اونھوں نے تفسیر لکھنے کی طرف توجہ کی، سب سے اول تابعین کو ادھر توجہ ہوئی لیکن اونھوں نے پورے
کی تفسیر نہیں لکھی، اس کا آغاز چوتھی صدی مین ہوا، اس وقت یہود و نصاریٰ اور عجمیوں کے خیالات وروایات
مین پھیل چکے تھے، جو تفسیرون مین داخل ہوگئے تھے اسلئے یہ تفسیرین لائق اعتماد نہین،

ان مین سے ایک نتیجہ بھی صحیح نہین، مصنف کو اتنا تو تسلیم ہی ہوگا، کہ قرآن مجید ہی اسلام کی بنیاد او
کی دینی اور دنیوی صلاح و فلاح کا واحد صحیفہ ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی تبلیغ کے لئے مبعو
ہوئے تھے، اس لئے آپ کا سب سے مقدم فرض اس کی وضاحت و تشریح اور مسلمانون مین اسکی تعلیم کی اشاع
اس لئے اس کی تعلیم کی اہمیت اس سے کہین زیادہ ہے، جتنی مصنف کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے، کہ صح
قرآن کو سمجھ لیتے تھے، اور جہان کوئی مشکل پیش آتی تھی، اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے تھے، یا
خود اس کی تشریح فرمادیتے تھے اور اسی پر قرآن کی تعلیم و تشریح ختم ہوجاتی تھی، اس کے برخلاف عہ
عہد صحابہ عہد تابعین ہر دور مین کلام مجید کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا جن صحابہ مین تعلیم و تعلم کی صلاحیت تھ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس خصوصیت کے ساتھ قرآن کی تعلیم دیتے تھے، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ
مسعود، حضرت ابی بن کعبؓ اور بعض دوسرے صحابہ کو آپ نے خاص طور سے خود قرآن کی تعلیم دی تھی حضرت ا
کعبؓ نے پورے قرآن کی تعلیم خود زبان مبارک سے پائی تھی[۱] حضرت عبداللہ بن مسعود نے آپ سے ستر سورتین سیکھی تھ
حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے بھی قرآن کی
براہ راست زبان وحی والہام سے حاصل کی تھی، گو عہد نبوی مین حضرت ابن عباسؓ کم سن اور حضرت
نوجوان تھے لیکن ان دونون مین فہم قرآن کی فطری صلاحیت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن

[۱] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۱۳ [۲] بخاری جلد ۲ صفحہ ۴۸،

کے لئے دعا فرمائی تھی کہ خدایا ان کو دین میں سمجھ اور تاویل قرآن کا علم عطا فرما[1]، اس دعاے مستجاب کے اثر اور اپنے شوق و محنت سے وہ جماعتِ صحابہ میں قرآن کے اتنے بڑے عالم بن گئے تھے، کہ ترجمان القرآن لقب ملا تھا، عبد اللہ بن عمر میں فہم قرآن کا ایسا ملکہ تھا کہ گو وہ نوجوان تھے لیکن اکابر صحابہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، اور اس مجمع میں ان کے فہم قرآن کے جوہر نمایاں نظر آتے تھے[2]۔

اس انفرادی طریقۂ تعلیم کے علاوہ تعلیم قرآن کے اجتماعی حلقے بھی تھے[3] جن میں صحابۂ کرام باہم مذاکرہ کرتے تھے، ان میں کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوتے تھے، صفہ کی درسگاہ میں دو حلقے تھے، ایک اصحاب ذکر و فکر کا، دوسرا قرار کا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لاتے، تو قرار کے حلقہ میں بیٹھتے، اور فرماتے کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں[4]، اس درسگاہ میں حافظ قرآن صحابہ تعلیم دیتے تھے، جن میں ایک حضرت عبادہ بن صامت تھے[5]، جن لوگوں کو کاروبار کی مشغولیت کی وجہ سے دن کو تعلیم کا موقع نہ ملتا تھا، ان کے لئے رات کی تعلیم کا انتظام تھا، چنانچہ بعض اصحابِ صفہ رات کو قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے[6]۔

جو جدید الاسلام اشخاص اور قبائل مدینہ سے دور رہتے تھے، اور ان کو مدینہ آنے کا کم موقع ملتا تھا، ان کی تعلیم انصار کے سپرد تھی، وفد عبد القیس کا بیان ہے، کہ انصار ہم کو ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دیتے تھے[7]، اس قسم کے جدید الاسلام قبائل کی تعلیم کے اور بہت سے واقعات حدیث و سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں،

جو اشخاص یا قبائل کسی معذوری کی بنا پر مدینہ نہیں آسکتے تھے یا بقدر ضرورت یہاں قیام نہیں کرسکتے تھے، ان کی تعلیم کبھی وہاں کے مسلمان عمال کے سپرد کر دیجاتی تھی، اور کبھی مستقل معلم بھیجے جاتے تھے، چنانچہ یمن کے مسلمانوں کی قرآن اور شرائعِ اسلام کی تعلیم حضرت معاذ بن جبلؓ کے متعلق تھی، جو وہاں کے قاضی تھے[8]، ہجرت سے

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۵۳۴ [2] بخاری کتاب التفسیر سورہ ابراہیم و کتاب العلم باب الفہم [3] ابو داؤد فضل العلم والحث علی العلم [4] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۲۴ [5] ایضاً [6] اسد الغابہ ج ۴ ص [7] [8] استیعاب تذکرہ معاذ بن جبلؓ

پہلے جب مدینہ کے چند انصاری گھرانون نے اسلام قبول کیا، تو اون کی تعلیم قرآن کے لئے حضرت مصعب بن عمیرؓ اور ابن ام مکتومؓ بھیجے گئے،[1] تعلیم قرآن سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے، کہ وہ محض ناظرہ اور حفظ قرآن تک محدود تھی، بلکہ حسب ضرورت قرأۃ اور قرآن کی تفسیر و تشریح ہر طرح کی تعلیم ہوتی تھی، بعض لوگ محض قرأۃ یا احکام کی آیات سیکھتے تھے، بعض پوری تکمیل کرتے تھے، حضرت ابی بن کعبؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم کو دس آیتین پڑھاتے تھے، تو اس وقت تک ہم آگے نہ بڑھتے تھے جب تک ان پر عمل نہ سیکھ لیتے تھے،[2] ابن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے کہ جب ہم مین سے کوئی شخص دس آیتیں سیکھ لیتا تھا، تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتا تھا جب تک ان کے معنی اور ان پر عمل نہ سیکھ لیتا تھا،[3]

تابعین کے زمانہ مین بھی تعلیم کا یہی انداز تھا، ابو عبدالرحمٰن سلمی تابعی کا بیان ہے کہ جب ہم قرآن کی دس آیتیں سیکھ لیتے تھے، تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے جب تک ان کے حلال و حرام اور امر و نہی سے پوری طرح واقف نہ ہو جاتے،[4]

مشہور مفسر تابعی مجاہد بن جبیر نے ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کامل تیس مرتبہ قرآن کا دورہ کیا تھا، اور اس محنت کے ساتھ کہ ہر سورۃ کے جملہ متعلقات کی پوری تحقیق کرتے جاتے تھے،[5]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اپنے محبوب غلام اور نامور تابعی عالم عکرمہ کو اس توجہ اور انہماک سے تعلیم دی تھی کہ اپنا سارا علم ان کے سینہ مین منتقل کر دیا تھا، ان کے فیض سے عکرمہ جماعت تابعین مین بڑے نامور عالم ہوئے، خصوصاً تفسیر مین ابن عباسؓ کے تمام تلامذہ مین وہ ممتاز تھے،[6]

حفاظ قرآن صحابہ خصوصاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فیض سے تابعین مین بڑے بڑے مفسر پیدا ہوئے ان مین سعید بن جبیر، ضحاک بن مزاحم، عطا بن رباح، حسن بصری اور محمد بن کعب قرظی خاص طور سے قابل ذکر ہین،

---

[1] بخاری کتاب التفسیر [2] تفسیر قرطبی ج اول ص ۳۳ [3] ابن جریر ج اول ص ۲۹ [4] تفسیر قرطبی ج اول ص ۳۳
[5] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳ [6] ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۲ و تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۶۵،

ان میں سے ہر ایک امام تفسیر تھا، سعید بن جبیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد رشید تھے، قرأت اور تفسیر دونوں کی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی، اور جماعت مفسرین میں امام وقت شمار ہوتے تھے[1] عطا بن رباح نے ابن عباسؓ کے علاوہ اور بزرگوں سے بھی استفادہ کیا تھا، یہ بھی جلیل القدر عالم اور مفسر قرآن تھے، تفسیر کا درس بھی دیتے تھے[2] حضرت حسن بصری علم باطن کے ساتھ علم ظاہر کے بھی جلیل القدر عالم تھے، تفسیر میں خاص ملکہ تھا، اور اس کا درس بھی دیتے تھے[3] محمد بن کعب قرظی بھی نامور عالم قرآن تھے[4] یہ تو صحابۂ کرام اور تابعین کے انفرادی حلقہائے درس کا حال تھا، حکومت کی جانب سے علٰحدہ قرآن کی تعلیم کا نہایت مکمل انتظام تھا، حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ممالک میں قرآن کے مدارس قائم کئے، اور قرآ صحابہ کو ان میں تعلیم کے لئے بھیجا، حضرت عبادہ بن صامتؓ معاذ بن جبلؓ اور ابو درداء انصاریؓ کو شام بھیجا، حضرت عبادہؓ نے حمص میں قیام کیا، ابو درداؓ نے دمشق کو مستقر بنایا، معاذؓ بن جبل نے فلسطین میں اقامت اختیار کی، پھر عبادہؓ بھی اسی ارض مقدس میں چلے آئے[5] عمران بن حصین قرآن اور فقہ کی تعلیم کے لئے بصرہ بھیجے گئے[6] ایک قاری ابو سفیان کو بدوؤں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا، وہ قبائل کا دورہ کرکے ہر شخص کا امتحان لیتے تھے، جس کو قرآن یاد نہ ہوتا تھا اس کو سزا دیتے تھے[7] سورۂ بقرہ، مائدہ، حج اور نور کا جن میں احکام و فرائض ہیں، ہر شخص کے لئے سیکھنا ضروری قرار دیا[8] اس سے ظاہر ہے کہ اس میں تفسیر بھی شامل تھی، قرآن کے معنی اور مفہوم کو صحیح سمجھنے کے لئے لغت اور کلام عرب کی تعلیم کی ہدایت کی، غیر عالم لغت کو قرآن کی تعلیم دینے کی ممانعت کر دی[9]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لیکر تابعین کے زمانہ تک کے تعلیم قرآن کے نظام کا یہ سرسری خاکہ ہے، اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان زمانوں میں قرآن کی تعلیم کی کتنی اہمیت تھی اور اس کا کتنا اہتمام تھا،

---

[1] ابن خلکان ج اول ص ۲۰۴ و ۲۰۵ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ [3] شذرات الذہب ج اول ص ۱۳۶، و تہذیب تذکرہ جابر بن زید [4] تہذیب جلد ۹ ص ۴۲۱ [5] اسد الغابہ تذکرہ عبادہ بن صامت [6] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۶۵
[7] اصابہ تذکرہ اوقل بن خالد [8] کنز العمال ج اول ص ۲۲۴ [9] کنز العمال،

مصنف کے بیان کے مطابق محض اسی پر بس نہین تھا، کہ احکام و فرائض و محکمات خود صحابہ سمجھ لیتے تھے، اور جب کسی صحابی کو کسی آیت کا صحیح مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے یا آپ ضروری تشریح فرما دیتے" اگر مصنف کا بیان صرف اسی حد تک ہوتا تو بھی ہم کو اس کے ماننے مین تامل نہ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس دور مین تعلیم و تفسیر قرآن کا اہتمام نہ تھا" اسی لئے حیات نبوی میں نہ کسی تفسیر لکھنے کی کوشش کی، اور نہ تفسیر کے متعلق صحابہ کی زیادہ روایات ہین، بلکہ ان کی پوری تعداد بیس سے نہین بڑھتی" کس قدر غلط ہے،

بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین کوئی تفسیر نہین لکھی گئی لیکن اس بنا پر نہین کہ اس کی کو نہ تھی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی مین تفسیر لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، صاحب وحی والہام ان خود موجود تھے، پھر عہد صحابہ مین اکابر صحابہ خود عالم قرآن تھے، اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی، کہ اس زمانہ میں علم و فن کو قلمبند کرنے کا رواج ہی نہ تھا، اور اس کا خزانہ علما رکا سینہ ہوتا تھا، عرب جاہلی کا سارا کلام محض مین محفوظ تھا، تعلیم و اشاعت کا طریقہ زبانی درس و روایت تھا، بنی امیہ کے زمانہ تک یہی طریقہ رائج رہا،

اگرچہ تاریخون مین اس عہد کی بعض تالیفات کا ذکر ہے لیکن وہ نہ ہونے کے برابر ہین، تصنیف و تا باقاعدہ آغاز عباسی دور سے ہوا، لیکن تحریری یادداشتون کا طریقہ عہد نبوی مین بھی تھا، چنانچہ متعدد ہ کے متعلق یادداشتین قلمبند کرتے تھے، حضرت ابی ابن کعبؓ کی تو ایک تفسیری کتاب کا بھی ثبوت ملتا ہے، خضری دمیاطی لکھتے ہین، کہ ابی بن کعبؓ کا ایک بڑا تفسیری نسخہ موجود تھا جس سے ابن جریر، ابن ابی حاتم، ا اور حاکم نے اپنی کتابون مین فائدہ اٹھایا ہے،[۱] تابعین مین مجاہد بن جبیر اور سعید بن جبیر تبع تابعین مین ابن کے متعلق خود مصنف کو اعتراف ہے، کہ انھون نے تفسیرین لکھیں، گو وہ ان کے نزدیک پورے قرآن کی تھیں تاہم اس سے کم از کم اتنا ثابت ہے، کہ گو اس زمانہ مین تفسیر پر موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے مستقل کتابین

---

[۱] مبادی التفسیر صفحہ ۱۱

لیکن ان کے متعلق تحریری سرمایہ فراہم ہوگیا تھا، مصنف کا یہ بیان کس درجہ مضحکہ خیز ہے کہ صحابہ سے تفسیری روایتیں بہت کم مروی ہیں، اوران کی تعداد بیس صفحوں سے زیادہ نہیں" لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ اعتراف بھی ہے کہ "خلفاے راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب اور زید بن ثابت نے بہت سی آیات قرآنی کی تفسیریں روایت کیں" کیا سات صحابۂ کرام کی "بہت سی" تفسیری روایات مل کر بھی بیس صفحوں سے زیادہ نہ ہوں گی، اگر تنہا ابن عباسؓ ہی کی روایات لے لیجائیں تو بھی ایک پوری کتاب تیار ہو جائے، مصنف نے ایک موقع پر ابن جریر کی بڑی تعریف کی ہے، لکھتے ہیں:۔

"ابن جریر کی تفسیر کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس کو امام التفسیر کہا جاتا ہے، اور بعض علماء کا قول اس تفسیر کے متعلق یہ ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر تفسیر طبری (ابن جریر) کو حاصل کرنے کے لئے کیا تو بھی کوئی زحمت نہیں اٹھائی، اس تفسیر میں سب سے پہلے ذہنی کاوش اور دماغی کوشش سے کام لیا گیا ہے اور اس وقت تک جتنے علوم قرآن کی تفسیر کے متعلق جمع ہو چکے تھے، اس میں ان سب کو جمع کر دیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ہر روایت کی سند بھی دے دی گئی ہے"۔

یہ کتاب تیس جلدوں میں ہے، اور اس میں تمامتر روایات ہی روایات ہیں، لیکن ان روایات میں صحابۂ کرام کی مستند روایات کا بھی معتدبہ حصہ ہے، اس کے بعد یہ کہنا کہ صحابۂ کرام کی روایات بیس صفحوں سے زیادہ نہیں کس درجہ حیرت انگیز ہے،

مصنف کا یہ بیان تشریح طلب ہے کہ "تابعین نے پورے قرآن کی تفسیر نہیں لکھی"، اگر اس سے ان کی یہ مراد ہے کہ موجودہ کتابوں کے طرز پر پورے قرآن کی مرتب تفسیر نہیں لکھی، تو یہ صحیح ہے، اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا، کہ اس زمانہ میں کتابوں کے لکھنے کا طریقہ نہ تھا، اور اگر یہ مراد ہے کہ قرآنی مشکلات کا حل باقی رہ گیا جس کو بعد کے مصنفین نے اپنی ذہانت سے گڑھا، تو یہ غلط ہے، تمام مشکلات قرآنی کا حل خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول اور صحابۂ کرام سے مروی ہے، جو حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں محفوظ ہے یہ اور بات ہے کہ بعد کے علماء

...یفین نے اپنے علم و نظر اور اپنے اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق اس مین اور اضافے کئے، صرف ابن جریر کی روایات
...کے ثبوت کے لئے کافی ہین، کہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ مین کلام مجید کی کسی حل طلب آیة کی تشریح باقی نہ رہ گئی
...گو وہ بعد مین کتابی صورت مین مدوّن ہوئی، اس لئے تفسیرون کے بعد مین مدوّن ہونے سے کلام مجید کی صحت
...یر پر اثر نہین پڑسکتا،

یہ بھی واضح رہے کہ کلام مجید کی ہر آیة کی تفسیر تو کسی بڑی سے بڑی تفسیر مین بھی نہین، بہت سی آیات اتنی
...ہر و واضح ہین، کہ ان کی تفسیر کی ضرورت ہی نہ تھی، بعض اہم مشکلات کی متفقاً تمام مفسرین نے تفسیر کی ہے،
...ن ایسی ہین جن کی تفسیر بعض مفسرین کے نزدیک ضروری تھی، بعض کے نزدیک غیر ضروری، اس کی مثال بلا تشبیہ
...یادی کتابون کی شرح سے دیجا سکتی ہے کہ ایک کتاب کی مختلف شرحین لکھی جاتی ہین، جامعیت کے اعتبار سے
...ن ہے ایک شرح دوسری سے بہتر ہو، لیکن پوری کتاب کی شرحین سب کہلائین گی، اس لئے دیکھنا صرف یہ
...ہئے کہ مجموعی حیثیت سے تمام حل طلب آیات کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی زبانی منقول ہے یا نہیں، اگر
...، تو پورے قرآن کی تفسیر کے لئے اتنا کافی ہے، یہ ضروری نہیں کہ مرتب طریقہ سے کسی ایک کتاب مین مدوّن یا کسی
...ے صحابی یا ایک تابعی سے منقول ہو، یہ واضح رہے کہ صحابہ کی جن تفسیری روایات مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کی
...صریح نہیں ہے، وہ بھی درحقیقت آپ ہی سے سُنی ہوئی ہین، یا کم از کم صحابۂ کرام کے فہم قرآن کا نتیجہ ہین جو آنحضرت
...صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم کا فیض ہے،

یہ انکشاف بالکل نیا ہے، کہ ہارون رشید کے زمانہ مین جب جعفر نے کاغذ کو رائج کیا، اس وقت کتابت
...شوق بڑھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کاغذ رائج نہ ہوا تھا، ممکن ہے آغازِ اسلام مین عرب مین اس کا استعمال نہ ہوتا ہو
...یکن عہدِ نبوی کے آخر مین تو رائج ہو چکا تھا، بخاری کی حدیثِ قرطاس تو بہت مشہور ہے، مصنف کو یہ تو سوچنا
...ہئے تھا، کہ خلفائے راشدین اور بنی امیہ کے زمانہ مین اتنی بڑی سلطنت کا دفتری کاروبار کیا صرف اونٹ کی
...یون اور کھجور کے پتون سے چلتا تھا، حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ مین باقاعدہ رجسٹر تیار ہو گئے تھے، لیکن مصنف کو

عقل و درایت سے کیا سروکار انھیں تو محض اعتراض چاہئے، خواہ وہ کتنا ہی بے سروپا کیون نہ ہو،

یہ تسلیم ہے کہ ملوک و سلاطین کے زمانہ مین اسلام کے حصار مین رومی و عجمی عقائد کی طوفان خیز آندھیاں آئین اس سے بھی انکار نہین کہ عرب کے یہود و نصاریٰ اور ایران کے مجوسی اپنے آبا و اجداد کے مذہبی تخیلات اور پارینہ روایات اپنے ساتھ لائے، اوران کے قصص و روایات و اسرائیلیات و خرافات کا بے پناہ سیلاب اسلام مین داخل ہوگیا، لیکن یہ غلط ہے کہ اس کا سبب ملوکیت تھی، اور اس کا کوئی روکنے والا نہ تھا، اوران بیرونی اثرات کی آمیزش کی وجہ سے حدیث و تفسیر کا سارا دفتر بے کار ہوگیا، ملوکیت کو اس سے کوئی تعلق نہین، بلکہ جیسا کہ ہم نے کسی مقام پر کہا ہے، یہ مختلف قومون اور مذہبون کے باہمی اختلاط کا فطری نتیجہ تھا، جس کے ابتدائی اثرات خلافتِ راشدہ ہی کے زمانہ سے شروع ہوگئے تھے، لیکن اس کا پورا ظہور اموی اور عباسی عہد مین ہوا، جس کو حکومت اور اسلام کے اصلی محافظین یعنی صحابہؓ، تابعینؒ اور علماء و محدثین نے روکنے کی پوری کوشش کی،

مصنف کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام نے اپنی اور مسلمانون کی حفاظت کی ذمہ داری تنہا حکومت پر کبھی نہین رکھی ہے، بلکہ یہ فرض علی قدر مراتب تمام مسلمانون پر عائد کیا ہے، اور اس کے سب سے بڑے ذمہ دار حاملین قرآن و حدیث ہین، اور الحمدللہ کہ مسلمانون مین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والی جماعت ہر دور مین موجود رہی ہے، خود خلفاے راشدین کے زمانہ مین بھی جنھون نے اسلام کی حفاظت کا پورا حق ادا کیا، یہ جماعت اپنے فریضہ سے غافل نہ رہی اور حکومت سے الگ صحابہ خود اپنے طور پر بھی اس فرض کو انجام دیتے رہے، خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے دور مین بھی جب اموی اور عباسی سلاطین نے بعض امور مین غفلت اور مسامحت سے کام لیا، تو اسلام لاوارث نہین ہوگیا تھا بلکہ یہ جماعت برابر اپنا فرض انجام دیتی رہی، درحقیقت اسلام کے اصلی محافظ یہی لوگ تھے، جو ہر زمانہ مین موجود اور اپنے فرض کو ہمیشہ انجام دیتے رہے، حتیٰ کہ حکومت کے مقابلہ مین بھی ان کی حق گو زبانین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے خاموش نہ ہین، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس لئے بعض امور مین گو ملوک و سلاطین نے غفلت ضرور کی، لیکن اس کی وجہ سے اسلام کی حفاظت

مین فرق نہین آنے پایا،

اس سے انکار نہین کہ تفسیرون بلکہ حدیثون تک مین اسرائیلی روایات داخل ہوگئین لیکن اس زہر کا تریاق بھی مہیا ہوتا رہا، اور ہر دور کے محدثین اس آمیزش کو برابر چھانٹتے رہے، اسی کی پرکھ کے لئے رجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا جس مین ہزارون رواۃ حدیث کے صحیح حالات مندرج ہین، فن روایت و درایت کے اصول بنائے موضوعات پر کتابین لکھین، غرض کلام ہی کو دوسرے کلام کی آمیزش سے پاک رکھنے کے لئے طاقتِ بشری مین جتنی کوششین اور احتیاطین ممکن تھیں صرف کر دین، اور ایک ایک باطل حدیث کو چھانٹ کر الگ کر دیا، احادیث و تفسیر پر جن لوگون کی نظر ہے، وہ ایک نگاہ مین اسرائیلیات کو پہچان سکتے ہین، بلکہ اسرائیلیات کا موضوع اور اس کا دائرہ تو اتنا معلوم اور متعین ہے، کہ جس کو تھوڑا سا بھی اسلامی علوم مین درک ہے، وہ بہ یک نظر ان کو پہچان لے گا، پھر یہ کہ ان اسرائیلیات کا تعلق اسلام کے ارکان و عقائد سے مطلق نہین ہے، بلکہ وہ صرف گذشتہ انبیاء و رسل اور ان کی امتون یا دنیا کی قدیم تاریخ ترغیب و ترہیب یا دوسرے قصص و حکایات پر مشتمل ہین، اور ان مین کسی چیز کو بھی اسلامی ارکان و عقائد سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اس لئے اسرائیلیات کی آمیزش سے اسلام کی حقیقی تعلیمات پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن اگر بالفرض اسے مان بھی لیا جائے کہ اصلی تعلیمات مین بھی اسرائیلیات داخل ہوگئین تو ان کو الگ کرنے کی تدبیرین اور صورتین اختیار کیجائین گی، یا ان کی وجہ سے مذہب کا پورا دفتر بیکار کر دیا جائے گا، اور اسرائیلیات کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثین اور روایتیں بھی مسترد کر دیجائین گی، سچ میں جھوٹ کی آمیزش تو زندگی کے روزانہ کے واقعات مین ناگزیر چیز ہے جس سے کسی حالت میں مفر ممکن نہیں، مقدمات میں جھوٹ کی آمیزش تو روزانہ کا مشاہدہ ہے، لیکن کیا اس آمیزش کی وجہ سے سچائی کی تحقیق کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، اور ایک حاکم محض جھوٹ کی آمیزش کی وجہ سے سچی شہادتون اور سچے واقعات کو بھی مسترد کر دیتا ہے، اور سچائی کی تلاش و تحقیق سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے، جھوٹی روایات میں سچائی اور اصلیت کی تلاش و تحقیق تو اس کا فرض ہے، اگر جھوٹ کی وجہ سے سچ کو بھی ناقابلِ اعتبار قرار دیدیا جائے، اور سچائی کی تلاش چھوڑ دیجائے، تو زندگی کا سارا کاروبار ہی معطل ہو جائے، جب دنیاوی امور

بن جھوٹ کے خاطر سچ کو ترک نہیں کیا جا سکتا، تو کیا محض اسرائیلیات یا جھوٹی روایات کی وجہ سے قول رسول کو منتشر کر دیا جائے گا،

اس کے بعد اسلامی عقائد اور تفسیروں میں ایرانی و یونانی خیالات و عقائد کی آمیزش کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"یہود و نصاری کے خرافات سے بھی زیادہ جس چیز نے اسلامی عقائد کو متاثر کیا، وہ ایران و یونان کا فلسفۂ قدیم تھا، جب ان ممالک کے علما و حکما اسلام میں داخل ہونے لگے، تو ایران سے زردشت، مزدک اور مانی کے خیالات اور یونان سے افلاطون، ارسطو اور دوسرے حکما کی تعلیمات نے مفسرین اسلام کو اس قدر متاثر کیا، کہ انھوں نے ان حکما کے غیر الہامی اور انسانی دماغ کے بنائے ہوئے مسائل کو مسلمات سمجھکر اختیار کر لیا، اور تمام تفاسیر میں دور از کار بحثیں اور غیر مفید الجھنیں شامل ہوگئیں، مثلاً برق، رعد، سماء وغیرہ قرآن مجید میں خود اپنے مستقل معنی رکھتے تھے، مگر جب یونانی علم الاصنام کی اصطلاحات کا ترجمہ اس قسم کے الفاظ میں کیا گیا، تو وہی مطالب تفسیروں میں شامل کر لئے گئے جو طبیعیات یونانی میں مستعمل تھے، متکلمین نے اسلامی عقائد و خیالات کو ارسطو کی کسوٹی پر رکھ کر ان سے مطابقت دینے کو بڑی خدمت سمجھا، یہی وجہ ہے کہ چوتھی صدی سے آج تک بے شمار تفسیریں اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں سے بھری پڑی ہیں، انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے، کہ وہ اپنے وقت کے رجحانات کے سامنے سپر ڈالدیتا ہے اور اپنے ماحول کا شکار ہو جاتا ہے،..... وقت کے غلط تخیلات سے اثر پذیر ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر تفسیریں مفسرین کے ذاتی رجحانات کا شکار ہوگئیں، متکلمین نے اپنی تفاسیر میں منطق، فلسفہ اور خطابت کا تمام زور صرف کر دیا، جو صرف و نحو اور بلاغت میں ید طولی رکھتے تھے، انھوں نے فنی زاویۂ نظر سے بحثوں کے دروازے کھول دیئے، جو علم تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے، انھوں نے قصص و امثال ہی کو اصل قرآن سمجھ کر پوری قوت ان کی تشریحات میں صرف کر دی، جو فروعات فقہ میں ماہر تھے، ان کی تفاسیر مسائل فقہ پر طین گی، پھر جب فقہ اور فلسفہ کی بنا پر مختلف مذہب قائم ہوگئے، تو ہر ایک مذہب نے اپنے اپنے عقائد

کے مطابق تفسیرین شروع کردین، معتزلہ اوراشعریہ نے ایک دوسرے کی ضد مین صفات وذات الٰہی
کی بحثون مین بے شمار کتب تفسیر مدون کین، تو صوفیہ نے عزلت نشینی تزکیۂ قلب اور جہاد بالنفس کا رنگ

بھردیا (ص ۱۴۹ و ۱۵۰)

لائق مصنف نے اس بیان مین مختلف النوع مسائل کو خلط ملط کردیا ہے، اور تفسیر کی بحث مین کلام کے مسائل چھیڑ دیئے، ان مسائل پر آیندہ مستقل گفتگو ہو گی، اس لئے اس موقع پر ہم اس کی تفصیل مین نہیں پڑتے، مصنف کے اس بیان مین بھی چند در چند غلطیان ہین، یہ تسلیم ہے کہ یونانی فلسفہ نے بعض اسلامی عقائد کو متاثر کیا، اور اس کی بنا پر مسلمانون مین مختلف فرقے پیدا ہوگئے لیکن ایران کا اثر محض تمدن ومعاشرت تک محدود رہا، اسلامی عقائد پر اس کا کوئی اثر نہین پڑا، کسی اسلامی عقیدہ مین زردشت، مزدک اور مانی کے خیالات کا اثر نہیں مل سکتا، فرق کی کتابون مین بعض ایسے عجمی فرقون کا حال ضرور ملتا ہے جنھون نے زردشتی، مزدکی، مانوی اور اسلامی عقائد کا ایک معجون مرکب تیار کیا لیکن ان کو کسی زمانہ مین بھی مسلمان نہین سمجھا گیا، اور نہ صرف محدثین بلکہ حکما تک نے انھیں مسلمان نہین مانا، اور تفسیرون مین تو زردشتی، مزدکی یا مانوی اثرات کا کوئی خفیف پرتو بھی نہین مل سکتا، یونانی فلسفہ کے اثرات بھی جن سے مسلمان زیادہ متاثر ہوئے محض ذات وصفات الٰہی کے چند مسائل تک محدود ہین، تفسیرون سے ان کا بھی کوئی تعلق نہین، بعض تفسیرون مین تردید اً ضرور یہ خیالات نقل کئے گئے ہین، جس کو قبول اثر سے تعبیر کرنا صحیح نہین ہے، یہ مصنف کا محض زور بیان ہے، کہ "مفسرین نے یونانی حکما کے غیر الہامی خیالات کو مسلمات سمجھ کر اختیار کرلیا، اور تمام تفسیرون مین دوراز کار بحثین شامل کردین، اور چوتھی صدی سے آج تک بے شمار تفسیرین اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیون سے بھری پڑی ہین" جو سراسر غلط ہے، نہ مفسرین نے ان خیالات کو کبھی قبول کیا، اور نہ تفسیرون مین ان کو جگہ دی، بعض متکلمانہ تفسیرون مین تردید کے لئے البتہ یہ خیالات نقل کئے گئے ہین، جن کو ان کے قبول سے تعبیر کرنا غلط ہے، کاش مصنف نے ان بے شمار تفسیرون مین چند ہی کا نام لے لیا ہوتا،

فلسفۂ یونان سے مسلمانون اور اسلامی عقائد کے اثر پذیر ہونے کا جملہ جسے راقم الحروف نے بھی

جا بجا استعمال کیا ہے، تشریح طلب ہے، اس کا یہ مطلب نہین ہے کہ مسلمانون کی ساری قوم اور ان کے تمام عقائد اس سے متاثر ہو گئے، بلکہ اہلِ علم کی ایک جماعت اور بعض عقائد پر اس کا اثر پڑا تھا، جو لوگ فلسفۂ یونان سے زیادہ متاثر ہوئے وہ حکما، کہلائے، مگر ان کو کسی زمانہ مین بھی مذہب کا ترجمان، اسلام کا نمایندہ اور مسلمانون کا رہنما نہین سمجھا گیا، بلکہ وہ ہمیشہ اس مقدس دائرہ سے الگ رکھے گئے، اسلام کے اصلی ترجمان اور اس کے محافظ اور مسلمانون کے ہادی و رہنما محدثینِ کرام تھے، جو ہمیشہ مسلمان حکما کے خیالات کی تردید اور اس سے تبری کرتے رہے، اور اسلام کے صاف و شفاف چشمے کو اس کی کدورتون سے پاک رکھنے کی پوری کوشش کی، اکابر حکما مین کندی، فارابی، ابن سینا، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن ہیثم، ابن مسکویہ کسی کو یہ منصب حاصل نہ ہوا، اور نہ ان مین سے کسی نے تفسیر لکھی، بلکہ قاضی ابن رشد تک کو جو جلیل القدر عالم دین بھی تھے محض فلسفہ کے داغ کی وجہ سے کبھی دین کی ترجمانی کا منصب نہ ملا،

لیکن اس سے انکار نہین کیا جا سکتا، کہ اہلِ علم کی ایک جماعت فلسفۂ یونان سے متاثر تھی، اور اوس کے اثر سے مسلمانون کے ایک طبقہ مین یہ خیالات پھیل رہے تھے، ٹھیک اسی طرح جس طرح آج مغربی علوم و فنون کے اثرات پھیل رہے ہین، ایسی صورت مین علما یا خاموش بیٹھے رہتے اور مسلمانون کو ان ملحدانہ خیالات کا شکار ہونے دیتے، یا ان کی تشفی بخش تردید کرتے، عقلی علوم کی تردید کے لئے تنہا نقل کافی نہ تھی، اس لئے علما، کی ایک جماعت کو محض اسلامی عقائد کو یونانی علوم کے حملہ سے بچانے کے لئے اس مین حصہ لینا پڑا، اور چونکہ محض نقلی علوم سے ان کی تردید ممکن نہ تھی، اس لئے ان کو بھی فلسفہ اور عقلیات کے اسلحہ سنبھالنے پڑے جس سے علم کلام کی بنیاد پڑی، ان علما مین بہت سے صاحبِ بصیرت اور اربابِ عزیمت متکلم اور فلسفی علما نے فلسفۂ یونان پر تنقید کرکے اس کے نقائص دکھائے، اور ان کا ردّ کیا، مثلاً امام غزالی، امام رازی، ابوالبرکات بغدادی، شیخ شہاب الدین مقتول اور ابن تیمیہ اور امام شہرستانی وغیرہ، جن علما مین اتنی ہمت و بصیرت نہ تھی، انھون نے اسلامی عقائد اور فلسفۂ یونان مین مطابقت دینے کی کوشش کی گو ان کا یہ طریقہ صحیح نہ تھا، لیکن ان کی نیت نیک تھی، اس کے باوجود چونکہ یہ طرز کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف تھا، اور اس مطابقت مین کہین کہین اسلامی تعلیمات میں تاویل سے کام لینا پڑتا تھا، اور آیاتِ قرآنی کے ظاہری معنی سے

ہٹنا پڑتا تھا، اس لئے محدثین اور دیندار علماء نے اس کو بھی خلاف مذہب قرار دیا، اور ان کی تردید کی لیکن اس سے ضرور بعض فلسفیانہ خیالات اسلامی عقائد مین آگئے، جن کو مصنف نے فلسفۂ یونان کے قبول سے تعبیر کیا ہے، ان خیالات کے قبول کرنے کا تو سوال الگ رہا، محدثین نے تو ان کے حملہ سے اسلامی عقائد کو بچانے کے لئے ایسے طریقۂ دفاع تک کو گوارا نہ کیا جس سے صاف وسادہ اسلامی عقائد میں کوئی ایسی خفیف تاویل بھی کرنی پڑے جس کی سند کتاب اللہ وسنت رسول مین موجود نہیں ہے، رہا یہ امر کہ یہ طریقۂ دفاع مفید ثابت ہوا یا مضر تو اس کے فائدہ مین کوئی شبہ نہین، اس سے بعض اسلامی تعلیمات اور اسلامی عقائد کے بارہ میں اس زمانہ کے عقل پرستون کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگیا، لیکن اسی کے ساتھ مذہب مین بعض غیر ضروری مسائل پیدا ہوگئے، جن کو اسلام کے سادہ اور صاف عقائد سے کوئی علاقہ نہ تھا لیکن متکلمین کے حسن نیت مین کوئی شبہ نہیں، اللہ تعالیٰ ان کی نیتون کا اونھین اجر دے گا، دین کے اصلی محافظون کو تو بیشک ان پر اعتراض کا حق ہے، لیکن دورِ جدید کے مصلحین کو ہرگز اس کا حق نہین پہنچتا، جو لوگ سر سید احمد خان، مولوی چراغ علی اور ان کے ہم مشربون کی قرآنی تاویلات اور اسلامی تعلیمات کی غلط تعبیرون کو جو متکلمین اسلام کی غلطیون سے کہین زیادہ گمراہ کن ہین، صحیح اور اس کو خدمت دین سمجھتے ہون، انھین متکلمین اسلام پر اعتراض کا کیا حق ہے،

مصنف کا یہ اعتراض کہ "ہر فن کے علماء نے اپنے فن کی روشنی مین کتاب اللہ کی تفسیر کی، اور اکثر تفسیرین مفسرین کے ذاتی رجحانات کا شکار ہوگئیں،" قرآن مجید سے ان کی ناواقفیت کا ثبوت ہے، یہ ان مفسرون اور ان کی تفسیرون کا عیب نہین، بلکہ ان کا کمال و ہنر اور ان کی بہت بڑی دینی خدمت ہے، یہانتک تو تسلیم ہے، کہ کلام مجید کو یونانی فلسفہ سے کوئی علاقہ نہین، اور جن لوگون نے اس کی روشنی مین اس کی تفسیر کی ہے، انھون نے دین کی خدمت انجام نہین دی لیکن مصنف نے اور جن علوم کا نام لیا ہے مثلاً صرف و نحو، معانی و بیان تاریخ، فقہ اور تصوف تو قرآن تو ان سب کا جامع ہے، اور اس کو ان سے نہایت گہرا تعلق ہے، قرآن عربی زبان مین ہے، اور غیر عرب کے عربی زبان کے صحیح پڑھنے اور اس کے معنی سمجھنے کا دارومدار تمام تر صرف و نحو کے علم پر ہے، اس سے ناواقف

فض نہ صرف یہ کہ عربی کے صحیح معنی نہیں سمجھ سکتا، بلکہ عبارت تک صحیح نہیں پڑھ سکتا، پھر اس میں جابجا صرفی و نحوی اشکالات ہیں جن کے حل کے لئے صرف و نحو میں بصیرت کی ضرورت ہے، اس لئے کلام مجید کی صرفی اور نحوی تشریح اس کی خدمت ہوئی یا مخالفت، خود فاضل مصنف نے عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر کلام مجید کے سمجھنے میں جو جو غلطیاں کی ہیں، اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی، کلام مجید میں گذشتہ انبیا و رسل اور ان کی امتون اور قدیم اقوام کے سبق آموز تاریخی واقعات ہیں، اس لئے اگر کسی مورخ نے تاریخی پہلو سے اس پر نگاہ ڈالی تو کیا گناہ کیا، اسی طرح کلام مجید فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، بلکہ اوس نے فصحاے عرب کو اپنا جواب بنانے کی تحدی کی جس سے وہ عاجز رہے، اگر کسی نے کلام مجید کے اس دعوی کے ثبوت مین فصاحت و بلاغت کے پہلو سے آیاتِ قرآنی کی تشریح کی، تو اوس نے اوس کی خدمت کی یا اوس کو بگاڑا، کلام مجید میں، طہارت، عبادت، معاملات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح و طلاق، وراثت، تجارت، لین دین وغیرہ کے صدہا مسائل اور قوانین ہین بعض کلی مسائل سے جزئیات کا استنباط ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی نے اس کے فقہی پہلو پر نگاہ ڈالی، اور اس سے مسائل استنباط کئے، تو اس نے دین کی خدمت کی یا اس کی مخالفت کی، اسی طریقہ سے کلام مجید کا اصل مقصد تزکیۂ روح و قلب اور تعلق مع اللہ ہے، اور جہاد نفس اس کا وسیلہ ہے، اس کے بغیر روح کا تزکیہ ممکن ہی نہین ہے، اس لئے اگر کسی صاحبِ نظر اہل دل مفسر نے اس روح کو نمایان کیا، تو اوس نے کلام مجید کے اصل منشا کو پورا کیا یا اوسے اپنے ذاتی رجحانات کا شکار بنایا، درحقیقت کلام مجید، فصاحت و بلاغت کا نمونہ بھی ہے، دنیاوی قانون کا ضابطہ بھی ہے، زندگی کا دستور العمل بھی ہے، تزکیۂ قلب و روح کا نسخہ بھی ہے، نجاتِ اُخروی کا صحیفہ بھی ہے، غرض وہ ایک مسلمان کے لئے دین بھی ہے، دنیا بھی، وہ تو ایسی جامع الحیثیات کتاب ہے کہ اس کے محاسن کا احاطہ مشکل ہے،

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ جمالِ تو ز دامان گلہ دارد

اسلئے جن علما نے ان مین سے کسی جہت کی تشریح و تفسیر کی، اونھون نے اس کے جمال رُخ کو نمایان کیا یا اوس کو بگاڑا، یہ تو مسلمانون کا نہایت پرفخر کارنامہ ہے، کہ اونھون نے اپنی مذہبی کتاب کے سیکڑون پہلوؤن پر کتابین لکھین، اور حتی الامکان اوس کا کوئی گوشہ تشنہ نہین چھوڑا، اور علوم قرآنی پر ایسا عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہوگیا جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم نہین پیش کرسکتی، لائق مؤلف نے مسلمانون کے اس سارے کارنامے پر بہ یک جنبش قلم خط نسخ پھیر دیا،

(باقی)

کلیاتِ فارسی

مولانا شبلی مرحوم کے تمام فارسی قصائد، غزلیات، مثنویات اور قطعات کا مجموعہ جواب تک متفرق طور سے دیوانِ شبلی، دستۂ گل، بوے گل، برگِ گل کے نامون سے چھپے تھے، اس میں سب یکجا کر دیئے گئے ہین،

ضخامت ۲۴۴ صفحے قیمت :- عہ

خط و کتابت کیلئے

ضروری اطلاع

معارف کے مضامین اور علمی استفسارات اور ان کے متعلق جملہ خط و کتابت شخصی نام کے بجائے صرف اڈیٹر معارف کے پتہ سے، اور معارف اور دار المصنفین کے انتظامات اور فرمایشات کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے کیجائے، ان تمام امور کے متعلق میرے نام خط لکھنے سے تعمیل مین دقت ہوتی ہے، امید ہے کہ احباب مجھے زحمت سے بچانے کے لئے اس کا خاص طور سے خیال فرمائین گے،

سید سلیمان ندوی

ابن منظور افریقی

کی

لسان العرب پر ایک نظر

از جناب پروفیسر عبد القیوم صاحب ایم اے، لکچرار زمیندار کالج گجرات

جن جن ملکون مین اسلام کا پرچم لہرایا، اور جہان جہان عربون نے دینِ حنیف کا پھریرا اڑایا، وہان علم وعرفان کے چشمے ابل پڑے، جو ملک بھی اسلام کے زیر اثر آیا، عربی علم وادب کا مرکز بن گیا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عربی علوم وآداب کی تاریخ کے ایک طالب علم کی نگاہ سے پوشیدہ نہین رہ سکتی،

افریقہ بھی مسلمانون کے انہی مفتوحہ ممالک مین سے ہے، جہان عربون نے اپنی تہذیب وثقافت کے اتنے گہرے نقوش چھوڑے ہین، کہ زمانہ کی دستبرد اب تک انھیں مٹا نہین سکی، اور باوجودیکہ افریقہ وحشت اور بربریت مین شہرۂ آفاق ہے، لیکن عربی زبان کی گرفت مین کچھ اس طرح آیا، کہ صدیان گذر جانے کے بعد بھی وہان اسلامی اثرات بڑے نمایان اور اُبھرے ہوئے نظر آتے ہین، چند برس ہوے ایک امریکن مسیحی مبلغ نے لکھا تھا:

اسلام نے افریقہ کے لئے ایک مخصوص تعلیمی اسکیم تیار کر رکھی ہے، سینی گال مین جو فرانس کے ماتحت ہے، عربی زبان اسکولون مین پڑھائی جاتی ہے، اور اس قسم کے اٹھارہ سو ابتدائی مدارس موجود ہین، ان سب مدارس مین بارہ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہین، فرانسیسی سوڈان میں بھی عربی کی تعلیم کا انتظام ہے، وہان دو ہزار ایک سو تیرہ مدارس ہین، جن مین پچیس ہزار طلبہ پڑھتے ہین، فرانسیسی گنی مین بھی عربی تعلیم ترقی پر ہے، آیوری کوسٹ مین اگرچہ مسلمانون کی آبادی صرف گیارہ فیصدی ہے، لیکن

وہاں تین سو مسجدین اور چار سو پچیس مدارس قرآن ہین، برٹش نائیجریا کے تمام مدرسون مین بھی عربی پڑھائی جاتی ہے"۔

یہ حالت اس زمانہ مین نظر آتی ہے جب افریقہ کی حکومت کی باگ دوسری اقوام کے ہاتھون مین ہے، اگر اپنی حکومت کے دور مین ہم وہاں جلیل القدر علماء، ائمہ اور ادباء، اور مختلف علوم و فنون کے ارباب کمال دیکھتے ہین تو چندان تعجب کی بات نہین،

مؤلف لسان العرب کے مختصر حالات

اس مضمون کے موضوع بحث لسان العرب کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ صاحب کتاب کے حالات چند سطور مین پیش کر دیئے جائین، یہ بڑے افسوس کی بات ہے، کہ تاریخ اسلام کے اس جلیل القدر لغوی اور ادیب کے حالات کی جانب تاریخ اور تذکرہ نگارون نے بہت کم توجہ کی ہے اور کتابون مین اس کے نہایت مختصر اور مجمل حالات ملتے ہین، اگر اتنا بڑا عالم یورپ مین پیدا ہوا ہوتا، تو اس کی سیرت پر مستقل کتابین لکھی جاتین، اور اس کی زندگی کا کوئی گوشہ ہماری نظرون سے اوجھل نہ رہنے پاتا، اس ضمن مین یہ عرض کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہوگا، کہ صاحب لسان العرب کے حالات زیادہ تر اس کے دو معاصرین کی روایت پر منحصر ہین، ایک صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی (۶۹۶ھ-۷۶۴ھ) اس نے اپنی کتاب نکت الھمیان مطبوعہ ۱۹۱۱ء (ص ۵، ۲ و ما بعد) اور الوافی بالوفیات مطبوعہ ۱۹۳۱ء (ج اول ص ۵۰) مین اس کے حالات لکھے ہین، دوسرے محمد بن شاکر الکتبی (۶۸۶ھ-۷۶۴ھ) نے اپنی کتاب فوات الوفیات مطبوعہ ۱۲۹۹ھ (جلد ۲ ص ۲۶۵) مین حالات قلمبند کئے ہین، بعد کے تمام سیرت نگارون نے انھی دونون سے استفادہ کیا ہے، اور بیشتر انھی دونون کے بیانات نقل کر دیئے ہین، اس مین حافظ ابن حجر کی الدرر الکامنہ (جلد ۴ ص ۲۶۲) سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ مطبوعہ ۱۳۲۶ھ (ص ۱۰۶) ابن العماد حنبلی کی شذرات الذہب (جلد ۶ ص ۲۶) سرکیس کی معجم المطبوعات، زرکلی کی الاعلام (ج ۳ ص ۹۹۰ - ۹۹۱) کسی کا استثناء نہین، المنہل العذب فی تاریخ طرابلس الغرب (ص ۱۵۰) اور مفتاح السعادۃ (ج اول ص ۱۰۱) مین بھی کچھ حالات مندرج ہین،

ولادت اور تعلیم محمد نام، جمال الدین لقب، ابو الفضل کنیت اور الافریقی اور المصری نسبت ہے، پورا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن مکرم بن علی بن احمد بن ابی القاسم بن حبقہ بن منظور[۱]، سیوطی نے سلسلۂ نسب میں علی (دادا کے نام) کے ساتھ کسی دوسری روایت کے مطابق رضوان بھی لکھا ہے، اور صفدی[۲] نے الرُّویفعی الانصاری نسبت درج کی ہے، اس نسبت کے لحاظ سے مؤلف حضرت رُوَیفع بن ثابت صحابیؓ کے خاندان کی یادگار تھے، ابن منظور اور ابن مکرم کے نام سے عام طور پر مشہور ہیں،

۲۲ محرم الحرام ۶۳۰ھ کو دوشنبہ کے دن مصر کے ایک بڑے علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے[۳]، بچپن ہی سے علم و ادب کی طرف میلان تھا، مختلف اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان میں ابن المقیر، مرتضی بن حاتم، عبد الرحیم بن الطفیل اور یوسف المخیلی زیادہ مشہور ہیں[۴]، نحو، لغت، تاریخ اور کتابت میں کمال حاصل کیا[۵]، مؤلف کا اندازِ تحریر نہایت سلیس، شگفتہ، متین اور سنجیدہ ہے، ادبیات میں نہایت بلند درجہ ہے، نظم و نثر دونوں میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، شعر کے نمونے صفدی اور ابن شاکر نے نکت الہمیان اور فوات الوفیات میں درج کئے ہیں،

مشاغل بعض تاریخی حقائق بڑے ہی تعجب انگیز ہوتے ہیں، ہماری حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ ہمارے اسلاف زندگی کی دوسری مشغولیتوں کے باوجود علمی مشاغل میں کتنا انہماک رکھتے تھے یاقوت حموی امام ابن جریر کے متعلق لکھتا ہے، کہ اگر ان کی تصنیفات اور تالیفات کے اوراق کو ان کی زندگی کے دنوں پر تقسیم کیا جائے، تو چالیس ورق یعنی اسّی صفحات روزانہ کا اوسط پڑتا ہے، حافظ ابن حجر کی تصانیف کتنے مختلف علوم پر ہیں، فتح الباری، اصابہ، درر کامنہ اور تہذیب جیسی ضخیم کتابیں ابن حجر کے علم و فضل کی شاہد ہیں، سیوطی کی روایات کے استناد و عدم استناد کے متعلق جو بھی کہا جائے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے

---

[۱] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۰۶، [۲] نکت الہمیان ص ۲۷۶، [۳] ایضاً [۴] الدرر الکامنہ ج ۴ ص ۲۶۲، ۲۶۳،

نکت الہمیان میں عبد الرحیم کی بجائے عبد الرحمن بن الطفیل مرقوم ہے جو زیادہ قرین صحت ہے،

[۵] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۰۶،

کہ چار پانچسو کے درمیان کتابین ان کے قلم سے نکلین، یاقوت حموی ابن کثیر، ابن تیمیہ اور دوسرے بے شمار علمار ہین جن کے قلم کی روانی اور برق رفتاری دیکھ کر ایک انسان انگشت بدندان رہ جاتا ہے، اور اندازہ نہین کر پاتا کہ یہ بزرگ لکھنے پڑھنے کے لئے اتنا وقت کیسے نکال لیا کرتے تھے،

ہمارے مؤلف کو کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا، باوجودیکہ قاہرہ مین مدت العمر دیوان الانشار سے وابستہ رہے[۱] پھر طرابلس مین نظارت اور قضار کے فرائض انجام دیتے رہے، لیکن لکھنے پڑھنے کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا، کہ ان مشغولیتون کے باوجود تاریخ ادب کی بہت کم کتابین ایسی ہونگی جو ابن منظور کی نگاہ سے بچ سکی ہون گی محض مطالعہ ہی کا شوق نہ تھا، بلکہ اس کے ساتھ تالیف و تصنیف کا بھی ذوق تھا، ابن شاکر نے فوات الوفیات میں ان کو کثیر الخط لکھا ہے، صلاح الدین صفدی نے خود ابن منظور کے صاحبزادے قاضی قطب الدین کا یہ بیان نقل کیا ہے، کہ اُن کے والد ابن منظور نے پانسو کتابیں اپنے ہاتھ کر لکھی ہوئی چھوڑین[۲] صفدی کا بیان ہے کہ وما اعرف فی کتب الادب شیئاً الّا وقد اختصرہ، سیوطی لکھتے ہین کہ روایات و نقل کے اعتبار سے ابن منظور کی مختصرات کی تعداد پانچ سو مجلدات تک پہنچتی ہے[۳] ابن منظور نے جو مختصرات و مختارات لکھے ہین، ان مین سے چند حسب ذیل ہین:

(۱) مختار الاغانی بہ ترتیب حروف تہجی (۲) مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر قریبًا چوتھائی حصہ مین اختصاراً لکھا ہے (۳) مختصر تاریخ بغداد للسمعانی (۴) مختصر مفردات ابن البیطار (۵) مذہب سر در النفس بمدارک

---

[۱] فوات الوفیات، دیوان الانشار مین خدمت کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، اس کے لئے بڑے علم و فضل کی ضرورت تھی، قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ کتنے علوم و فنون مین کمال حاصل کئے بغیر دیوان الانشار مین کام کرنا قطعًا ناممکن تھا[۲] نکت الهمیان ص ۲۷۶،

[۳] بغیۃ الوعاۃ ص ۲۰۶، اس زمانہ مین قدیم علمار کی مطول کتابون کو محفوظ کرنے کے لئے اون کی تلخیص کا

الحواس الخمس للتیفاشی (۶) مختصر العقد لابن عبد ربہ (۷) مختصر ذخیرہ لابن بسام (۸) مختصر زہر الآداب للحصری (۹) مختصر یتیمۃ الدہر للثعالبی (۱۰) مختصر نشوان المحاضرۃ (۱۱) مختصر صفوۃ الصفوۃ (۱۲) مختصر تاریخ الخطیب (۱۳) مختصر الحیوان للجاحظ (۱۴) اختیار الازہار فی اللیل والنہار،

انہی چند کتابون سے اندازہ ہوسکتا ہے، کہ ابن منظور کتب بینی اور تصنیف و تالیف مین کس درجہ استغراق اور انہماک رکھتے تھے کتنی ضخیم ضخیم کتابون کو اوّل سے آخر تک بنظر غائر پڑھا، یاد رکھا، اور پھر ان کے مختارات اور مختصرات لکھے، ایک الاغانی ہی کو لے لیجئے، کہ بقول صاحب الوافی الوفیات[51] ابو الفرج اصفہانی نے اس کتاب کو پچاس برس کی طویل مدت مین تالیف کیا، پھر غور فرمائیے، کہ اس کتاب کے مطالعہ اور بلحاظ حروف تہجی اس کے اختیار اور ترتیب کے لئے کتنی مہلت اور محنت کی ضرورت تھی، یہ بھی پیش نظر رہے کہ مؤلف کے لئے تنہا یہی ایک کام نہ تھا، بلکہ دفتری مشاغل بھی تھے، اور پھر تنہا یہی ایک کتاب مؤلف کے قلم کا ثمرہ نہین ہے، بلکہ ایسی بہت سی کتابین ہین جن مین سے ایک ایک کے مطالعہ کے لئے عمر درکار ہے،

ابن العماد حنبلی کے قول کے مطابق ابن منظور مصر اور دمشق مین حدیث کا درس بھی دیتے رہے ہین،[52] اور سیوطی رقمطراز ہین کہ امام سبکی اور حافظ ذہبی نے ابن منظور سے روایت بیان کی ہے[53] لیکن ان کا شمار محدثین کے اس زمرہ میں کیا ہے جو "لم یبلغوا درجۃ الحفظ والمنفردین بعلو الاسناد"[54] مگر جہان تک نحو و لغت کا تعلق ہے، ابن منظور کا شمار ان علوم کے ائمہ مین ہے[55] حافظ ابن حجر نے ابن فضل اللہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ ابن منظور آخری عمر میں بینائی سے محروم ہوگئے تھے[56] ظاہر ہے کہ یہ محرومی بصارت کتب بینی اور کتب نویسی مین حد درجہ انہماک کا نتیجہ تھی، آخر مین مصر مین قیام اختیار کیا، اور وہین بیاسی برس کی عمر میں شعبان ۷۱۱ھ مین وفات پائی،[57]

---

[51] جلد اوّل ص ۵۰ [52] شذرات الذہب ج ۶، ص ۲۶ [53] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۰۶، [54] جلد اول ص ۱۶۳ [55] ” ص ۲۳۹ [56] الدرر الکامنہ جلد ۴ ص ۲۶۳ [57] حسن المحاضرہ، ج ۱، ص ۱۶۳

ابن شاکر[۵۱] نے ابن منظور کے تشیع بلا رفض کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن معاصرانہ چشمک سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں، دوسرے سیرت نگاروں نے بھی اس کی تقلید میں اس کو نقل کر دیا، اور یہ نہ سوچا کہ یہ الزام کہاں تک حقیقت و اصلیت پر مبنی ہے،

لسان العرب ابن منظور کی سب سے قیمتی اور اہم تالیف لسان العرب ہے، اس کا پہلا ایڈیشن مصر سے بیس ضخیم جلدوں میں شائع ہوا، یہ عربی زبان کا بڑا مستند اور مفصل لغت ہے، کتاب کے نام کے ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا، کہ ابن منظور ہی پہلا مؤلف نہیں جس نے لسان العرب کے نام سے عربی کا اتنا ضخیم لغت ترتیب دیا ہو، اس سے کئی صدی پہلے شیخ ابو علی سینا (۳۷۰ھ؁ - ۴۲۸ھ؁) نے اسی نام سے ایک ضخیم لغت مرتب کیا تھا، ڈاکٹر جمیل صلیبا نے اپنی کتاب ابن سینا کے صفحہ ۳۵ پر عربی لغت کی ایک کتاب موسوم بہ لسان العرب دس جلدوں میں ابن سینا کی جانب منسوب کی ہے، شہرزوری کی کتاب نزہۃ الارواح میں ابو علی سینا کے ترجمہ کے تحت زیادات میں مرقوم ہے :

"ثم صنف الشیخ کتاباً فی اللغۃ وسماہ لسان العرب، لم یصنف مثلہ فی اللغۃ ولم ینقل الی البیاض فبقی علی مسودتہ لم یھتد احد الی ترتیبہ"

شیخ کی لسان العرب کی عدم موجودگی میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابن منظور نے اپنی اس کتاب کا نام محض اتفاقی طور پر رکھا یا مستعار لیا، ورنہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لسان العرب پہلی لسان العرب کا کہاں تک چربہ ہے

وجہ تالیف ابن منظور کے لغت سے پہلے بھی عربی کے مستند لغات موجود تھے، خلیل بن احمد (المتوفی ۱۷۵ھ؁) کی کتاب العین اگرچہ اب ناپید ہے[۵۲] لیکن بعد کے مولفوں نے اس سے استفادہ کیا ہے، اور اندلس کے مشہور مصنف ابوبکر زبیدی (المتوفی ۳۷۹ھ؁) نے اس کا اختصار بھی کیا، اس کے بعد ابن درید (المتوفی ۳۲۱ھ؁) نے کتاب العین

---

[۵۱] فوات الوفیات ج ۲، صفحہ ۲۶۵،

[۵۲] لسان العرب ج ۱، صفحہ ۲،

کے انداز پر کتاب الجمہرۃ فی اللغۃ لکھی، بعد کی مشہور کتب لغت مین سے ابو علی القالی (المتوفی ۳۵۶ھ) کی البارع، ابو منصور الازہری (المتوفی ۳۷۰ھ) کی التہذیب، صاحب ابن عباد (المتوفی ۳۸۵ھ) کی المحیط، ابو الحسین ابن فارس (المتوفی ۳۹۵ھ) کی المجمل، الجوہری (المتوفی ۳۹۸ھ) کی الصحاح، ابو غالب قرطبی (المتوفی ۴۳۶ھ) کی الموعب، ابن سیدہ (المتوفی ۴۵۸ھ) کی المحکم، زمخشری (المتوفی ۵۳۸ھ) کی اساس البلاغہ اور صاغانی (المتوفی ۶۶۰ھ) کی العباب قابلِ ذکر ہین، لیکن ان کتب کی موجودگی بھی ابن منظور کے لئے وجہ تسلی نہ ہوئی، اور ان کو ان مین سے ہر ایک کتاب مین کچھ نہ کچھ ایسی کمی اور کوئی نہ کوئی خامی نظر آئی کہ ایک لغت کی تالیف کی ضرورت محسوس کی انھیں اگر کسی کتاب مین علم و ادب کا کوئی بڑا ذخیرہ نظر بھی آیا تو اسکی ترتیب انکی نگاہ مین ناپسندیدہ ٹھہری اور اگر کسی کی ترتیب تسلی بخش نظر آئی تو اسکو علمی و ادبی خامیون سے مبرا نہ پایا، اسلئے ایک ایسے جامع لغت کی ترتیب کی ضرورت محسوس کی جو انکے نقطۂ نظر سے ترتیب اور علم و ادب کے ذخیرہ دونون لحاظ سے تسلی بخش اور قابلِ اعتبار ہو، اس مقصد کے پیش نظر ابن منظور نے لسان العرب کی تیاری شروع کی لیکن انھین اپنے پیش رو مؤلفین لغت کی طرح الفاظ کی تشریح و تحقیق کے لئے بڑے طویل طویل سفر اختیار نہین کرنے پڑے، اور نہ بے آب و گیاہ صحراؤن کی خاک چھاننی پڑی، مؤلف نے کتاب کے دیباچے میں یہ اعتراف کیا ہے، کہ انھون نے پہلی کتب لغت پر انحصار کرتے ہوئے انھی کی مختون سے استفادہ کیا ہے[۱] سیوطی بغیۃ الوعاۃ مین لکھتے ہین:

"جمع فی لسان العرب بین التہذیب والمحکم والصحاح وحواشیہ والجمہرۃ والنہایۃ"

لیکن احمد پاشا تیمور، سیوطی کی تغلیط کرتے ہوئے اپنی کتاب تصحیح لسان العرب مین یون رقمطراز ہین:

وَالصَّوابُ انّ الجمہرۃ لیست مما جمعہ ابن منظور، بل مبنی کتابہ علی خمسۃ

فقط وھی التی صرح باسمائھا فی خطبتہ؛

لسان کی ترتیب | مولفین لغت نے اپنی کتبِ لغت کو تین طریقون سے ترتیب دیا ہے،

---

[۱] لسان العرب ج ۱ ص ۳،

(۱) خلیل نے کتاب العین کو مخارج الفاظ کے لحاظ سے مرتب کیا ہے، المحکم اور التہذیب مین بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے،

(۲) ابن درید نے الجمہرۃ مین حروف تہجی کی اصل ترتیب کے لحاظ سے الفاظ کو ترتیب دیا ہے، المجمل، المحیط، اساس البلاغۃ وغیرہ بھی اسی طریقہ سے مرتب کی گئی ہین،

(۳) تیسرے گروہ کا امام جوہری ہے، اس نے الصحاح مین نیا انداز ترتیب اختیار کیا، اور الفاظ کے حرف آخر کے اعتبار سے کتاب مرتب کی، لسان العرب قاموس اور تاج العروس مین بھی یہی ترتیب اختیار کی گئی ہے،

کتاب کی اہمیت | لسان العرب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے، کہ مؤلف نے ساٹھ ہزار الفاظ کے مصادر اور مادون پر بحث کی ہے، اور ان کی تشریح و توضیح مین کلام عرب، ان کے ضرب الامثال، محاورات، خطبات، آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے استشہاد کیا ہے، اس ضمن مین کم و بیش سترہ سو شعرا کے نام اور بے شمار اشعار لسان العرب میں محفوظ ہوگئے ہین،

غور فرمائیے کہ اتنے ضخیم اور مفصل لغت کی تدوین کے لئے کتنے صبر و استقلال، عزم و ہمت، علم و فضل محنت و مشقت اور ذہانت و ہوشمندی کی ضرورت تھی، آج اس ترقی کے زمانے مین اگر ایک اتنا بڑا لغت لکھنا ہو تو ایک چھوٹی کئی علمی مجالس قائم کرنی پڑین، بلکہ کیجاتی ہین، مولفین کے بورڈ بنائے جاتے ہین، مختلف شعبون کے ماہرین کی امداد حاصل کیجاتی ہے، تب کہیں جاکر یہ بیل منڈھے چڑھتی ہے، لیکن اوس زمانے مین جب کہ یہ علمی سہولتین مفقود تھین، نہ پریس اور مطابع تھے، نہ نقل و حمل کے وسائل و ذرائع آج کے جیسے تھے، اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھانا کتنا مشکل کام تھا، اور اس کو تکمیل تک پہونچانا تو اور بھی دشوار تھا، مگر آفرین ہے ان اولوالعزم بزرگون کی جوانمردی اور ہمت پر جنھون نے اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے کہ انھین دیکھکر آج دنیا فرط حیرت و استعجاب سے انگشت بدندان رہ جاتی ہے،

سالہا سال کی مسلسل و پیہم محنت کے بعد ابن منظور نے لسان العرب کو ۶۸۹ھ مین پایۂ تکمیل تک پہنچایا، اور لغت کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا اتنا شاندار اور قابلِ فخر ذخیرہ جمع کر دیا، کہ یہ کتاب محض ایک لغت ہی نہین بلکہ عربی علوم کی انسائیکلوپیڈیا بن گئی، اگر ابن منظور اور کوئی کتاب نہ لکھتا اور صرف لسان العرب ہی چھوڑ جاتا تو تنہا یہی اتنی بڑی یادگار تھی، کہ رہتی دنیا تک اس کا نام فراموش نہ کیا جا سکتا،

یورپ کے بڑے بڑے مستشرقین نے دوسری زبانون کے مقابلہ مین عربی زبان و لغت کی وسعت کا اعتراف کیا اور ایڈورڈ ولیم لین (۱۸۰۱ء - ۱۸۷۶ء) جس نے عربی لغت کے مطالعہ اور تدوین مین ساری عمر صرف کر دی، اس اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا، کہ عربی زبان لغات علمی تحقیق، وسعتِ نظر اور محنت و تفصیل کے اعتبار سے تمام لغات سے سبقت و فوقیت لے گئی ہے[۱]، لیکن المانی مستشرق نلدکے اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود، دیلی زبان سے اس مین وسعتِ نظر کی کمی کا بھی اظہار کیا، افسوس کہ اس نے لسان العرب نہین دیکھی، ورنہ اس کو ابن منظور کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا، وہ عجمی الفاظ کی اصلیت و ماخذ کا پتہ بھی دیتا ہے، چند مثالین ملاحظہ ہون،

"الفلسفة الحکمة اعجمی (۱۱: ۱۸، سطر ۳) والتریاق بکسر التاء معروف فارسی معرب

نیز (حبتق) الجوسق..... معرب واصله کوشک بالفارسیة (۱۱: ۳۱۵) القندع

والقندع والقندوع کلمة الدیوث سریانیة لیست بعربیة محضة (۱۰: ۱۷۷

نستق کانه ملسان الروم تکلمت به العرب (۱۲: ۲۳۰)

اسی طرح جہان کہین اس قسم کے الفاظ آگئے ہین، ابن منظور نے ان کے ماخذ اور ان کی اصل بتانے کا پورا اہتمام کیا ہے، ان چار مثالون سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے، کہ عربی لغت نویس، فارسی، سریانی، ترکی، رومی وغیرہ ماخذون کا بھی پتہ دیتے ہین،

تسامحات کسی کتاب کے متعلق نقص سے یکسر برأت کا دعوی نہیں کیا جا سکتا، اس لئے لسان العرب جیسی

۱؎ دیباچہ مدالقاموس ۲؎ لسان العرب ج ۴ صفحہ ۹۴،

بڑی کتاب مین مسامحات کا رہجانا کوئی تعجب کی بات نہین کیونکہ ایک انسان کا حافظہ اور علم کہان تک کام دے سکتا ہے،
لیکن افسوس ان لوگون پر ہے جنھون نے لسان العرب کی نقل مین اس کے تسامحات پر نظر نہ ڈالی، اور انھین
جو کچھ ملا بے کم وکاست نقل کر دیا، مثلاً لسان مین معقل بن خویلد کا یہ شعر مرقوم ہے[1]

وسودٍ جعادِ الرِ قا   بِ مِثلھُمُ یرھبُ الراھِبُ

مصحح نے اس کی تصحیح کی زحمت اٹھائے بغیر حاشیہ پر لکھدیا: "کذا فی الاصل بحذف بعض الشطر الاول"
تاج العروس کے مولف شہیر سید مرتضیٰ زبیدی (المتوفی ۱۲۰۵ھ) نے بھی لسان العرب کے تتبع مین یہی ناقص شعر نقل
کر دیا[2]، وہان بھی حاشیہ نگار صاحب نے لکھدیا کہ لسان مین اسی طرح مرقوم ہے، حالانکہ اشعار الہذلیین مین یہ
شعر یون ملتا ہے،:

وسودٍ جعادٍ غلاظِ الرّقا   بِ مثلھُمُ یرھب الراھب

لسان العرب (۱۵: ۱۲۳) مین عبید بن الابرص کا ایک شعر یون مندرج ہے:

اعاقرٌ کذاتِ رِحْمٍ   ام غانمٌ کمن یخیبُ

لیکن عبید کے دیوان (ص ۱) مین یہ شعر اس طرح ہے:

اعاقرٌ مثل ذ ات رِحْمٍ   اَمْ غانمٌ مثل من یخیب

ایک دو مثالین اس کی بھی ہین، کہ ایک جگہ ایک شعر ایک ترتیب سے درج ہے، لیکن دوسرے مقام پر اسی شعر
کا مصراع اوّل مصراع ثانی بن گیا ہے، مثلاً حمید الارقط کے شعر مین (۹: ۴۱) اور (۱۸: ۱۶) مین مصرعے الٹ
گئے ہین، یا (۲۰: ۲۹) پر مؤلف نے بطور استشہاد کمیت کا شعر درج کرنا چاہا ہے، اور "قال الکمیت" لکھکر شعر
کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت مؤلف کو شعر بھول گیا، اور بعد مین درج کر دینے
کے لئے جگہ خالی چھوڑ دی لیکن بات ذہن سے اتر گئی، اور شعر درج نہ ہوسکا،

---

[1] لسان العرب جلد ۴ صفحہ ۴۰۹ [2] تاج العروس ج ۲، صفحہ ۳۲۰،

(۴ : ۴۴۴) پر ایک شعر ہے،

تَرکضنَ الخیل فیہا بین بُبتٍ الی آلا و رادتنحط بالنہاب

اس سلسلہ میں مؤلف نے "قال عباس بن" لکھکر شاعر کے باپ کا نام درج نہیں کیا، اور جگہ خالی چھوڑ دی لیکن بعینہٖ یہی شعر دوسرے مقام پر درج کرتے ہوئے لکھا: قال عباس بن مرداس السلمی، (ج ۷، ص ۳۲۷)

اس کی مثال بھی ہے کہ مؤلف کو شعر نقل کرتے وقت شاعر کے متعلق شک ہوگیا ہے اور بجائے ایک شاعر کا نام لکھنے کے دو کا لکھ دیا ہے مثلاً (۲ : ۳۴۶) پر لکھتا ہے "قال ابو ذویب او صخر الغی" بعض دفعہ ایسا بھی کہ ایک مقام (۲ : ۲۸۷) پر ایک شعر عبد اللہ بن غنمۃ الضبی کی جانب منسوب کیا ہو، پھر بعینہ وہی شعر دوسرے مقام (۱۹ : ۱۴۳) پر اسی شاعر کی جانب منسوب کرنے کے بعد انتساب میں شک پیدا ہوگیا، پھر خود ہی اس کی تصحیح کر دی ہو "والصحیح انہ لسلمۃ بن عوبۃ الضبی"

یا ایک شعر ایک مقام پر (۶ : ۷) غسان بن وعلہ کی جانب منسوب کیا ہے لیکن وہی شعر دوسرے مقام (۱۹ : ۱۹۴) النمر بن تولب کی طرف منسوب کر دیا، اس قسم کی مثالیں اور بھی ملتی ہیں انتساب میں اختلاف کے علاوہ خود شعروں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، ایک مقام پر ایک شعر درج ہے، دوسرے مقام پر وہی شعر تھوڑے سے اختلاف سے مرقوم ہے، اس کی مثالیں بھی بہ کثرت ملتی ہیں،

بعض ایسے اشعار ہیں کہ مؤلف لسان العرب نے ان کو کسی شاعر کی جانب منسوب کیا ہے لیکن وہ اشعار اس شاعر کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے، مثلاً ذیل کا شعر طرماح کی جانب منسوب کیا ہے، (۶ : ۲۵۸)

کل مشکوک عصا فیرہ قانیٔ اللون حدیث الزماھر

یہ شعر طرماح کے دیوان میں موجود نہیں، اور نہ اس کے ملحقہ ضمیمہ میں ہے جس میں مختلف کتب سے اس کے اشعار جمع کرکے درج کئے گئے ہیں، بعض اشعار لسان العرب اور دواوین میں باختلاف الفاظ پائے جاتے ہیں،

اسی طرح اور بھی بہت سے مسامحات ہیں جنھیں میں نے لسان العرب کی فہارس مرتب کرتے وقت جمع کیا تھا، اگر ان سب کا ذکر کیا جائے تو اس کے لئے کئی مقالوں کی ضرورت ہوگی،

زندگی مین غم کیون ہے؟[1]

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا، استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

بے خلش با زیستن نا زیستن! باید آتش در تہ پا زیستن
زیستن این گونہ تقدیر خودی است از ہمین تقدیر تعمیر خودی است (اقبال)

ابتلاء یا آزمایش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلا ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزون کے روک لئے جانے یا فنا کر دیئے جانے سے ان پر آفات کے نزول سے ان کے حصول مین مشکلات کے پیدا ہونے سے خلش سے درد و غم سے رنج و الم سے، قلب کے تار ٹوٹنے سے یا زیادہ جامع الفاظ مین یون کہو، خوف سے بھوک سے جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے، اور ابتلاء کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی پختگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص و عام رحمتون و راحتون کا نزول ہوتا ہے اور جو شخص ابتلاء سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی و جوبی قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اور نادانستہ طریقہ پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہین چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہین چاہتا، وہ بھول جاتا ہے کہ

دوام ما ز سوز نا تمام است چو ماہی جز تپش بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوش ساحل تپیدے یک دم و مرگ دوام است! (اقبال)

---

[1] یہ مقالہ حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس نظام آباد دکن مین سنایا گیا،

اپنے اس دعوی کی تائید میں ہم آپ کو کچھ دیر کے لئے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہیں، اور کائنات و فطرتِ انسانی کے چند کلی و ضروری قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں ع

یک تنقیہ دماغ می باید کرد!

انسان، احتیاج کا دوسرا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقیید ہی سے احتیاج پیدا ہوتی ہے، یعنی اس کی فطرت ہی میں احتیاج ہے، وہ حاجت مند ہے، فقیر ہے، اور درد نتیجہ ہے اسی فقر و احتیاج کا! فطری طور پر وہ اس درد کی دوا چاہتا ہے:

عالم ہمہ دردست و دوائی خواہد		از خوانِ کرم برگ و نوائی خواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن		درویش غذا شہ اشتہائی خواہد

(سحابی استرآبادی)

اب اس عالمِ اسباب و علل میں جس کی تشبیہ انگارہ سے دیجا سکتی ہے، مجاہدہ اور عمل ہی سے احتیاج و فقر، درد و غم بڑی حد تک دور کئے جا سکتے ہیں، جو اپنی بنیاد و اساس کے طور پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں، اور علم صحیح عمل سے علیحدہ ہو کر نافع نہیں ہوسکتا، اس لئے ہم انھیں دو پہلوؤں کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعوی کی تائید کریں گے،

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنی میں ہمیشہ خطرناک زندگی ہے، کہ درد و غم، سوز و الم اس کی ماہیت میں داخل ہیں، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں، ان کا ایقان ہے، کہ کائنات کا مبدء حق تعالی ہیں، جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لامحدود ہیں، وہی اس کائنات پر حکمران ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیت ان ہی کی نافذ ہو رہی ہے، لہذا یہ کائنات مظہر ہے خیر و حکمت کا، ہر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اور ہر رنگ میں انسان جو مبتلا رہتا ہے، اس میں کونسی حکمت ہے، اور خیر کا کونسا نمایاں پہلو ہے؟ ان ہی واقفانِ راز کا بیان ہے، کہ اہلِ ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے، اس کی

توضیح تین قوانین کی شکل میں پیش کیجا سکتی ہے،

(۱) درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے جرم و معصیت کا، گناہ و بدکرداری کا، ذمائم اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآن حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے :-

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (پ ۲۵ ع ۵)	تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمھارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو درگذر ہی کر دیتا ہے،

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے :-

اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (پ ۴ ع ۸)	اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی، کہ تم اس سے دو چند پہنچا چکے ہو، تو کہتے ہو، کہ یہ کہاں سے آئی، آپ فرما دیجئے کہ یہ تکلیف تم کو تمھارے ہی طرف سے پہنچی،

صاحب کتاب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ اِنَّمَا ھِیَ اَعْمَالُکُمْ تُرَدُّ عَلَیْکُمْ[1] یہ تمھارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں، قرآن و خبر سے اس راز کو معلوم کرکے حکما و صوفیائے اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے، کہ

اِنَّ جمیع الوجود یقابلکم بحسب ما برز منکم من الاعمال فانظروا کیف تکونون

فانّ الظل تابع للشاخص فی العوج والاستقامة (شیخ ابو النجا)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسے ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے، اس لئے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شے ٹیڑھی ہے، تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا، اور اگر سیدھی ہے

---

[1] انّما ھی اعمالکم احصیھا علیکم فمن وجد خیراً فلیحمد اللہ ومن وجد غیرھا فلا یلومنّ الا نفسہ۔

محال کی تمنا کی، من طلب استقامۃ الظل مع عوج الشاخص فقد رام المحال! اسلئے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو، کہ یہ جو سوز وغم تمھارے قلب کو کھائے جا رہا ہے، یہ نتیجہ ہے تمھارے ہی اعمال بد کا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ تکلیف دے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے، تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی؟ ممکن ہے کہ فوراً یاد نہ آئے لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے، وہ ایک روز تمھارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائے گا! ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار سے کام لیا جائے اور دیانت فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے، کہ اللوم علی لا علیہم، ملامت مجھ پر ہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن، میرے ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں، ع

زادۂ طبع من اند آنانکہ خصمان من اند (خاقانی)

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگے گا، کہ "اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک" تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے! اور دوالم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے، یداک اوکتا وفوک نفخ![1]

جو مصیبت و آفت، درد و غم گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے، کہ انسان نزول بلا پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بےکس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے، جزع و فزع کرتا، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، مقام شکوی میں داخل ہو جاتا ہے، اور مقام صبر سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے، کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہام باطلہ سے تخلیہ کرے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف پلٹے، ظلمتوں سے نکل جائے، غم و الم

---

[1] قول شیخ اکبرؒ، تیرے ہاتھوں نے کمایا، اور تیرے منہ نے پھونکا،

کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائیں گی، اور راحت و مسرت کا نور اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگے گا،

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں، ان کا وجود اس پر اسرار کائنات میں بے معنی نہیں، شر محض نہیں، یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لیجانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں، یہ جرائم و معاصی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں کہو کہ یہ خام کو پختہ بنانے کیلئے ضروری ہیں، اقبال نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے:

جہان ما کہ جز انگارۂ نیست — اسیر انقلاب صبح و شام است

ز سوہانِ قضا ہموار گردد — ہنوز این پیکرِ گِل ناتمام است

سوہان قضا پیکر خاکی کے نقص و تحدید کو، کجی و خامی کو، غم و الم کے انگارہ سے دور کرتا جاتا ہے، اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لاتا ہے!

(۲) بعض دفعہ درد و الم سوز و غم معاصی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں عائد کئے جاتے، مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے، تکفیر و تمحیص ہوتی ہے، شہوتوں و لذتوں کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوامر الٰہی کی مخالفتوں سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، درد و غم سوز و الم نفس سے ظلمتوں کو رفع کرتے ہیں، مردہ قلب کو جلاتے جگاتے ہیں، حق تعالیٰ کی طرف اُس کا رُخ پھیرتے ہیں، جو نور مطلق ہیں، وہ ان کی طرف رُخ کر کے نورانی ہو جاتا ہے، اور گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان سے جڑ جاتا ہے، ربط قائم کر لیتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر تطہیر کے لئے کوئی اور شے نہیں، اور بلا آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر ع

این بلاے دوست تطہیرِ شما است (رومی)

اسی مقصود کو پیش نظر رکھکر عارف روم درد و غم (قبض) سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اس کو سالک کے لئے مفید قرار دیتے ہیں،

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بین تازہ باش وچین میفگن بر جبین

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو آن صلاح تست آیس دل مشو!

اسی خیال سے صوفیۂ کرام نے بلا و مصیبت کو حق تعالیٰ کے انعامات سے زیادہ بہتر قرار دیا ہے آلامِ محبوب

بہ از انعامِ محبوب، بلا ہی عطا ہے، اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است و از عطا نالیدن خطاست!

کے ز آزار تو بیزار شود جانِ حسین زخم چون از تو رسد با ہمہ آزار خوشیم

(منصور حلاج)

بلا و غم جب تکفیر و تحیص کے لئے آتے ہین، تو اس کی صاف علامت یہی ہے، کہ مُبتلیٰ جزع و فزع نہین

کرتا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستون اور ہمسایون کے سامنے اپنی مصیبت کو پیش کر کے شکوی و شکایت نہین

کرتا، صبر کر کے بے حساب اجر کا امید وار رہتا ہے!

(۳) اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لئے بھی نہین آتی، بلکہ ارتفاعِ درجات اور بلوغِ منازل

عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے، جنھون نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے

قلوب پاک و مصفی ہین، جنھیں ربط بحق قائم ہے، دیکھا جاتا ہے کہ کثرت سے بلائین ان ہی پر نازل ہوتی ہین چنانچہ

البلاء للولاء، بلا دوستون کے لئے ہوتی ہے، مشہور خاص و عام یہی ہے، اس قانون کو رازدانِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم

نے یون بیان فرمایا ہے:

اذا احب اللہ عبدًا ابتلاہ فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ،

یعنی جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہین تو اس کو مصیبت مین مبتلا کرتے ہین، اگر وہ صبر کرے تو اپنا

پسندیدہ بنا لیتے ہین، اور اگر راضی رہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہین، اسی لئے حضرت معروفؒ فرمایا کرتے تھے

لیس بصادق فی دعواہ من لم یتلذذ بضرب مولاہ، جو اپنے مولا کی مار سے لذت نہین لیتا وہ سچا غلام ہی نہین!

اسی مفہوم کو کسی عاشق نے ان شریلے نغمون مین ادا کیا ہے:

جان بلب آمد ز درد کردم از دود طلب — گفت اگر تو عاشقی صبر کن و رضا طلب
یار و ے کہ بر سرت تیغ زند تو دم مزن — سر بفدا ے یار کن ہیچ نہ خون بہا طلب
محوے مراد یار شو تا شود او بہ کام تو — قابل التفات نیست عاشق مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضاءات وقابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہین، کہ منازل عالیہ تک رسائی کے لئے درد وغم لابدی ولازمی ہے، تقیید جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہوسکتی، درد والم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیت کیا ہے؟ نفس کی تحدیدات سے رہائی ہے، ذمائم اخلاقیہ تحدیدہی کا نتیجہ ہین، صفات حسنہ کا پیدا کرنا مشقتون کا برداشت کرنا ہے، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفات حسنہ پیدا ہوجاتے ہین، تو انسان ترفع محسوس کرنے لگتا اور ہزارون غمون سے نجات پاتا ہے، گو درد وغم کو وہ فطرۃً مکروہ سمجھتا ہے، لیکن نتائج سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے، کہ

عسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللّٰہ فیہ خیراً کثیراً، — یعنی شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس مین خیر کثیر رکھی ہو،

اولیا پر جو بلائین نازل ہوتی ہین، وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لئے ہوتی ہین، حق تعالیٰ انھین اپنا قرب عطا کرتے ہین، فقر ونیستی مین انھیں مبتلا کرتے ہین، درد وحزن ان پر طاری کرتے ہین، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطی الا باولیاء ہ عشاق بلا کی اہمیت وقیمت سے واقف ہوتے ہین متنا وار وہ اس کے طالب ہوتے ہین، کہ

درد قدح درد کہ آن می باید — دردیکہ زتست بیشتر می باید
تلخست عجب لیک بسے خوش خوار است — ہرچند ہمی خورم دگر می باید!

کبھی وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہکر تسکین دیتے ہیں، کہ

بفقر و نیستی یک دو روزہ خوش می باش   کہ یار خود ز کرم عذر خواہ می گردد!

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ میں تن کی زیادہ قدر نہیں اور جان کی قدر "پرتو جانان" کی وجہ سے ہے، تن اگر تکلیف میں ہو، لیکن جان جانان کے مراد کے مطابق ہو، اور اس کے جمال سے کیف اندوز تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت! اسی لئے بلا میں یہ عوام کالانعام کے خلاف

(۱) کسی غیر کے آگے شاکی نہیں ہوتے، اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں، کہ فَاِنَّهُمْ لَنْ يُغْنُوا عَنْكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْئًا ۔

ستم کشان محبت دم از فغان بستند
گرہ ز جبہ کشادند و بر زبان بستند

(۲) اپنے باطن میں اتہام اپنے رب پر نہیں رکھتے، اس کی حکمت بالغہ میں انھیں کوئی شک نہیں ہوتا!

وہ حق تعالیٰ سے یہ خطاب سنتے ہیں،

بادرد بساز چون دوائے تو منم   در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی   شکرانہ بدہ کہ خونبہائے تو منم

(۳) انھیں یقین کامل ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لئے اختیار کی ہے وہی ان کیلئے دین و دنیا میں اچھی ہے؎

صلاحِ ما ہمہ آنست کان تراست صلاح

حدیث الولیٰ میں اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ تونگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہیں کرسکتی، اگر میں اوس کو فقیر کردوں تو وہ فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ

کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا کوئی چیز نیک نہیں بنا سکتی، اگر میں اوس کو غنی کر دوں تو غنا اوس کے ایمان کو فاسد کر دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز اس کو درست نہیں کر سکتی اگر میں اوس کو بیمار کر دوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے، کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی، اگر میں اوس کو تندرست رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کر دے، مجھے اپنے بندوں کے احوال سے پوری آگاہی ہے، اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں

حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسن تدبیر، قضا و اختیار سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں، اور ہر حال میں "رضا بالعطا، ورضا حال" کو ضروری سمجھتے ہیں، اور قلب کی گہرائیوں سے ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

کے قائل ہوتے ہیں، اسی لئے گو وہ "طبعی" غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن "عقلی سرور" سے اون کے قلب خالی نہیں ہوتے، یہ ہے "جمع بین الاضداد" اور "ضدوں کی جمع کا یہ ہنر" ان ہی کو آتا ہے، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ ع

عالم ہمہ درد است و دوا می خواہد!

یہ درد یا تو گناہوں اور بدکرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لئے وارد ہوتا ہے یا رفع درجات کے واسطے عائد کیا جاتا ہے، بہرحال

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ (ع پ ۱۵)   ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا

کے کلی قانون کا کوئی استثنا نہیں دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ غم و اندوہ میں گذرتی ہے، سوز و الم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موج بیقرار کے مانند ہے، جس کی ماہیت ہی میں پیچ و تاب ہے، چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے ؎

چہ پرسی از کجایم چیستم من؟ بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
درین دریا چو موج بیقرارم اگر بر خود نہ پیچم نیستم من!

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا درد وغم سوز والم بے معنی نہیں، بغیر مقصد وغایت کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوتِ حیات کی توفیر ہے، اسی مقصود کو پیشِ نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت میں بھی عقلی سرور حاصل ہوسکتا ہے، یعنی اوس کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور، اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف رومی نے فرمایا تھا ؎

چون بدانستی کہ ظلِ کیستی فارغی گر مردی و گر زیستی
قطرۂ نوری سراپا نور باش بگذر از غم دائما مسرور باش

فافهم وتدبر!

الفاروق

حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرزِ حکومت، صحابہؓ کے فتوحات، عراق وشام، مصر وایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر، یہ کتاب مولنا شبلی کی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، مطبع معارف نے نہایت اہتمام سے اس کا نیا ایڈیشن تیار کرایا ہے، جس کے ساتھ دنیاے اسلام کا رنگین نقشہ بھی شامل ہے، طباعت و کاغذ نہایت عمدہ قیمت ہے، ضخامت ۲۱۲ صفحے،

المامون

خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہد سلطنت کے حالات، مولنا شبلی مرحوم کی یہ پہلی تصنیف ہے جس میں مصنف نے تاریخ اسلام کے پرفخر عہد کے سیاسی، علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی حالات قلمبند کئے ہیں، جن سے دولتِ عباسیہ کے عروج وکمال کے زمانہ کا مرقع آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، دارالمصنفین نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے، قیمت عہ، ضخامت ۲۴۴ صفحے،

"منیجر"

نواحِ دہلی

کی

اردو کی دو قدیم ترین کتابین

از

جناب ڈاکٹر رشید الدین احمد صاحب بی ایس سی علیگ خانقاہ شعیبیہ تجارہ

صاحبِ گلشنِ ہند و آبِ حیات وغیرہ نے شاہ ولی اللہ دکنی اورنگ آبادی متوفی ۱۱۵۵ھ کو زبان اردو کا پہلا شاعر لکھا ہے، جو سید ابو المعالی کے ساتھ بعہدِ سلطنت محمد شاہ ۱۱۳۴ھ میں دہلی آئے چنانچہ لکھتے ہین ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سون،

۱۱۴۱ھ مین اوھون نے مثنوی دہ مجلس لکھی، مثنوی مین ہے،

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال   تھا گیارہ سو پہ اکتالیسوان سال

مصنفِ دکن مین اردو نے وجدی کی مثنوی تحفۂ عاشقان کو ۱۱۱۵ھ کی تصنیف قرار دیکر زبانِ اردو کا پہلا شاعر وجدی کو مانا ہے، مگر بہار منظر مین ہے کہ وجدی مسمی وجیہ الدین قوم شیخ کرنولی کی تحفۂ عاشقان جو مثنوی گل وہرمز عرف گل خسرو فریدی کا ترجمہ ہے، ۱۱۵۲ھ مین، اور پنچھی نامہ یا پنچھی باچھا جو منطق الطیر کا ترجمہ ہے ۱۱۴۶ھ مین اور باغ جانفزا ۱۱۴۵ھ مین لکھی گئی ہین، تحفہ کا ایک شعر یہ ہے ؎

کرون پاک دل ہو زبان پاک سون   ثنا پاک اس عاشق پاک سون

جواہرِ سخن مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی جلد اول مین اردو کا پہلا شاعر حبی دکنی کو لکھا

ہے، جنھون نے کتاب سبرس نثر میں بزبان دکنی ۱۰۴۵ھ میں لکھی،

تاریخ ادب اردو میں پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۲ھ کو لکھا گیا ہے، ان کا ایک شعر یہ ہے،

کرتے ہین دعوی شعر کا سب اپنی طبع سون بخشا فصیح شعر معانی کے تئین خدا

اور حسب تحقیق ولی اللّٰہی حضرت شیخ رزق اللہ علوی دہلوی متوفی ۹۸۹ھ نے فارسی مین جن کا تخلص مشتاقی

ہندی مین راجن ہے بہت اشعار ہندی میں تحریر فرمائے ہین، ہندی مین رسالہ پیمان اور جوت نرجن وغیرہ

ارقام فرمائے ہین،

ی واقعات امامیہ | لیکن میرے نزدیک اردو کی سب سے قدیم تر مثنوی، مثنوی واقعات امامیہ ہے، یہ مثنوی حضرت

شاہ غلام رسول تجاروی[۱] برادر حضرت شاہ حافظ منور بایزید ثانی معمر قریشی نے ہمایون کے عہد ۹۳۸ھ میں اردو

جس کو اس زمانہ مین ہندی کہتے تھے، لکھی، چنانچہ مثنوی مین ہے،

ہمایون شہ آن شاہ جمشید جاہ جو ہے حکمران اب بلا اشتباہ

غلام رسول است امیدوار شہا شہریاران مرادش برآر

تجارہ شہر وطن مالوف اوست درین ملک میوات معروف اوست

یہ مثنوی کتب خانہ مجیدی واقع خانقاہ شعیبی مملوکہ و مقبوضہ حضرت صاحب سجادہ نشین خانقاہ شعیبیہ

تجارہ آفتاب میوات میں موجود ہے، جس کو عالیجناب میجر سی، ڈبلو، ایل، ہاروے صاحب بہادر، او، بی، ای، ایم

سابق پرایم منسٹر ٹونک وغیرہ چیف منسٹر راج الور نے عجائبات مین شمار کرتے ہوے میوزیم فنڈ سے حفاظت

کتب کے لئے ایک سو بیس روپیے مرحمت فرماکر قدردانی کا ثبوت دیا ہے،

---

[۱] آپ کا مزار دہلی کی عیدگاہ کے پاس ہے، تجارہ پہلے توابع دہلی میں شمار ہوتا تھا، آج کل ریاست الور میں ہے، کتاب صبح گلشن میں تجارہ من اعمال شاہجہان آباد تحریر ہے، اور زیر حکومت فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ مورث اعلیٰ نواب صاحب آف لوہارو کے بھی رہا ہے،

نمونہ کلام اس مثنوی کے چند اشعار یہ ہین،

الٰہی ترا فضل جو یار ہو | فلک اور ملک سب مددگار ہو
میرے دل مین ہے آرزو ے تمام | حقیقت لکھون واقعات امام
بہندی زبان بعض در فرس ہم | نگارش نمودیم ترتیب نظم
کتھا ور دو دُکھ کی جگر سوز ہے | دل افسردہ گان شعلہ افروز ہے
رضاے خدا اگر نبودے چنین | ستمگر نہ بیتے میان پھر کہین
زمین پیٹ پھٹ کھائی جاتی بدم | فلک ٹوٹ پڑتا نہ با این ستم
غلام رسول آؤ سر کر سخن | کھڑی خلق تیرے سخن کو سُنن

اردو ہندی کے الفاظ اس مین اردو اور ہندی کے حسب ذیل الفاظ پائے جاتے ہین :-

جتن، آپ روپ، ہاہا، سریر، سہاگ، بالی (لڑکی)، بالا، اُگا، دلہن، راکھے، ساریان، چوک، دونون بل (طرف)، تمھون، ہمھون، برین، دہن دہرو، بتنگا، چیٹ، اوکھٹ، کپٹ، بنٹ، بچن، چھٹکن، سوہا، مانتھے، پات لاگو، بنگورا، کاپن، دملے، ادسان، بین، کبھو دی، موے، کارنے، ستن، کون، سون، جون، پٹرا، گدا، پڑھ، بڑا، کتھا، بیتی، بپت، کہائی، اُدتی، جادتی، رُدتی، دھودتی، بھرے (پڑھے)، پچھانا (پہچانا)، بہجایا ہین، بہوت (بہت) جل (پانی)، انجھواں (آنسو)، ادگے، اوتر، ندان، پڑ گئے، چہون اور، تروار، سوگند، باگ (لگام)، کتے، کنے، دُملاس سورسانوت لایا بلاک، پہریہ (پہن لیا)، اینچ کر، انون، لک، چونب (چوم)، انکھیان بجھہ، بنا ناتہ، چین، مکھ سون، دیدن آپنا، سنگاتی، گلے لاگ، چاچا، وادینے، پتاسا، نراسا، انکھیون، کملا، لوہو بہن، کھونر تدری، چھپون، کشک، ٹک، کچھے، آدتا، لاوتا، ہول، سراوپر لیا، جگ، بوتا، سورمان، لڑن، مکیان (مکہ والے) کمس بلی، بلادن، راہ لورن لگے، کیتے، تینے، جدی، کنے، کرتیان، من بلن، بیاہلی، جہراون، بچاون، ردس، جھیلین، اسنے بچل، ترت، کملا ،

نعم تجا.ری | اسی دور کی دوسری کتاب دیوان منعم ہے، اس کے مصنف حضرت مولانا شاہ محمد اشرف عمرانی القریشی
... بہ منعم ہیں، یہ حضرت شاہ غلام رسول مصنف "افحات امامیہ" کے بھتیجے تھے، یہ دیوان بھی مذکورہ بالا لائبریری میں موجود ہے،
کے اشعار کا نمونہ یہ ہے،

کلام |

دیکھ کر اس قد موزون کو زبس شرم کے ساتھ — گڑ گیا خاک میں سرو آج گلستان کے بیچ
ہے پیچ و تاب مین سنبل کا دل بی دیکھ — سُن کر صبا سین طرۂ دستار کی خبر
شمع اس یار کے رخسار کون دیکھ — ہوئی فانوس مین جل کر کے روپوش
ٹک ایک تو چیت مت کھو عمر ضائع — نہین بہتر ہے منعم خواب خرگوش
رونق نہین ہے سفحہ کی جدول بغیر دیکھ — ایسے ہی حسن کے تئین دے ہے بہار خط
کونسا معشوق ہے جگ مین جلے عاشق کیسا تھ — اس قدر عاشق نوازی کون ترے چھاتی ہے شمع
ابر ہے سبزہ ہے او خندان ہے گل گلشن کے بیچ — حیف ہے اس وقت میں ساقی نہیں دیتا ایاغ
رات دن ہے شوق سیں گل کے چمن مین پا بند — سب غلط ہے جو کوئی کہتا ہے سرو آزاد ہر
منعم جو عاشقان میں اس وقت کا سلیمان — دیو گر اپنی اسکون انگشتری نشانی

... دو اور ہندی کے الفاظ | بل گئے، جھکجھورے، بسرام، بسر، مان سوں، لک، سیں، سیتی، جاگین، زد،
... جوں، باج، کھوتا، بتاں، لباں، بوتے، (بت) گلے ہار، بوجھ، تیں، نیں، نین، تس پی، سجد ...
... تدبیر، جد، پھیر، (پھر) جیک، ٹک، جیت، انے آگیں، جبلکا، صحبت برار، جگ دو ہین، آجا دان ...
... بی، آنکھاں، پریت، پاؤتی، ترہیتگی، سرخوشی، چڈ ہی، انکلا، لیئی، کیھو، بوتے، (بت) جا تا رہ، دیو ...
... یچ، تجھ، اوپر، پیڑو، حوش نیں، چاکہا، جیو، من، لگن، اگن، لکھن، تیکھی، نیٹ، بہنک، پڑہ،
... ل ل، جھیلیں، ایتے، ایتا، کیدھر، اڈگئے، وسکا، جس، اُور، تجن، ساجن، نندک ...

یا نام نداب وغیرہ،

سلسلۂ رسولیہ کے متعدد بزرگ ارشاد و ہدایت کے ساتھ صاحب علم بھی تھے، حضرت شاہ غلام رسول نے مثنوی واقعات امامیہ تصنیف فرمائی، مولانا شاہ محمد اشرف، حضرت خواجہ محمد ارشد فردوسی، حضرت مخدوم محمد شعیب قریشی، حضرت مخدوم محمد یونس احمد قبلہ نما صاحب دیوان تھے، ان سب کے دیوان اردو میں ہیں، حضرت شیخ الحدیث مولانا مفتی حافظ اجیر الدین نے الہ آباد میں مدرسۂ اسلامیہ قائم فرمایا آپ حضرت مولانا محمد حسین صاحب مرحوم الہ آبادی کے استاد بھی تھے،

تاریخ صقلیہ جلد اوّل

مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی، اور اسپین کی طرح اس کو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا، اور تقریباً پانچسو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی کوئی تاریخ اردو انگریزی میں کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی، چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اس کی تاریخ مرتب کی گئی ہے، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی اور جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج، اور مسلمانوں کے مصائب اور جلاوطنی کا مرقع دکھایا گیا ہے، قیمت :- للعہ ر ۶ ہ ہ ۵ صفحے،

سیر الصحابہ جلد ششم

اس میں عہد صحابہ کی چار اہم ہستیوں حضرت حسینؓ، امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات وسوانح اخلاق و فضائل اور ان کے مذہبی اخلاقی اور سیاسی مجاہدات اور کارناموں اور ان کے باہمی سیاسی اختلافات کی تفصیل ہے، واقعۂ کربلا اور امیر معاویہؓ کے متعلق اردو میں اس سے زیادہ مستند اور تحقیقی حالات نہیں مل سکتے، قیمت ؏ ۸ر

"منیجر"

طبِّ فرشتہ

از

نواب صدریار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی

ذی الحجہ سنہ حال کے معارف مین عزیزی مولوی سید ابوظفر نے طبِ فرشتہ پر ایک مقالہ لکھا ہے، اون کے پیشِ نظر نسخہ دوسرے مقالے پر ختم ہو جاتا ہے،

میرے کتبخانہ مین بھی ایک نسخہ طبِّ فرشتہ "دستور الاطبا" کا ہے، سنِ کتابت اس پر بھی نہین ہے، ایک جگہ لوح پر یہ عبارت تحریر ہے :-

"طب فرشتہ حکیم عسکری در ۱۱۹۱ھ ابتیاع نمود برائے اولاد خود"

اس سے معلوم ہوا کہ کم سے کم دو سو برس کا لکھا ہوا یہ نسخہ ہے، اس مین تین مقالے ہین، تیسرا مقالہ معالجات مین ہے جس میں ۱۶۰ فصلین ہین، یہان کے نسخے میں ۱۵۷ (ایک سو ستاون) فصلین ہین، اخیر کی تین فصلین نہین ہین، آخر فصل اس نسخے کی تپ کے علاج پر ہے، اسی فصل پر یہ نسخہ ختم ہو جاتا ہے،

استفسار و جواب

مسلمان سلاطین کے لوازم شاہی

تخت، تاج، چتر و علم

پروفیسر غلام مصطفےٰ خان صاحب
کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)

مخدومی و مکرمی دام ظلکم

"قدمبوسی و سلام مسنون عرض ہے، ایک بات کے لئے آپ کو تکلیف دیتا ہون مین نے بہرام شاہ غزنوی کی مفصل تاریخ بفضلہ تعالیٰ لکھ لی ہے، مجھے بعض شعراء کے اشعار ملے ہین جو ابراہیم غزنوی (المتوفی ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء) اور اس کے بعد کے سلاطین کے متعلق ہین، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنویون کا علم سیاہ تھا، اس پر شیر اور ہلال کی تصویر تھی، تاج سفید تھا، اور چتر سیاہ تھا، آداب الحرب (ضمیمہ اورنٹیل کالج میگزین ص ۹) سے معلوم ہوتا ہے، کہ چتر پر باز تھا، جیسا کہ سنجر کے یہان بھی تھا، (کلیات انوری ۱۸۸۰ء ص ۱۰۳)

شیرِ علم کے متعلق رونی (ص ۶۱) کہتے ہین :-

چو شیر رایتِ شیرِ دلیرِ او بیدل ۔۔۔ چہ شاخِ آہو شاخِ درختِ او بے بر

صفحہ ۹۰ مین کہتے ہین :-

در جہد باسِ او بشیرِ فلک ۔۔۔ اگر اندر شود بہ شیرِ علم

سنائی (بمبئی - ص ۳۴۰) کہتے ہیں :-

آن چنان شیر علم سر بفرازد بمثل گوئی از چشمۂ خورشید کند آب خوری

وغیرہ وغیرہ،

اب آپ سے دو باتین معلوم کرنا چاہتا ہون :-

(۱) ان اشعار مین شیر علم سے کیا یہی مراد ہوگی، کہ علم مین شیر کی تصویر تھی ؟ یا یہ محض استعارہ ہے ؟

(۲) مسلمانون اور بالخصوص غزنوی عہد کے سلاطین کے علم، چتر اور تاج وغیرہ کا حال کہان معلوم ہوگا، ؟ کیا کسی صاحب نے اس موضوع پر کوئی مضمون لکھا ہے ؟

امید ہے کہ جواب سے جلد سرفراز فرمائین گے، اور تشنۂ علم کی تسکین فرمائین گے،

میرا تہنیت نامہ خدمت مین پہونچا ہوگا، والسّلام

معارف :- محترمی زاد لطفکم

السلام علیکم، گرامی نامہ ملا، آپ کے دونون استفسارون کے متعلق حسب ذیل گذارشین ہین :-

۱- بعض سلاطین کے علم مین "سورج" اور "شیر" کی تصویرین دراصل بنی ہوئی تھین، ابھی کچھ دن گذرے کسی مستند کتاب مین یہ روایت نظر سے گذری تھی، کہ "برج اسد" سے کچھ تفاول لے کر شیر کی تصویر کو علم مین داخل کیا گیا، آج حوالہ کے لئے یہ روایت بہت سی کتابون مین تلاش کی لیکن افسوس ہے کہ نہ مل سکی تاہم اپنے حافظہ اور یادداشت کے بھروسہ پر یہ عرض کر سکتا ہون کہ آپ "شیر علم" کو استعارہ کے بجائے حقیقت پر محمول فرمائین، اور جن اشعار مین آپ نے غزنویون کے علم کے سیاہ ہونے اور اس پر شیر اور ہلال کی تصویرون کے موجود ہونے کا تذکرہ دیکھا ہے، اس کو بھی حقیقت نگاری پر محمول فرمائین جب کبھی وہ روایت دوبارہ نظر سے گذرے گی، انشاء اللہ اس کو نقل کر کے ارسال خدمت کرون گا، بہار عجم مین بھی شیر علم کا مختصر ذکر ملا ہے، چنانچہ مذکور ہے :-

شیر علم را نقش شیر کہ بر علم کنندہ مولوی معنوی سے

ما ہمہ شیران ولے شیر علم حملہ شان از باد باشد دمبدم (جلد ۲ صفحہ ۱۸۳)

اس کے ساتھ اس سلسلہ میں یہ امر بھی پیش نگاہ رہے، کہ خونخوار درندہ کی تصویر علم پر اس لئے بھی بنائی جا سکتی ہے، کہ علم بردار فوج دشمنوں کے لئے خونخوار ثابت ہو،

۲۔ سلاطین اسلام کے مختلف خاندانوں میں جو مختلف شاہی رسوم و مراتب رائج تھے، ان کا مفصل تذکرہ قلقشندی متوفی سنہ ۸۲۱ھ کی صبح الاعشیٰ کی مختلف جلدوں مثلاً ج ۳ ص ۳، ۴۹۸، ۲۲، ۵ ج ۴ ص ۶، ۸، ج ۵ ص ۲۰۶، ۲۲۳، میں ملے گا، اسی طرح مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۸۴، ۲۸۵، اور خطط مصر مقریزی ج ۳ صفحہ ۳۴۰، ص ۳۴۲ وغیرہ میں مختلف مواقع پر شاہی تخت، چتر، تاج و علم، غرض جملہ شاہی لوازم کا ذکر آیا ہے،

اردو میں ابھی تک اس موضوع پر کوئی مستقل مضمون نظر سے نہیں گذرا، مذکورۂ بالا ماخذ سے ان چیزوں کے متعلق ذیل میں سرسری معلومات مرتب کر دیئے جاتے ہیں، مزید تفصیلات کی ضرورت ہو تو اصل ماخذ کی طرف رجوع کریں،

ان لوازم شاہی میں مختلف شاہی خاندانوں میں کم و بیش مختلف چیزیں مثلاً تخت، تاج، چتر، علم، نقارہ، مجیرا، شہنائی، قرنا، خیمہ، سراپردہ، چاوش و تبردار، اور کوتل گھوڑے، اور ان کے چند مخصوص شاہی زین اور گردنی (الرقبہ) وغیرہ مختلف صورتوں اور شکلوں میں رائج تھیں، اور یہ مختلف شاہانہ موکب و جلوس و مجالس کے موقعوں پر استعمال کیجاتی تھیں، ابن خلدون ان لوازم پر فلسفیانہ انداز میں نظر ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ

سلاطین ان لوازم کو اپنے کر و فر اور دبدبہ و سطوت کی نمائش اور امراء، ارکان دولت اور عامۃ الناس سے اپنے امتیاز و اختصاص کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے، ارسطو کے خیال کے مطابق طبل و نقارہ کا رواج ان میں ابتداءً اس لئے ہوا کہ لڑائیوں میں اس کی آواز کی ہیبت سے دشمنوں کے دل دہلا جائیں علاوہ ازیں نغموں کے سننے سے طبیعت میں سرور و نشاط پیدا ہوتا ہے اور اس وقت طبیعت مشکل سے مشکل کام کو انجام دینے

پر آمادہ ہو جاتی ہے، اس لئے عجم لڑائیوں اور شاہانہ موکب وجلوس کے موقعوں پر نشاط پیدا کرنے کے لئے موسیقی کے مناسب آلات استعمال کرتے تھے، اور عرب اپنی اس ضرورت کو اپنے مطربانہ اشعار سے پورا کرتے تھے، لیکن مسلمان سلاطین نے جب عجمی طریقے قبول کرلئے، تو ان کے تمام شاہانہ لوازم کو بھی اختیار کرلیا، اور شاہی امتیاز ونشان کے لئے چند خاص چیزیں مخصوص شکل ووضع کی خاص کرلی گئیں،

تخت جلوس سلطانی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا، اس میں بنیادی تخیل یہ تھا، کہ سلطان کی نشست گاہ مجلس کے حاضرین سے بلند رہے، تخت کا استعمال قدیم زمانہ سے سلاطین کے دربار میں رائج تھا، وہ عموماً سونے کا ہوتا تھا، حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کا تخت ہاتھی دانت کا تھا، اور وہ سونے سے منڈھا ہوا تھا، اور جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں، سلاطین اس کو اپنی سلطنت کی ترقی کرجانے کے بعد اختیار کیا کرتے تھے، اسلام میں اس کو سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے اختیار کیا تھا، انھوں نے اس کو استعمال کرتے وقت لوگوں سے یہ کہکر کہ ان کے جسم میں فربہی آگئی ہے، اس کے استعمال کرنے کی اجازت چاہی، چنانچہ لوگوں (صحابہ) نے ان کو اجازت دیدی اور انھوں نے اپنے لئے غالباً گدے دار اونچا تخت تیار کرایا، پھر آگے چل کر مسلمان سلاطین نے انہی کا اتباع کیا، ورنہ عربوں میں پہلے اس کا رواج نہ تھا، چنانچہ حضرت عمرو بن العاصؓ والی مصر کے متعلق روایت ہے کہ وہ اپنے قصر میں سب عربوں کے ساتھ زمین پر بیٹھا کرتے تھے، جب مصر کا مقوقس ان سے ملنے کے لئے قصر میں آتا تھا تو اس کے ساتھ سونے کا ایک تخت بھی آدمیوں کے ہاتھ میں اٹھا کر لایا جاتا تھا، اور وہ اسی تخت پر بیٹھا کرتا تھا، اور حضرت عمرو بن العاصؓ اس کے سامنے اپنی جگہ فرش پر بیٹھتے تھے، اور چونکہ وہ مقوقس اپنے یہاں کی رسم کی پابندی کرتا تھا، اس لئے حاضرین اس کے اس طرح بیٹھنے کو برا نہ مانتے تھے،

اس کے بعد جب بنو عباس اور عبیدیین (فاطمین مصر) کا زمانہ آیا تو انھوں نے قیصر وکسریٰ کے یہ طریقے خود اختیار کرلئے، (مقدمہ ابن خلدون ملخصاً ص ۲۰۲ و ۲۰۵-۲۰۶)

چنانچہ مسلمان سلاطین کے مختلف خاندانوں میں شاہی جلوس کے لئے مختلف قسم کے تخت و کرسی رائج تھے،

بنو عباس کا تخت زمین سے ۶ فٹ اونچا تھا، فاطمین کا تخت سنگ رُخام کا ایک منبر تھا، جیسا کہ جامع مسجدون مین ہوتا ہے، لیکن اس کی پشت علحدہ سے ہونے کے بجائے دیوار سے لگی ہوئی تھی، اس منبر پر سلطان اہم موقعون پر جلوس کرتا تھا، ورنہ عام دنون مین حریر سے منڈھی ہوئی لکڑی کی ایک کرسی پر بیٹھا کرتا تھا، جو اس تخت شاہی کے پاس رکھی رہتی تھی، (صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۴۴۶)

ان شاہی تختون مین رفتہ رفتہ کس قدر تکلفات بڑھتے گئے، اس کا اندازہ ایران و ہندوستان کے تخت طاؤس وغیرہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے،

تاج، سلاطینِ اسلام مین تاج کا استعمال نسبتہً بعد مین ہوا ہے، موسیٰ بن نصیر کا لڑکا عبدالعزیز اندلس کی فتح کے بعد اس کا پہلا والی مقرر ہوا تھا، اسپین کے سابق فرمانروا راڈرک کی بیوہ ایجیلینا اس کے حبالۂ عقد مین آگئی تھی، عبدالعزیز کے خلاف اندلس کے عربون مین شورش پھیلائی گئی تھی، اور اس پر دو الزامات عائد کئے گئے تھے جن مین سے پہلا الزام یہ تھا کہ راڈرک کی بیوہ نے جواب ام عاصم تھی، عبدالعزیز سے کہا کہ ہمارے یہان کے حکمران جب تک اپنے سر پر تاج نہ رکھین وہ حکمران معلوم نہین ہوتے، اس کے پاس جواہرات موجود تھے چنانچہ اس نے انہی جواہرات سے مرصع سونے کا ایک تاج اپنے ہاتھون سے تیار کرکے عبدالعزیز کے سامنے رکھا، عبدالعزیز نے کہا کہ اس کا پہننا اس کے مذہب مین روا نہین ہے، بایں ہمہ عبدالعزیز ایجیلینا کی دلدہی کے لئے اس کو خلوت مین اس کے سامنے پہننے پر آمادہ ہوگیا، اور خلوت کا یہ راز بعض ذرائع سے جلوت مین پہونچ کر طشت از بام ہوگیا اور اس کے خلاف ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا، (افتتاح الاندلس ابن القوطیہ ص ۱۱) لیکن مسلمان حکمرانون کی یہ احتیاط کچھ زیادہ دنون تک قائم نہ رہی، رفتہ رفتہ اس کا استعمال شروع ہوگیا، اور اس کا وقار سلطنت کے وقار کے مترادف سمجھا جانے لگا، چنانچہ فاطمین مصر کا تاج "تاج شریف" کہا جاتا تھا، اس تاج مین بہت سے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے، ان مین کا سب سے بڑا گوہر "یتیمہ" کے نام سے معروف تھا، اور وہ وزن مین، درہم کے مساوی تھا

(صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۴۷۲)

چتر، شاہانہ جلوس مین سلطان کے سر پر سایہ افگن رہا کرتا تھا، یہ قبہ نما ہوتا تھا، اس کی کمانیان اوپر جاکر سونے کے ایک حلقہ مین پیوست رہتی تھین، فاطمیین کے چتر کا کپڑا ان کے لباس شاہانہ کے رنگ سے ملتا جلتا رہتا تھا، چونکہ چتر شاہی خلیفہ کے سر پر سربلند رہتا تھا اسلئے وہ بھی بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، چتر افگنی کی خدمت امرائے نامدار مین سے کسی ایک کے سپرد رہتی تھی، (صبح الاعشیٰ للقلقشندی ج ۳ ص ۴۷۲،۳،۴)

فاطمیین کا یہ چتر ایوبیین کے قبضہ مین آیا، اور اسی طرح استعمال کیا گیا، ان کے عہد مین اس کا کپڑا زرد حریر کا تھا، جو سنہرے نقش و نگار سے آراستہ تھا، اور "مظلہ" کے بجائے چتر ہی کہا جاتا تھا، چتر کے اوپر چڑیا کی ایک نقرئی مورتی تھی جس پر طلا کاری تھی، (صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۷،۸)

اس سے معلوم ہوا کہ فاطمیین کے چتر مین بھی اسی طرح کسی چڑیا کی تصویر تھی، جیسا کہ مبارک شاہ نے آداب الحرب مین غزنویہ کے چتر کے متعلق لکھا ہے، کہ اس پر باز بنا ہوا تھا، (ص ۹) عجب کیا کہ فاطمیین کے چتر مین بھی باز ہی کی تصویر ہو، غزنویون کے چتر میں باز کی تصویر کے ہونے سے ذہن ایک روایت کی طرف منتقل ہوتا ہے، جس سے شاہی چتر سے باز کے تعلق پر تیاساً ایک رائے قائم کیجا سکتی ہے، مسعودی نے اسپین کے قدیم حکمرانون کے سلسلہ مین یہ دلچسپ روایت نقل کی ہے کہ

اسپین کے یہ عیسائی حکمران جب کشتیون پر سوار ہوتے تھے، تو شاہین شاہانہ سواری پر، سایہ افگن، کشتی کے ساتھ ساتھ اوپر اوپر جو مین اڑتے ہوئے چلتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان مین کے ایک حکمران "اندق" نامی کی کشتی پر شاہین سایہ افگن جا رہے تھے، کہ ایک چڑیا سامنے آگئی، شاہین نے جھپٹ کر اس کا شکار کر لیا، اور انسانون کے علم مین پہلی مرتبہ یہ بات آئی کہ شاہین شکار بھی کر سکتے ہین، چنانچہ اس کے بعد شاہین کے ذریعہ سے شکار کھیلنے کا عام رواج ہو گیا، (مسعودی ج ۲ ص ۳۶،۳۷،۲۰۰ و ۲۸۱)

اس روایت سے قدر مشترک کے طور پر یہ معلوم ہوا کہ شاہین سلاطین کے جلوس مین ان کے سرون پر سایہ افگن رہتے تھے، اسلئے شاہی سواریون سے ان کا تعلق قدیم زمانہ سے ثابت ہوتا ہے، اور شاہانہ جلوس مین از

ر پر سایہ افگن رکھنے کا ایک مدعا یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح سوار و پیادہ شاہ کی سواری کے جلو میں اس کی حفاظت
وراس کے مرتبہ کے بڑھانے کے لئے ہوتے ہیں، اس لئے طیور کا یہ حکمران فضا میں انہی خدمات کی بجاآوری پر مامور ہوتا ہے،

علم کے متعلق ابن خلدون لکھتا ہے کہ علم عہد قدیم سے لڑائیوں کی نشانیوں میں داخل ہے، میدان جنگ
میں اس کی کثرت، اس کے مختلف رنگ اور اس کے طول سے نفسیاتی طور پر دشمن کے دلوں پر خوف و ہراس طاری
کرنا مقصود ہوتا تھا، اسلام میں عہد نبوی کے آغاز سے اس کو اختیار کیا گیا، چنانچہ غزوات میں علم موجود رہتے تھے، امتداد
زمانہ سے اس کے استعمال کے طریقوں میں فرق ہوتا گیا، چنانچہ عہد رسالت و خلافت راشدہ میں صرف
لڑائیوں کے موقع پر استعمال کرتے تھے، جب بعد کے خلفاء نے شاہانہ طور و طریق اختیار کئے، اسی طرح علم کو
بھی استعمال کرنے لگے، جیسے عجمی سلاطین استعمال کرتے تھے، پھر خلفاء و سلاطین کے علاوہ امراء و عمال بھی اپنی
شان و شوکت کے اظہار کے لئے اس سے اپنے جلوس و موکب کی زینت بڑھانے لگے، اور آگے چل کر علم کی کثرت
و قلت خلفاء و عمال کے جلوس و موکب میں فرق و امتیاز قائم رکھنے کا ایک ذریعہ بن گئی،

پھر علم کے مختلف رنگوں سے مختلف خانوادوں کی تمیز کیجانے لگی، مثلاً عباسیوں نے اپنے علم کے لئے
سیاہ رنگ اختیار کیا، تاکہ وہ ہاشمی شہداء پر اپنے پا بند غم و الم کا اعلان کرتے رہیں، اس لئے وہ "مسودہ" کہے گئے،
پھر جب بنو ہاشم میں تفریق ہوئی، اور بنو طالب بنو عباس کے خلاف اٹھنے لگے، تو انھوں نے اپنے علم کا رنگ
سفید اختیار کیا، اور وہ "مبیضہ" کہے گئے، اس کے بعد المامون نے ماتمی سیاہ لباس کو چھوڑ کر سبز رنگ اختیار کر لیا،
اور اس کے جھنڈے کا رنگ بھی سبز ہو گیا،

دوسری طرف مغرب میں بربری سلاطین صنہاجی وغیرہ نے علم کے لئے کوئی مخصوص رنگ اختیار کرنے
کے بجائے رنگین ریشمی کپڑے اختیار کئے، ان کپڑوں پر وہ سنہرا کام بنا لیتے تھے، اس کے بعد جب موحدین کا
دور آیا، تو انھوں نے علم و طبل وغیرہ شاہی لوازم کے استعمال کو سلطان کے لئے مخصوص کر دیا، اور دوسرے
عمال و امراء کو ان کے استعمال کرنے کی ممانعت کر دی، پھر مختلف سلاطین نے اپنے ذوق کے لحاظ سے اپنے جلوس

کے لئے علم کی مختلف تعداد مقرر کی، چنانچہ موحدین اور اندلس کے بنو احمر سات علم رکھتے تھے، پھر بعضوں نے یہ تعداد بڑھا کر دس کردی، پھر بیس ہوئی، یہان تک کہ سو تک پہنچی، چنانچہ ابن خلدون کہتا ہے کہ اس کے زمانہ مین سلطان ابو الحسن جلوس مین سو علم رکھتا ہے، جو سنہرے کامون سے آراستہ، رنگین ریشمی کپڑون کے ہوتے ہین، پھر اسی زمانہ مین ولاۃ، عمال، اور قواد کو سفید کتان کے صرف ایک چھوٹے علم اور صرف ایک چھوٹے نقارہ کی اجازت دی گئی، وہ لڑائیون کے موقعون پر بھی اس ایک علم سے زیادہ علم میدانِ جنگ مین نہین لیجا سکتے تھے،

اسی طرح سلاجقہ کے یہان ابتداً صرف ایک بہت بڑا علم رہتا تھا، جس کے سرے پر بالون کا گندھا ہوا ایک بڑا گچھا ہوتا تھا، یہ علم خاص سلطانی نشان سمجھا جاتا تھا، اور "شاش" کہا جاتا تھا، اور چھوٹے چھوٹے علم بھی ہوتے تھے، "وہ سنجق" کہے جاتے تھے، (مقدمہ ابن خلدون ص ۲۸۴، ۲۸۵)

فاطمیین کا علم جیسا کہ ابن خلدون کے بیان مین اوپر گذرا، سفید رنگ کا ہوتا تھا، ان کے جھنڈون مین دوسب سے اونچے ہوتے تھے، وہ "لواے احمد" کہے جاتے تھے، یہ دونون دو لمبے نیزون مین ہوتے تھے، جو انی نوکون تک سونے کے خول مین ڈھکے ہوئے تھے، ان دونون کے اوپر سفید حریر کی دو جھنڈیان جن پر سونے کے بوٹے کڑھے ہوئے تھے، ہوتی تھیں، یہ جھنڈیان ان نیزون مین لپٹی رہتی تھین، جلوس مین یہ دونون علم دو ممتاز امیرون کے ہاتھوں میں ہوتے تھے، پھران دونوں علم سے دو بیست نیزے ہوتے تھے ان کے سرون پر ٹھوس سونے کے ہلال ہوتے تھے اوران مین سونے کے میں سُرخ اور زرد رنگ کے سات دیبا ہوتے تھے، پھران کے پیچھے پیچھے نازک نازک رنگین جھنڈیان بوٹے دار حریر کی ہوتی تھین جن پر آیتِ کریمۂ نصرٌ مِنَ اللّٰہِ وفتحٌ قریبٌ" کڑھی رہتی تھی، (صبح الاعشیٰ لقلقشندی ج ۳ ص ۴، ۴۷۳)

موحدین کے پرچم کی تصویر لیبان کی تمدن عرب کے اردو ترجمہ مین شائع ہوئی ہے، اس پرچم مین آیاتِ قرآنی سے نقش ونگار بنائے گئے ہین (تمدن عرب ص ۱۳۲)

اسی طرح بنو مرین کا علم سفید حریر کا ہوتا تھا، جس پر دائرہ کی شکل مین سُنہرے حروف مین آیات نقش کیجاتی تھین، (ر ج ۵ ص ۲۰۶)

طبل و دیگر لوازم شاہی میں موسیقی کے آلات، نقارہ، قرنا، شہنائی وغیرہ کا رواج عہد رسالت و خلافت راشدہ میں نہ تھا، ابن خلدون نے یہ صحیح لکھا ہے کہ اہل حق کے لئے اس دور میں ان لوازم کی حاجت نہ تھی، کہ وہ ان کی رو سے میدان جنگ میں کامیابی حاصل کریں، جب خلافت بادشاہت میں منتقل ہوگئی، تو دیگر لوازم کے ساتھ رفتہ رفتہ یہ چیزیں بھی مسلمانوں کے تمدن میں داخل ہوگئیں، اور سلاطین کے مختلف خانوادوں میں یہ چیزیں استعمال کی گئیں، موحدین نے جس طرح علم پر پابندی عائد کی تھی، طبل و نقارہ پر بھی پابندیاں عائد کر دی تھیں، پھر امراء کو جب ایک علم استعمال کرنے کی اجازت دیگئی تو طبل و مجیرے کے استعمال کی ممانعت اٹھالی گئی، پھر وہ لڑائیوں اور جلوسوں میں کثرت سے استعمال کئے جانے لگے، (مقدمہ ابن خلدون ۲۰۴-۲۰۵)

مختلف خانوادوں میں طبل و نقارہ کس قسم کے تھے، اور کیا خصوصیات تھے، قلقشندی نے ان کو جا بجا لکھا ہے، اسی طرح چند دیگر لوازم تھے، مثلاً فاطمیین کے یہاں ایک **عصائے شاہی** تھا، یہ ڈیڑھ بالشت کا ایک دستہ تھا، اس پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا، اور موتیوں اور جواہرات سے مرصع تھا، اسی طرح مرصع تلوار، دوات، نیزہ، گھوڑے کی اطلسی زین اور قیمتی جواہرات یاقوت وغیرہ سے مرصع طلائی زیورات وغیرہ سے آراستہ و پیراستہ رہواروں سے شاہی جلوس کی زینت بڑھائی جاتی تھی، اسی طرح سلطانی سراپردہ وخیمہ وخرگاہ وغیرہ تھے، قلقشندی اور مقریزی وغیرہ نے ان لوازم شاہی کی تفصیلات کے ساتھ سلاطین کی تخت نشینی اور شاہی موکب و جلوس کے مختلف مراسم جزئی تفصیلات کے ساتھ بیان کئے ہیں، اگر ان امور کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو براہ کرم اصل ماخذ کی طرف رجوع کریں، (صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۴۷۲، ۳، ۴، ج ۴ ص ۷، ۹، خط مقریزی ج ۳ ص ۳۰۴، ۳۴۴، ۳۴۳ وغیرہ)

افسوس ہے کہ غزنوی عہد کے متعلق بہ تخصیص معلومات ہمارے پیش نظر ماخذ میں دستیاب نہ ہو[ئے] اگر ان معلومات کے لئے غزنوی عہد کی پوری تاریخ بالاستیعاب دیکھی جائے، اور موقع بہ موقع سے معلومات کے جمع کرنے، تو ... فراہم ہو سکتے ہیں، غزنویوں سے متعلق کوئی ایسا ماخذ ہمارے سامنے موجود نہیں، جس میں

یہ احوال جداگانہ طور پر قلمبند کئے گئے ہون،

ہندوستان کے عہدِ تغلق پر تفصیلی معلومات قلقشندی نے صبح الاعشیٰ مین لکھے ہین، جوایک مقالہ کی صورت مین ہندوستان آٹھوین صدی ہجری مین کے عنوان سے ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء کے معارف مین راقم سطور کے قلم سے مرتب ہوکر شائع ہوچکا ہے، اس مقالہ کے مطالعہ سے اس عہد مین ہندوستان کے شاہی لوازم کا اجمالی علم حاصل ہوتا ہے، مثلاً دربار عام کے سلسلہ مین مذکور ہے :-

سلطان ہفتہ مین ہر سہ شنبہ کو دربار عام منعقد کرتا ہے، اس دربار کے لئے ایک بہت بڑا وسیع ایوان مخصوص ہے، جو ہر قسم کے تکلفات سے آراستہ و پیراستہ رہتا ہے، صدر مین ایک نہایت بلند مرصع تخت زرنگار بچھا ہوتا ہے، سلطان اسی پر جلوس کرتا ہے، دائین بائین، ارباب حکومت ایستادہ رہتے ہین، پشت پر ہتھیار بند اسلحہ دار اور سامنے ارباب وظائف واہلِ مناصب حسب حثیت و مرتبت کھڑے رہتے ہین، سلطان خود سات دروازون کے اندر بیٹھتا ہے، باریاب ہونے والون کو پہلے ہی دروازہ پر سواریون سے اتر جانا پڑتا ہے،.....

پہلے دروازہ پر بوق وطبل کا اہتمام ہوتا ہے، جب معزز عہدہ دار حاضر بارگاہ ہوتے ہین، تو ان کی شان امتیاز کے لئے وہ بجائے جاتے ہین، شاہی جلوس بڑے تزک واحتشام سے نکلتا ہے، ایک شخص گھوڑے پر سوار تاج شاہی پر چتر لگائے رہتا ہے، سلاح دار زرق برق لباس مین ملبوس اپنے چمکیلے ہتھیار سنبھالے ہوے سواری کے پیچھے رہتے ہین، دائین بائین تقریباً ۱۲ ہزار خدام پا پیادہ رہتے ہین، سواری کے آگے طبل بجتا ہے، طبل ... ۴۰ کوس، ۲۰۰ بوق اور ۱۰ اچنگ ہوتے ہین، سلطان کے ساتھ دوسرے اعیانِ حکومت جھنڈون کے ساتھ ہمرکاب ہوتے ہین، بعض خوانین کو سات سات جھنڈے رکھنے کی اجازت ... حکومت کے چند دیگر امتیازات خصوصی بھی ہوتے ہین، مثلاً خوانین عام طور پر دس کوتل ... رکھ سکتے ہین، امرا کو صرف ۳ کوتل گھوڑون کی اجازت ہوتی ہے، حالتِ جنگ مین سلطان ... ت، جن مین سے دو خصوصیت کے ساتھ نہایت مرصع مطلا اور مذہب ہوتے ہین،

ہندوستان کے عہدِ مغلیہ کے شاہی لوازم کو ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں کم وبیش شکوہ سلطنت کے زیرِ عنوان یکجا کر دیا ہے، آپ اس کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، چنانچہ اورنگ سلطنت سونے اور چاندی مرصع تخت تھا، ہندوستان کا تخت طاؤس شہرتِ عام رکھتا ہے، اردو میں تختِ طاؤس کے نام سے ایک مستقل اب بھی لکھی جا چکی ہے، چتر بے شمار قیمتی جواہرات سے مرصع تھا، ابوالفضل لکھتا ہے کہ چتر میں کم سے کم سات جواہرات موجود ہونا ضروری تھا، آفتاب گیر کے نام سے جواہرات سے پورا مرصع زربفت کا شامیانہ تھا، جو دھوپ کے وقت سر پر راہ میں سایہ افگن رہتا تھا، علم کی کئی قسمیں تھیں، علم، چتر، توق، تمن توق وغیرہ یہ مختلف امتیازوں کے ساتھ بلند کئے جاتے تھے، چتر توق کا علم تبت کے باز کی دم سے بنایا جاتا تھا،

طبل میں نقارہ، دہل، قرنا، سرنا، نفیر سنج، اور سنگ وغیرہ تھے، جو مختلف موقعوں اور ترتیبوں کے ساتھ بجائے جاتے تھے، (آئینِ اکبری) " م "

روایاتِ معراج

جناب مولوی سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی محترم دام بقاءٗ

جامع مسجد اورنگ آباد ضلع گیا السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ واقعۂ معراج میں حضرت مالک بن صعصعہ رض کی روایت میں سدرۃ المنتہیٰ سے بیت المعمور کو روانہ ہوتے وقت صاحبِ معراج علیہ السلام کے حضور میں شراب (خمر) دودھ، شہد کا ایک ایک ظرف پیش کیا جانا اور آنحضورؐ کا دودھ کے ظرف کو اٹھا لینا اور حضرت جبرئیلؑ کا فرمانا کہ یہی فطرت ہے، جس پر آپ اور آپ کی امت ہے، اور حضرت انسؓ کی روایت میں بعد فراغت نماز مسجد اقصیٰ سے نکلنے اور آسمان کی طرف روانہ ہونے کے وقت شراب اور دودھ کا ایک ایک ظرف حضورِ اقدسؐ میں حضرت جبرئیلؑ کا پیش کرنا اور دودھ کا ظرف لے لینا اور حضرت جبرئیلؑ کا فرمانا کہ آپ نے فطرت کو پسند کیا ہے،

امام المرسلین ہادیِ عالم سید اولادِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حضرت جبرئیلؑ کے ہاتھوں

خمر جیسی نجس اور حرام شے کے پیش کئے جانے کا منشاء صحیح کیا ہو سکتا ہے؟ اس واقعہ سے بعض احباب کے دل میں خلش پیدا ہوتی ہے، اس کا ازالہ ضروری ہے۔

۲۔ روایات معراج میں ہے کہ آسمان اوّل پر حضرت آدمؑ اور آسمانِ دوم پر حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور آسمان سوم پر حضرت یوسفؑ اور آسمان چہارم پر حضرت ادریسؑ، آسمان پنجم پر حضرت ہارونؑ آسمانِ ششم پر حضرت موسیٰؑ، آسمان ہفتم پر حضرت ابراہیمؑ سے اور صاحب معراجؐ سے ملاقاتیں ہوئیں انبیاے نامیدہ کا تقرر باین ترتیب کیا منشا ہے،

اور پھر انہی حضرات کرام کا تقرر کیوں ہوا، حالانکہ ان کے علاوہ اولوالعزم جلیل القدر صاحب کتاب اور پیغمبران بھی مذکور ہیں،

۳۔ انبیاے مذکورین کا تقرر اپنی اپنی منزلوں پر بغرض افادہ تھا یا استفادہ؟ اگر افادہ کی غرض سے تھا، تو کیا وہ غرض دیگر انبیاء سے پوری ہو سکتی تھی یا نہیں؟ اور نیز مفید کا مستفید سے افضل و اکمل ہونا ضرور ہے یا نہیں، اگر ضرور ہے تو مستفید کی افضلیت واکملیت خود واقعہ معراج اور مسجد اقصیٰ میں امامت انبیاے مرسلین سے دیگر صفات و حیثیات سے ثابت ہے، نظر بران کسی صاحب کا یہ کہنا کہ انبیاے مذکورین کا تقرر بغرض افادہ تھا، اور ملاقاتیں بغرض استفادہ تھیں، کہانتک صحیح ہے؟

معارف:۔ دودھ فطرت صالحہ اور شراب فطرت فاسدہ کی جس کا دوسرا نام ضلالت ہے تمثیل ہے، حضرت انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دونوں چیزیں پیش کی گئیں، حضرتؐ نے اپنے اختیار سے دودھ کو جو فطرت صالحہ تھی، قبول فرمایا، اور فطرت فاسدہ کو رد فرمایا، حضرت صلعم کی تمثیل ذاتی میں امت کا وجود پنہان تھا، آپ نے اپنی امت کی طرف سے فطرتِ صالحہ کو پسند فرمایا، جس کا دوسرا نام اسلام ہے۔ فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا،

۲۔ دوسرے سوال کا پہلا جزیہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام باین ترتیب کیون ہوئے تو ظاہر ہے کہ اس ترتیب مین ابتدار و انتہار و اوسط کی مناسبت ہے، حضرت آدم پدر اوّل، اور حضرت ابراہیم پدر آخرین اور بیچ کے انبیاء علیہم السلام اخوان ہین،

سوال کا دوسرا جز یہ ہے کہ انہی کا انتخاب کیون ہوا، جواب یہ ہے کہ اوس فطرتی مناسبت کی بناپر ہوا، جو ان انبیاے کرام علیہم السلام مین فرداً فرداً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مین مجمعاً تھی،

۳۔ یہ نہ افادةً تھا، نہ استفادةً بلکہ اکراماً للضیف اور استیناساً للمتناسبین تھا،

وَاللّٰہ اعلم وعلمہ اتم،

"س"

تابعینؒ

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد انہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویسؒ قرنی، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحولؒ شامی، قاضی شریحؒ وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور علمی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ: شاہ معین الدین احمد ندوی،

ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت :- للعہ

منیجر

وفیات

آہ! شمس العلما مولانا محمد حفیظ اللہ سابق مدرس اعلیٰ دار العلوم ندوہ

حضرت مولانا ابو الحسنات عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی کی آخری یادگار مٹ گئی یعنی اُن کے آخری شاگرد رشید مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب جو ان کی مجلسِ درس کی اکیلی یادگار رہ گئے تھے ۱۳۶۲ھ کے خاتمہ ماہ مین وفات پاگئے،

مرحوم ۱۸۵۶ء کے آخر مین ضلع اعظم گڈھ کے چھوٹے سے گاؤں بندی میں پیدا ہوئے تھے، غدر ۱۸۵۷ء میں وہ ۶ ماہ کے تھے اور اسی قدر وہ مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ سے بڑے تھے ابتدائی کتابین گھر پر پڑھکر وہ اپنے عزیز مولانا سلامت اللہ صاحب جیراجپوری (والد حافظ اسلم صاحب جیراجپوری) کے ہمراہ بنارس تعلیم کیلئے گئے وہان سے واپس آکر مدرسۂ چشمۂ رحمت غازیپور میں پڑھنے کیلئے گئے اور وہان فارسی کی اونچی کتابیں پڑھین اس زمانہ میں غازیپور میں حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی کے شاگرد رشید مولانا غلام جیلانی صاحب تھے ان سے باصرار عربی کتابیں شروع کین چند سال مین اُن سے متوسطات تک پڑھکر انہی کے مشورہ سے فرنگی محل لکھنؤ مین مولانا ابو الحسنات عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی کی مجلسِ درس میں حاضر ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب دارو غہ حید بخش کی مسجد جو چوک میں عربی اور طب پڑھنے والونکا گویا دار الاقامہ تھا، نئی بنکر تیار ہوئی تھی چنانچہ حضرت مولانا عبد الحیٔ صاحب کی سفارش سے انکو اس کے حجرہ میں رہنے کی جگہ ملی اور یہان کئی سال رہکر معقولات اور دینیات کی تعلیم حاصل کی، فراغت کے بعد جو غالبًا ۱۸۸۰ء میں ہوئی ہو گی، وہ کاکوری ضلع لکھنو کے ایک مقامی مدرسہ مین مدرس مقرر ہوئے یہی سلسلہ ہے جس سے وہ جناب منشی محمد احتشام علی مرحوم رئیس کاکوری سے ملے، اور ایسے ملے کہ پھر ان کے دل الگ نہ ہوئے، اگلے زمانہ میں دوستون کی وضعداریان آج عجیب معلوم ہوتی ہین، چند ہی سال کے بعد ریاست رامپور کے مشہور مدرسۂ عالیہ میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب رامپور اہلِ کمال کا مرکز تھا، مولانا عبد الحق خیر آبادی کا وہان طوطی بول رہا تھا، اس عہد مین ان کا وہان جانا،

اور اہل علم کی نگاہوں میں وقار پیدا کرنا معمولی کارنامہ نہیں، دونوں میں نواب صاحب کے سامنے ایک دفعہ کسی فلسفیانہ مسئلہ پر مناظرہ بھی ہوا،

مولانا مرحوم کو زیادہ تر شوق معقولات ہی کا تھا، قدیم فلسفہ و منطق میں بڑی دسترس حاصل کی تھی، ساتھ ہی ریاضیات میں کمال پیدا کیا تھا، چنانچہ رامپور کے زمانہ قیام میں تصریح پر ۱۳۱۲ھ میں حاشیہ لکھا جو عام طور سے شائع ہے،

رامپور کے زمانۂ قیام میں جنرل عظیم الدین مرحوم کا عہد دیکھا تھا ان کے شجاعانہ کارنامے وہ خوب خوب بیان کرتے تھے، یہ تو رزم تھی، بزم میں جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے شاعرانہ کمالات اور بعض مشاعروں کے حالات بڑی دلچسپی سے سناتے تھے، آداب مجلس سے خوب واقف تھے، اور بڑی مزہ دار باتیں کرتے تھے، لطائف وظرائف کی بھی کمی نہ تھی، سیر و شکار کا بھی شوق تھا، بڑے قادر انداز تھے،

رامپور سے وہ لکھنؤ آئے اور دار العلوم ندوہ کے افتتاح کے وقت ۱۳۱۶ھ میں وہ اس کے مہتمم اور مدرس اول مقرر ہوئے جس پر وہ ۱۹۰۸ء تک فائز رہے، ہیچمدان نے اسی زمانہ میں اُن سے مدرسہ دار العلوم میں معقولات و منقولات کی کتابیں پڑھیں، مولانا شبلی مرحوم کے وہ معاصر تھے، اسلئے جب صحبت ہوتی تو دونوں میں خوب نوک جھونک ہوتی، گفتگو کا موضوع کوئی فلسفہ کا مسئلہ یا عقل و نقل کی تطبیق کی معرکہ آرائی ہوتی،

دار العلوم سے وہ ۱۹۰۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں گئے ۱۹۲۰ء میں وہاں سے پنشن یاب ہوئے اسی سال وہ حج کو گئے اور وہاں سے واپس آکر لوگوں کے اصرار سے دوبارہ ندوہ کی صدر مدرسی قبول کی اور کئی سال تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۳۰ء میں ندوہ سے الگ ہو کر وطن واپس آگئے تھے، اور یہیں ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ کو وفات پائی،

مولنا عبد الحی مرحوم کی شاگردی کی باوجود مرحوم آخر میں عامل بالحدیث ہو گئے تھے، عدم تقلید کا میلان پہلے سے رکھتے تھے، جو شاید مولوی سلامت اللہ صاحب کی ابتدائی صحبت کا اثر رہا ہو، انکی تصانیف میں تصریح الافلاک کا حاشیہ کلم یادگار ہے، ۱۸۵۶ء کے آخر میں پیدا ہوئے تھے، اس حساب سے وفات کے وقت انکی عمر تقریبًا بتاسی اٹھاسی سال کی تھی لیکن دو سال پہلے انکی صحت و توانائی قابل رشک تھی، اور ان کے جسمانی قوی نہایت اچھے تھے، ادھر چند برسوں سے البتہ ضعف و اضمحلال کا اثر نمایاں اور آخری زمانہ میں ذہول و نسیان کا غلبہ زیادہ ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے،

ادبیات

غزل

از جناب نجم احسن صاحب ایڈوکیٹ پرتاب گڈھ اودھ

موت ہی اُس کے لئے زیست کا سامان ہو جائے آدمی عشق میں مٹ جائے تو انسان ہو جائے
حُسنِ صورت ہو بشر میں تو گلستان ہو جائے حُسنِ معنی میں ترقی ہو تو انسان ہو جائے
عشق میں حُسن کی ہر آن نمایان ہو جائے عشقِ جاناں ہی اگر جلوۂ جانان ہو جائے
یا تو محبوب ہی یہ عالمِ امکان ہو جائے ورنہ جو کچھ ہے سبھی جلوۂ جانان ہو جائے
حُسن ہو جائے مرا عشق جو پنہان ہو جائے عشق ہو جائے ترا حُسن جو حیران ہو جائے
مرحلہ دید کا مشکل ہو کہ آسان ہو جائے چشمِ پُر شوق کو لازم ہو کہ حیران ہو جائے
ذوق آرا کبھی ہو جائے جو رنگینیٔ درد کچھ تو مخموریِ احساس کا سامان ہو جائے
یا خدا جس کو محبت نے کیا ہے برباد اُس ستم گر کی محبت مرا ایمان ہو جائے
تب اُسے آئین گے کچھ بادۂ رنگین کے مزے شیخ ظالم جو کبھی صاحبِ عرفان ہو جائے
بے تامل ترے قدموں پہ فدا ہوتا ہوں عشق کا فرض یہ ہے حُسن پہ قربان ہو جائے
کم سے کم دردِ محبت نے نوازا تو مجھے یا خدا ہر رگِ تن اب تو رگِ جان ہو جائے
جان لیں کچھ جو ملک منزلِ عصیان کے رموز شہپرِ ہر ملک آلودۂ عصیان ہو جائے
نازِ قاتل تو نمک ریز نمک پاش بھی ہو زخمِ دل کیون مرا محتاج نمکدان ہو جائے

غیرتِ حُسن کا حق یون ہی ادا ہوتا ہی
کیا کرے دیکھنے والا جو نہ حیران ہو جائے

ہر فرشتہ اُسی منزل پہ کرے آکے قیام
جو اُسے معرفتِ منزلِ عصیان ہو جائے

آگ ہو جاتی ہے گلزار پئے اہلِ وفا
کیون جہنّم بھی نہ اب گلشنِ رضوان ہو جائے

کچھ تو احسؔن کو محبت مین مزے آنے لگین
میرے اللہ یہ کافر بھی مسلمان ہو جائے

بدمستی

ازجناب ثاقب گورکھپوری

گُلابیان اُتارنے کہ کام ہے مدام سے
شفق کے سُرخ طاق سے فلک کے سبز جام سے

فلک کی مے سے کام ہو زمین کی مے سے کیا غرض
اسی قدر ہے فاصلہ حلال کو حرام سے

عنب کی تاک مین ہو کیا بجز قطارِ آبلہ
انہین کا آب مشتہر ہے سب مین مے کے نام سے

وہ شمعِ عقل آندھیون سے جو کبھی بجھی نہین
خموش ہو کے رہ گئی ہے اس کے ایک جام سے

بدی ہے مے کی واقعی بنائے سے بنی نہین
نہ میرے اجتناب سے نہ تیرے احترام سے

سبو سے انبساط کیون یہی کہ تنگ ظرف ہے
خُمون کا اشتیاق کیون فقط خیالِ خام سے

ملا رہے ہین ناشناس ساغرِ شراب کو
کبھی تو آفتاب سے کبھی مہِ تمام سے

اسی نجس شراب کا تو نام آفتاب ہے
مآل مین سیاہ ہے جو زلفِ مشک فام سے

یہ جس گلے مین آگئی اُسی کا دم گھٹا کیا
صراحیون کی ہچکیون کو پوچھ گوشِ جام سے

یہ مے کشون کی آرزو ہے ایک خونِ آرزو
لہو ٹپک رہا ہے اس کے رنگِ لالہ فام سے

قدم قدم پہ ایک حشر اور پھر جزا نہیں
یہ میتین وہی ہین جو اُٹھین نہ احترام سے

اسی خرامِ ناز کا خمار ایک نام ہے
نہ چل وہ راستہ جہان خمار ہو خرام سے

جسے شراب کہتے ہیں یہی تو شرِ آب ہے
نہ کام سے یہ کام ہے بچا زبان کو نام سے

وہ میکدہ فلک کا ہی جو طاہر و طہور ہے
جہاں میں صبح ہوتی ہے اُسی کے ایک جام سے

مخربِ دماغ ہے سُرورِ بادہ وکیف سے
حواس بھاگتے ہیں مسکراتِ زشت کام سے

منشیات بالعموم لائقِ نفور ہیں
یہ مستفاد مجملاً ہے رشحۂ کلام سے

سوزِ دروں

از

جناب اسد ملتانی

ابھی تک تو نہیں دینے لگا سوزِ دروں میرا
بس اتنا ہے کہ اکثر کھولنے لگتا ہے خُوں میرا

نہیں ہیں بے خبر احباب میرے زخم پنہاں سے
کہ غمازِ دلِ پرخوں ہے اشکِ لالہ گوں میرا

جو ہنگامے سے مقصد ہو فقط ہنگامہ آرائی
تو ان بے کار ہنگاموں سے بہتر ہے سکوں میرا

تلاشِ خضر کو سنگِ رہِ منزل سمجھتا ہوں
وفورِ شوق ہے دستِ طلب میں رہنموں میرا

میں کاخ وکو میں کر سکتا ہوں شورہا و ہو برپا
نہیں ہے پائے بندِ وسعتِ صحرا جنوں میرا

زمانے کی نظر کو دیکھکر حیران رہتا ہوں
اُسی پر داد ملتی ہے جو ہو صید زبوں میرا

وہی مومن ہے جس کو دیکھکر باطل پکار اُٹھے
کہ اس مردِ خدا پر چل نہیں سکتا فسوں میرا

اسدؔ ذوقِ سلیم و چشمِ روشن کی علامت ہے
نئی تہذیب کی محفل میں جامِ واژگوں میرا

باب التقریظ والانتقاد

انگریزی ترجمۂ قرآن مجید مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی، اعظم گڈھ

اس زمانہ مین جب مسلمان نوجوانون کے اندر براہ راست صحیفۂ اسلام کے ذریعہ سے اسلام کے مطالعہ کا روز افزون ہے، اس بات کی سخت ضرورت تھی، کہ قرآن پاک کا کوئی ایسا ترجمہ ان کے ہاتھون مین ہوتا بعیدہ اور زمانہ کے تغیرات کے مطابق رنگ آمیزی سے بالکل پاک ہو اور قرآن پاک کو بعینہٖ اسی رنگ اور ا مین پیش کرے جس مین وہ صدر اول مین سمجھا جاتا تھا،

انگریزی مین اس وقت تک دو قسم کے ترجمے ہین یا تو وہ عیسائیون کے کئے ہوئے ہین جن کے متعا راے کی ضرورت نہین، یا بعض ایسے لوگون کے قلم سے نکلے ہین جن کے عقائد و افکار سے جمہور اسلام کو موافقت مسٹر عبد اللہ یوسف علی کا ترجمہ جو ابھی حال مین شائع ہوا ہے، بے شبہہ بہت حد تک ان مفاسد سے لیکن اعلیٰ انشا پردازی کے تخیل نے مترجم کو اس بات پر مجبور کیا ہے، کہ قرآنی الفاظ کی پابندی کے بجا مطلب پر قناعت کرے، اسی طرح مسٹر محمد پکتھال کا ترجمہ بھی اول تو اغلاط سے پاک نہین ثانیاً اس مین نقص ہے، ان حالات کی موجودگی مین ایک ایسے ترجمہ کی حاجت تھی، جو کسی صحیح الخیال اور پابند دین قلم سے نکلا ہو، اور جمہور اسلام کے معتقدات کے مطابق ہو، لفظون کے حدود سے باہر نہ ہو، اور جس کے

موجودہ زمانہ کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو اور جس کی زبان بھی صاف ستھری اور عام پسند ہو،

جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی بی اے، جن کو ہم مدت تک فلسفی کی حیثیت سے جانتے رہے، اور جن کی اردو تصنیفات ادب اور دانش کا مجموعہ ہیں، جب سے ان کے مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا ہوا، اور وہ فلسفی سے صوفی بنے، ان کے قلمی فیوض سے اپنے کو محروم سمجھ رہے تھے، لیکن چند سال کی خاموشی کے بعد اُن کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہمارے سامنے آیا اور یہ قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ ہے، جس کی تیاری میں وہ کئی سال سے مصروف تھے، اور جس کو وہ تکمیل تک پہنچا سکے، اور اب ایک ایک پارہ کرکے تاج کمپنی لاہور کے ذریعہ سے شائع ہو رہا ہے، اور اس وقت اس کا پہلا حصہ جو پارۂ اوّل (الٓمٓ) پر مشتمل ہے، ہمارے سامنے ہے، اس ترجمہ کو دیکھ کر ہم کو بڑی خوشی ہوئی، کہ مولانا نے وقت کا ایک اہم کام کیا اور مسلمان نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہدایت کا ایک چراغ دیدیا، اس ایک پارے کو دیکھکر اس ترجمہ کی حسب ذیل خصوصیات نظر آئیں،

(۱) زبان صاف ستھری صحیح اور فصیح ہی، لیکن نہ بہت اونچی ہے اور نہ بہت نیچی ہے، اور اس بنا پر اس سے معمولی انگریزی دان بھی اسی طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں جس طرح اعلیٰ انگریزی کے تعلیم یافتہ،

(۲) مترجم نے ترجمہ میں مقدس بائبل کی زبان اور محاورات کی پابندی کی ہے، گو موجودہ زمانہ کے بعض کم فہموں کو یہ بات قابلِ اعتراض نظر آئے گی، لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے، کہ مقدس اور آسمانی کتابوں کی زبان اور طرزِ ادا عام ادبی کتابوں کی زبان سے قطعاً الگ ہونی چاہئے، تاکہ پڑھنے والے پر یہ اثر پڑے، کہ وہ عام ادبی کتابوں سے بالاتر ایک صحیفۂ ربانی کو پڑھ رہا ہے، جس کا تقدس اور جس کی عظمت زبان اور طرزِ بیان میں بھی اپنی انفرادیت کی شان لئے ہوئے ہو،

(۳) ترجمہ کی لفظی خصوصیت صرف اہلِ نظر کو نظر آئیگی، جس قدر زیادہ باریک بینی سے غور کیا جائے گا مترجم کی تلاش اور عربی لفظ کے بالمقابل اس کے صحیح انگریزی مفہوم ادا کرنے کی کوشش جھلکتی ہوئی نظر آئیگی، اگر انگریزی کا کوئی لفظ عربی کے بالمقابل ہم معنی ان کو نظر نہیں آیا ہے، تو عام انگریزی لفظ دیکر حاشیہ میں

ں کی تشریح مناسب کر دی ہے، مثلاً رب کا ترجمہ انگریزی میں عام طور سے Lord یا Sovereign سے
کیا جاتا ہے، مگر اس لفظ کے معنی میں جو حقیقت ہے، ان دو لفظوں میں سے کسی ایک سے بھی ظاہر نہیں ہوتی، ہمارے
مترجم نے اس کمی کو اپنے حاشیہ سے پورا کیا ہے،

(۴) اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے، کہ انگریزی انشا پردازی کی خاطر عربی لفظ کے صحیح معنی کو انگریزی
لفظوں میں بگاڑا نہ جائے یعنی قرآن پاک کے مفہوم کو اپنی مفروضہ بلاغت اور فصاحت کے لئے برباد نہ کیا جائے

(۵) جمہور اسلام کے صحیح عقائد اور خیالات کی خلاف ورزی نہ کی جائے، اور موجودہ زمانہ کی
عقلیت پسندی اور خلافِ محاورہ منطقیانہ معنی آفرینی اور معجزات اور خوارق کو خلاف فطرت نہ ثابت کئے
جانے کی خاطر سید احمد خان مرحوم سے لے کر مولوی محمد علی لاہوری تک جو کوششیں کی گئی ہیں، ان سے
قطعاً پرہیز کیا جائے،

(۶) ان مسائل اور واقعات کے بیان میں ان عقل پسند مترجموں نے اپنے زعم میں قرآن پاک کو
صحیح ثابت کرنے کے لئے جو غلط طریقے اختیار کئے تھے، اُن سے پرہیز کیا جائے،

(۷) عام طور سے اردو اور انگریزی مترجموں نے یہ کیا ہے، کہ مضمون کی وضاحت کے لئے نفس ترجمہ ہی
میں بریکٹ کے ساتھ یا بریکٹ کے بغیر الفاظ بڑھائے ہیں، موصوف نے اس میں بڑی احتیاط برتی ہے، ایسے موقع
پر انھوں نے لفظ پر حاشیہ دیکر زائد تشریح درج کر دی ہے، تاکہ آیت کے صحیح معنوں میں انسانی اضافوں کا
اختلاط نہ ہونے پائے،

(۸) حاشیوں کے لکھنے میں موصوف نے بڑی خدمت انجام دی ہے، گویا یہ کہنا چاہئے کہ ان کے ذریعہ
سے ایک نیا علم کلام مسلمانوں کے ہاتھوں آگیا ہے،

(۹) ان حاشیوں میں بعض ایسی تحقیقات ہیں، کہ جن سے عام طور پر پرانے ترجمے خالی ہیں، اور یہ وہ کوششیں
ہیں کہ جو انھوں نے آیتوں کے گرامر، تاریخ، جغرافیہ اور تورات وانجیل کے بالمقابل موازنوں میں صرف کی ہیں

(۱۰) سب سے بڑھکر یہ کہ یہودی اور عیسائی تصنیفات مین قرآنی تائیدات کی جو تحقیقین ملی ہین، ان کو آیتون کے ساتھ موقع بموقع نقل کرتے گئے ہین، اور جدید مستند انگریزی لٹریچر مین بھی جو باتین ان کو قرآن کے لئے مفید نظر آئی ہین ان کو بھی اپنے موقع پر جگہ دی ہے،

(۱۱) عہد قدیم اور عہد جدید کے حوالون مین اونھون نے اصل کتابون کے حوالون کو محنت اور کوشش سے تلاش کرکے ان کے باب اور آیت کے نمبر آسانی کے لئے دیدیئے ہین،

(۱۲) سب سے آخری چیز یہ ہے کہ ہمارے انگریزی خوان اصحاب عربی دانی کے کسی درجہ پر ہون، اس تحقیق، تقوی اور احتیاط سے عام طور سے یقیناً خالی ہین جو علماے محققین اور صالحین کی خصوصیت ہے، اس بنا پر یہ چیز اس ترجمہ اور اس کے تشریحی بیانات کی صحت کے لئے بڑی طمانیت بخش ہے، کہ یہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمۂ قرآن اور تفسیر البیان کو سامنے رکھکر کیا گیا ہے،

اس ترجمہ کی ناشر تاج کمپنی ریلوے روڈ لاہور کو بھی مبارکباد دینی چاہئے، کہ اس نے اس زمانہ مین جبکہ کاغذ اور سامان طباعت کی گرانی بلکہ نایابی کا یہ عالم ہے، اس انگریزی ترجمہ کی اشاعت کی ہمت کی ہے، کاغذ اچھا، ٹائپ عمدہ اور نیا ہے، اور عربی عبارت کو بھی بلاک کے خوبصورت خط مین شائع کیا گیا ہے، صفحہ کے اوپر اصل مین ترجمہ اور نیچے کسی قدر باریک ٹائپ مین حواشی ہین، ۱۲ر فی پارہ اس کی قیمت رکھی گئی ہے، ضرورت ہے کہ انگریزی دان مسلمان اس کی خریداری کی طرف توجہ کرین اور اس کا ایک ایک نسخہ منگا کر مطالعہ کرین،

المنہاج

از جی، ام، ڈی، صوفی، ام، اے ہال، پی (الہ آباد) ڈی، لٹ، (پیرس) تقطیع اوسط، صفحہ ۱۳۰، لکھائی، چھپائی عمدہ، ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور، قیمت للعہ

مصنفۂ بالا کتاب ہندوستان کی اسلامی درسگاہون کے تعلیمی نصاب کے ارتقا کی گویا تاریخ ہے جس کو

مؤلف نے ۱۹۳۵ء میں پیرس یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے مقالہ کی حیثیت سے پیش کیا تھا، اور اس پر اُن کو ڈگری بھی ملی تھی، دراصل یہ مقالہ فرانسیسی زبان میں لکھا گیا تھا، ہندوستان کے ارباب علم کے استفادہ کے لئے مؤلف نے اس کا انگریزی ترجمہ کر دیا ہے، جس کو شیخ محمد اشرف ناشر لاہور نے اپنی اور مطبوعات کی طرح اعلیٰ طباعت کیساتھ شائع کیا ہے،

کتاب میں تمہید اور مقالہ کے علاوہ چار ابواب ہیں (۱) ترکوں اور افغانوں کے عہد میں نصاب تعلیم (۲) مغلوں کے عہد میں نصاب تعلیم (۳) برطانیہ کے عہد میں نصاب تعلیم (۴) آزاد ہندوستان کے نصاب تعلیم پر خیالات، آخر میں ماخذ کی فہرست اور اشاریہ ہے، ایک طویل ضمیمہ بھی ہے، جس میں کلکتہ اور بمبئی کے مختلف امتحانات کے مضامین کی تفصیل ہے،

یہ کتاب اس حیثیت سے مفید اور پُر از معلومات کہی جا سکتی ہے، کہ انگریزی زبان میں مسلمانوں کے گذشتہ اور موجودہ تعلیمی نصاب کے خاکے کو مرتب طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، جس سے مختلف دور کے نصاب کا تدریجی ارتقاء سامنے آجاتا ہے، مگر جب اس کے پہلے دو ابواب کے ماخذ پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو اس کے علمی وقار میں بڑی کمی پیدا ہو جاتی ہے، مؤلف نے ان دو ابواب کے مباحث میں صرف دو کتابوں این۔ این۔ لا کی تصنیف "پروموشن آف محمڈن لرننگ" اور مولانا ابو الحسنات صاحب ندوی مرحوم (رفیق دار المصنفین) کی کتاب "ہندوستان کی قدیم درسگاہیں" کو ماخذ بنایا ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں کتابیں اپنے معلومات کے لحاظ سے استفادہ کے لائق ہیں، مگر کسی تحقیقی مقالہ کی ترتیب میں صرف ان دونوں کتابوں کو ذریعۂ معلومات بنانا اس کے تحقیقی درجہ کو کم کر دینا ہے،

مولانا ابو الحسنات صاحب مرحوم نے اپنی کتاب کے خاتمہ پر تحریر کیا تھا، کہ "یہ اسلامی عہد حکومت میں ہندوستان کی اسلامی تعلیم اور تعلیم گاہوں کا مختصر سا خاکہ ہے، میں نے علی العموم اجمال و اختصار سے کام لیا ہے، مزید تفصیل و تشریح کی طرف توجہ کیجائے، تو پھر دفتر کا دفتر چاہیے، جس کے لئے نہ موقع ہے اور نہ وقت لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مزید توجہ کے بعد قطرہ دریا بن سکتا ہے" لیکن المنہاج کے مؤلف نے اس قطرہ کو دریا بنانے کے بجائے صرف "دس" سے پیاس بجھانے پر اکتفا کی، اگر کہیں کسی نئی بات کا اضافہ بھی کیا ہے تو تجدد پسندی اور

روشن خیالی کے جوش میں ان کے بیانات جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں، مثلاً نصاب موسیقی کے سلسلہ میں ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ موسیقی کی تعلیم کلام مجید، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صوفیائے کرام کی عین تعلیم کے مطابق ہے، (دیکھئے ۳۳-۳۴) جو سراسر غلط ہے ممکن ہے کہ مصنف کو موسیقی سے دلچسپی ہو، یا موجودہ تمدن و معاشرت کے زیر اثر اس فن کو تعلیم کا ضروری جزء سمجھتے ہوں، لیکن اس کے لئے انھیں مذہب کو آڑ بنانے کی کیا ضرورت ہے، اگر موسیقی سے مراد خوش گلوئی، خوش الحانی اور ترنم ہے تو اسکی البتہ اسلام نے ممانعت نہیں کی ہے لیکن محض اتنی سی بنیاد پر موسیقی یعنی گانے اور ساز وغیرہ کو جائز بتانا سراسر غلط ہے، مذہبی احکام کی غلط تعبیر سے خواہ وہ حسن نیت ہی سے کیوں نہ ہو، طرح طرح کے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں، اس قسم کے خطرات کو مد نظر رکھنا ایک محتاط مصنف اور مقالہ نگار کا اولین فرض ہونا چاہئے،

اسلامی دور حکومت کی صنعتی اور فوجی تعلیم پر بھی مباحث ہیں، مگر یہ بہت ہی سرسری اور تشنہ ہیں، تیموری عہد میں فوجی تعلیم کے متعلق مؤلف نے گویا صرف اس پر قناعت کی ہے، کہ "ابو الفضل کی لکھی ہوئی تفصیلات سے اس تعلیم کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے، جو فوجوں کی مختلف جماعتوں کو دیجاتی تھی"۔ اگر تھوڑی سی محنت اٹھا کر اس فوجی تعلیم کی تفصیل بھی درج کر دیجاتی تو کتاب کا معیار بلند ہو جاتا، حالانکہ اس سلسلہ میں تیموری بادشاہوں اور شاہزادوں کے سپاہیانہ اور بہادرانہ کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، مگر اس ذکر سے صرف ان کی ذاتی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے، اس عہد کے لشکریوں کی فوجی تعلیم کا خاکہ سامنے نہیں آتا، عجلت میں مؤلف نے ہندوستان کے بعض اہم مسلمان فرمانرداؤں کے عہد کے تعلیمی نصاب کا استقصا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا ہے، مثلاً اکبر کے دور کے فضلاء اور علما کا ذکر تو کیا ہے مگر اس زمانہ کے نصاب تعلیم کو نظر انداز کر کے اورنگزیب اور اسکے بعد کے تعلیمی نصاب کی فہرست پر بحث کی گئی ہے، حالانکہ آئین اکبری میں اکبری دور کے نصاب تعلیم کی تفصیل موجود ہے، اسی طرح تھوڑی سی توجہ سے فیروز شاہ کے عہد کا تعلیمی نصاب بھی معاصر تاریخوں سے مرتب کیا جا سکتا تھا اسلامی دور کی تعلیم نسواں پر بھی کافی معلومات فراہم ہو سکتے تھے اگر صرف مالوہ کے فرمانروا سلطان غیاث الدین ابن محمود خلجی کے عہد میں عورتوں کی تعلیم پر نظر ڈالی جاتی، سنین میں بھی کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں،

مگر عام اور سرسری مطالعہ کے لئے یہ کتاب مفید کہی جا سکتی ہے، طرز بیان صاف، رواں اور دلچسپ ہے، "م ع"

مطبوعات جدیدہ

محمد علی از مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۰۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر،

قیمت ع۲/، پتہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن،

مولانا محمد علی مرحوم کی وفات کے بعد مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے مرحوم پر اپنے اخبار سچ میں مضامین کا ایک سلسلہ لکھا تھا، مذکورۂ بالا کتاب میں ان مضامین کو مرتب طریقہ سے جمع کر دیا گیا ہے، مولانا محمد علی مرحوم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ان مضامین کی حیثیت اُن سے مختلف ہے، مولانا مرحوم اور فاضل مضمون نگار میں خاص ربط و اخلاص تھا، بعض کاموں میں وہ انکے شریک بھی رہے تھے، اسلئے انھیں مرحوم کی خلوت و جلوت یا پبلک اور پرائیوٹ زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور اس کا کوئی رُخ اُن کی نگاہ سے مخفی نہیں تھا، ان مضامین میں اسی کی عکاسی کی گئی ہے، اس کتاب میں ۱۹۱۲ء سے لیکر ۱۹۲۴ء تک صاحب سوانح کے جستہ جستہ اجمالی حالات ہیں، اور ۱۹۲۵ء سے آخر زندگی تک کے کسی قدر تفصیلی، یہ حالات ایک واقعہ نگار کے بیان کی طرح محض تاریخ کی کھتونی نہیں ہیں، بلکہ اس سے مولانا مرحوم کے ملکی و ملی خدمات کے ساتھ ان کے فضل و کمال، ذہانت و ذکاوت، عقائد و خیالات، جذبات و رجحانات، غیرت قومی، حمیت دینی، اخلاص و للہیت، حق گوئی و حق پرستی، مزاج و افتاد طبع، ان کے اخلاق و کردار کی پوری تصویر اور ان کی مجاہدانہ زندگی کی پوری روح سامنے آجاتی ہے، مرحوم کے گوناگوں اوصاف و کمالات کی اس سے زیادہ جامع مصوری ممکن نہ تھی، اس کو پڑھ کر مرحوم کے مرقع حیات کے تمام خط و خال نظر آجاتے ہیں، سیرت محمد علی کی تالیف کے سلسلہ میں مولانا سے جو سہو ہوا تھا، اس کتاب

اس کی تلافی ہوگئی، انداز تحریر کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، مولانا کی سحر طرازی نے خشک تاریخی واقعات کو دلآویز افسانہ بنا دیا ہے، اور اس کتاب کے متعلق یہ فقرہ بالکل صحیح معنون مین صادق آتا ہے، کہ جب تک ختم نہ ہوجائے ہاتھ سے نہین چھوٹتی، یہ ایک ایسے پُرشور دور کے حالات ہیں، جس مین بہت سے اختلافی مسائل پیش آئے، بعض مین خود مؤلف کی حیثیت بھی فریق کی تھی اس لئے ان مسائل کا زیر بحث آنا ناگزیر تھا تاہم ان کے رمز شناس قلم نے اظہار حق کے ساتھ سنبھالنے کی پوری کوشش کی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب مولانا محمد علی مرحوم کے قدر دانون اور فاضل مصنف کی تحریرون کے قدر شناسون مین مقبول ہوگی،

ابوالکلام آزاد، مرتبہ جناب عبداللہ بٹ صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۳۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عام، پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے متعلق مختلف جماعتون کے متعدد اکابر و ممتاز اشخاص اور بعض عام لوگون نے بھی تحریری شکل مین اپنے تاثرات ظاہر کئے ہین، اس کتاب کے لائق مرتب نے ان سب کو اس کتاب مین یکجا کر دیا ہے، اس سے مولانا کے کمالات کے متعلق مختلف اہل نظر کی رائین اور اس کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہین، اگر اس کتاب کو محض اکابر کے تاثرات تک محدود رکھا جاتا، تو اسکی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی، مولانا کی ذات ایسی جامع کمالات ہے، اور ان کے واقعی اور صحیح کمالات اتنے گوناگون ہین، کہ ان مین کسی فرید اضافے کی مطلق ضرورت نہین، پھر معلوم نہیں بعض مضمون نویس غیر صحیح واقعات لکھنے کی ضرورت کیون پیش آئی؟ انکے اس سے مولانا کی عظمت مین کوئی اضافہ نہیں ہوتا، مثلاً ایک مضمون مین ہے کہ آپ نے قاہرہ کی مشہور عالم یونیورسٹی الازہر مین تعلیم حاصل کی، اور ۱۴ سال کی عمر مین آپنے جامع ازہر میں علوم مشرقی کا نصاب پورا کیا، اور اس قدر استعداد پیدا کرلی، کہ آپ کو مختلف مضامین کے پڑھانے پر مامور کر دیا گیا" یا تذکرہ بیس سال کی عمر میں لکھا ایک دوسرے مضمون مین ہے کہ ۱۹۰۵ء میں آپ کو قاہرہ کی یونیورسٹی الازہر میں بھیجا گیا...... ۱۹۰۵ء مین آپ عراق و شام و فلسطین کی سیاحت کرکے ہندوستان واپس آئے ص (۳۰۲) اسی مضمون مین ہے کہ

مین آپ الندوہ کے اڈیٹر تھے، اور ۱۹۱۰ء مین وکیل کے اڈیٹر مقرر ہوئے حالانکہ مولانا نے اپنے مولد و منشاء طفولیت وادی غیر ذی زرع "یعنی مکہ معظمہ سے ہندوستان آنے کے بعد پھر یہان سے باہر قدم نہین نکالا، مضمون کا یہ تضاد بیان بھی دلچسپ ہے کہ ایک طرف تو مولانا کو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۰ء میں الندوہ اور وکیل کا اڈیٹر لکھا گیا ہے، اور اسی زمانہ مین ان کو الازہر مین بھی دکھایا گیا ہے، درحقیقت مولانا کی شخصیت اوران کا علم ازہر کی تعلیم سے بلند ہے کسی درسگاہ کی جانب ان کا تعلیمی انتساب ان کے لئے کوئی سندِ کمال نہیں ہے، ع

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبا را

تذکرہ انھون نے بیس سال کی عمر مین نہین بلکہ اس وقت لکھا جب قافلہ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا تھا" (تذکرہ ص ۲۰۹) تیس سال کی عمر مین بھی ایسی کتاب لکھنا بجائے خود کمال ہے، ان خفیف فروگذاشتون سے قطع نظر کتاب دلچسپ ہے،

ضرورۃ القرآن حصہ اول از جناب قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۶، صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عارٖ پتہ مصنف دارالاشاعت والتصنیف ڈاکخانہ شمس آباد ضلع اٹک پنجاب۔

اس کتاب کا مقصد دنیا کے لئے قرآن مجید کی ضرورت کا اثبات ہے، اس حصہ مین لائق مصنف نے انسانیت اور کائنات کے متعلق بعض اسلامی تعلیمات کو پیش کرکے ان کے لئے مذہب، انبیاء اور الہامی کتابون کی ضرورت دکھائی ہے، ان کی صداقت کا معیار بتایا ہے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کے دلائل دیئے ہین، اور دوسرے مذاہب کی الہامی اور غیر الہامی کتابون کے نقائص ظاہر کرکے ان کے مقابلہ مین کلام مجید کے کمالات دکھائے ہین، ان مباحث مین مصنف کو موضوع سے متعلق وغیر متعلق ضروری وغیر ضروری اور معتبر وغیر معتبر جس قسم کے معلومات مل سکے ہین ان کو بے کم وکاست نقل کر دیا ہے، بعض باتین نہ صرف غیر ضروری بلکہ ناقابلِ تحریر تھین، اس حصہ میں اتنی غیر ضروری بحثین آگئی ہین کہ اصل موضوع تشنہ رہ گیا ہے، ممکن ہے دوسرے حصہ میں اس کی تلافی ہو، یہ کتاب مواد، ترتیب اور زبان دبیان مختلف حیثیتون سے نظر ثانی کی محتاج ہے، لیکن

خوش عقیدہ عوام کے لئے مفید ہے، اللہ تعالیٰ مصنف کو ان کے حسن نیت کا صلہ عطا فرمائے،

ہم کیسے پڑھائیں، از جناب سلامت اللہ صاحب ایم اے، معلم جامعہ ملیہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی، اور اس کی شاخیں لکھنؤ، بمبئی، نمبر ۳۔

بچون کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہے، لیکن اب تک اس کی طرف پوری توجہ نہ ہو سکی، یون تو اس کا پورا نظام تعلیم موجود ہے، لیکن وہ جدید قومی ضروریات اور نئے تعلیمی اصولون سے مطابقت نہیں رکھتا، اور نہ اب تک اس موضوع پر اردو میں کتابیں ہیں، جامعہ ملیہ ایک ایسی درس گاہ ہے، جہان جدید تعلیمی اصولون کے مطابق اس کا عملی تجربہ ہو رہا ہے، اسلئے یہیں کے ایک استاد نے معلمین کی واقفیت کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، اس مین تعلیمی مواد یا نصاب تعلیم کے انتخاب اس کے باہمی ربط و تعلق کے اصولون پر بحث کی گئی ہے، اور اس کے قبول کے لئے بچون کی ذہنی تربیت کے طریقے بتائے گئے ہین اور پڑھانے میں مختلف نئے طریقون کو جن کا یورپ و امریکہ مین تجربہ ہو چکا ہے تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ان مباحث مین ہندوستان کی ضروریات اور یہان کے حالات کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے، ہر بحث کے آخر مین ماخذ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے، کتاب کی اصلی خوبی کا صحیح اندازہ تو فن تعلیم کے واقفکار ہی کر سکتے ہین، لیکن بظاہر کتاب مفید تعلیمات پر مشتمل اور اساتذہ و معلمین کے استفادہ کے لائق ہے،

طریق مستقیم مترجمہ جناب محمد اسماعیل صاحب ایم اے، تقطیع اوسط ضخامت ۹۹ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہین، پتہ:۔ مطبوعہ فاین پریس، ہیوٹ، روڈ، لکھنؤ،

حضرت شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا مجموعہ کتاب الصدق عربی مین تصوف کی مشہور و معروف کتاب ہے، اس میں حضرت شیخ نے کلام مجید، احادیث نبوی اور صلحاء و اخیار امت کے اقوال و حالات کی روشنی مین تصوف کے مہمات مسائل اور تقرب الی اللہ جملہ قلبی اعمال، اخلاص، صبر، معرفت نفس، معرفت ابلیس، طلب حلال، یا اکل حلال، ترک دنیا، خشیت الٰہی، حیا، محبت، رضائے الٰہی، اور انس مع اللہ میں صدق کی حقیقت

اور اس کی تشریح بیان فرمائی ہے، ہر بحث شریعت کی روح اور عرفان و تصوف کا عطر ہے، کتاب اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، ترجمہ سلیس و روان ہے،

علماے کرام کا مستقبل از جناب منظر الدین صاحب صدیقی بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر، پتہ اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور،

مصنف حیدر آباد کے سنجیدہ صاحب قلم ہین، اُن کے خیالات مین قدیم وجدید کا معتدل امتزاج ہے، وہ مذہب و ملت کا بھی درد رکھتے ہین، اور زمانہ کے نئے تقاضون پر بھی ان کی نگاہ ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر اونھون نے علماے کرام کے مستقبل پر غالباً یہ مضمون لکھا تھا، جسے کتابی صورت مین شائع کر دیا گیا ہے، اس مین اونھون نے علماے کرام کے منصب اور ان کے فرائض و ذمہ داریون کو دکھایا ہے، اور ان کے جمود وبے حسی، زمانہ کے حالات اور نئی ضروریات سے ان کی ناواقفیت و بے خبری، مسلمانون کی حالت سے ان کی غفلت اور اس کی دوسری خامیون اور کوتاہیون کو ظاہر کرکے مسلمانون کے حق مین اس کے مضر نتائج دکھائے ہین، اور علمار کو اُن کے فرائض کی جانب متوجہ کیا ہے، علماء کے فرائض کے بارہ مین لائق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل صحیح ہے، ان کی بعض کوتاہیون اور مسلمانون کی زبون حالی سے بھی انکار نہین اس سلسلہ مین مصنف کے بعض مشورے یقیناً غور و توجہ کے لائق ہین لیکن حُسنِ نیت کے باوجود اس بحث مین جابجا ان کا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا ہے، اور اُن کے دینی احساس پر دورِ جدید کی تجدید و اصلاح کا غلبہ نظر آتا ہے، ان کے نزدیک شروع سے اب تک تمام علماے کرام نہ صرف مسلمانون کی حالت سے غافل اور خود غرضی مین مبتلا رہے، بلکہ اونھون نے تجدید و اصلاح کی راہ مین مزاحمت پیدا کی، جو سراسر مبالغہ ہے، مصنف نے مسلمانون کی جو جو خرابیان اور جو جو اصلاح طلب باتین شمار کرائی ہین، ان مین دینی نقطۂ نظر سے کوئی ایسا اصلاح طلب امر نہین ہے، جس کی اصلاح کی جانب علما نے توجہ نہ کی ہو، پھر نفس تجدید و اصلاح کے بارہ مین بھی مصنف کے بہت سے خیالات محلِ نظر ہین، مثلاً وہ موجودہ فقہ کو دفتر پارینہ قرار دیتے ہین اور اور ترکون کی غیر اسلامی

اصلاحات کو بھی جائز شمار کرتے ہین، جدید حالات و مسائل کے حل کی ضرورت سے انکار نہین، لیکن اس کے خاطر فقہ کو دفتر پارینہ قرار دے دینا صحیح نہین، اس فقہ کی اہمیت اس سے کہین زیادہ ہے جتنی مصنف نے سمجھی ہے، بہرحال یہ کتاب بعض خیالات سے قطع نظر غور و توجہ کے لائق ہے،

اسلامی معاشرت از جناب غلام احمد صاحب پرویز تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ:- تسنیم منزل شیدی پورہ قرول باغ نئی دہلی،

کلام مجید مسلمانون کی جملہ دینی و دنیوی ضروریات کا ضابطہ ہے، اس مین مسلمانون کی فوز و فلاح کے مہمات مسائل بھی ہین، اور اجتماعی زندگی مین ایک دوسرے کے ساتھ حُسنِ معاملت اور حُسنِ معاشرت کی ہدایات بھی ہین، اگرچہ یہ بہ ظاہر چھوٹی چھوٹی باتین ہین، لیکن انسانی اخلاق و کردار کی تربیت سے ان کا گہرا تعلق ہے، اس لئے اسلام مین ان کی بڑی اہمیت ہے، اور تکمیل اخلاق اسلام کی تعلیم کا بڑا ضروری جزء ہے، لائق مؤلف نے اس کتاب مین کلام مجید سے اجتماعی زندگی کی حُسنِ معاشرت اور حُسنِ معاملت کی ہدایات کو جمع کر دیا ہے، جابجا ضروری تشریح بھی کر دی ہے، کتاب مسلمانون کے لئے مفید ہے،

سی پی میں کانگریس راج، از جناب حکیم اسرار احمد صاحب کریوی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ پتہ مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب جنرل سکریٹری مسلم لیگ ناگپور، سی پی،

کانگریسی وزارت کے دور مین صوبہ متوسط کے مسلمانون کو اس کے خلاف جو شکایتین تھین، اس کتاب مین ان کو مع شواہد و ثبوت کے جمع کر دیا گیا ہے، اس مین سرکاری محکمون، لوکل بورڈون، اور کونسل مین مسلمانون کی جو جو حق تلفیان اور ان پر جو زیادتیان ہوئین، ان کی پوری تفصیل درج ہے، بعض واقعات کے ثبوت مین سرکاری دستاویزون کی نقلین بھی شامل ہین، لیکن اب یہ داستان بعد از وقت ہے، البتہ آیندہ کے لئے اس سے حاکم و محکوم دونون سبق حاصل کر سکتے ہین،

آریائی زبانیں از جناب سدھیشور، ورما شاستری ایم اے، ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت لسانیات پرنس آف ویلز کالج جمون، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، قیمت ۸/ پتہ:- ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن،

لسانیات یا فیلالوجی اپنی خشکی کے باوجود نہایت دلچسپ فن ہے، لیکن اردو مین اس موضوع پر مستقل کتابین نہین ہین، بعض ادبی کتابون مین ضمناً کچھ لسانیاتی بحثین ملتی ہین، لائق مولف نے اس کتاب مین لسانی نقطۂ نظر سے ہندوستان اور ایران کی آریائی زبانون کی مختصر تاریخ، ان کی خصوصیات، ماخذ و ارتقاء عہد بعہد کے تغیرات، ان کی باہمی عرفی و صوتی مشابہت و اختلافات وغیرہ کو دکھایا ہے، ہندوستان کی زبانون پر نسبتہً زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب اس فن سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے

اپنے خواب از جناب سید کاظم دہلوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ/ پتہ دفتر کہکشان گلی تاراشاہ دہلی،

مصنف کتاب موجودہ دور کے اچھے افسانہ نگارون مین ہین، ان کے افسانون کے بعض مجموعے اس سے پیشتر شائع ہو چکے ہین، اپنے خواب بارہ افسانون کا نیا مجموعہ ہے، تقریباً کل افسانے رومانی ہین لیکن ان مین حسن و عشق کی محض تفریحی اور بے نتیجہ افسانہ طرازی نہین ہے، بلکہ روزانہ کے واقعات زندگی، اور ہماری معاشرت کی صحیح تصویرین ہین، افسانون کے پلاٹ دلچسپ، خیالات ستھرے اور زبان پاکیزہ ہے،

مفتاح العربیہ جزء اول و دوم مؤلفہ احمد بن ناصر العیسری استاذ عربی عثمانیہ ٹرینگ کالج حیدرآباد دکن، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ہر دو حصہ ۴/ پتہ:- مصنف سے ملے گی،

مصنف نے عربی زبان کے مبتدی طلبہ کے لئے یہ ریڈرین لکھی ہین وہ اہل زبان بھی ہین اور تعلیم کا بھی عملی تجربہ رکھتے ہین، اسلئے یہ ریڈرین زبان اور تعلیمی نقطۂ نظر دونون حیثیتون سے مفید ہین، ان مین روزانہ کی ضروریات کے الفاظ اور ان کی تدریج، اور ان کی مشق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، عربی کے مبتدیون کے لئے یہ مفید ریڈرین ہین،

م

جلد ۵۳ ماہ صفر المظفر ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۴ء عدد ۲

مضامین

شذرات

بیرونی اجنبی قوموں نے خاص سیاسی اغراض کے ماتحت ہندوستان کے اسلامی عہد کی نہایت غلط اور مسخ تاریخیں لکھیں، جن کا مقصد یہاں کے مختلف فرقوں میں باہم بغض و منافرت پھیلانا، ان کے دلوں سے اُن کے شاندار ماضی اور ان کے اسلاف کے کارناموں کی وقعت گھٹانا، ان کی پستی اور نئی حکمران قوم کی عظمت و برتری کا نقش جمانا تھا، اس کے جو مذموم نتائج نکلے وہ نگاہوں کے سامنے ہیں، اسی قسم کی تاریخیں تعلیمگاہوں میں داخل کی گئیں، اس لئے جدید تعلیم یافتہ نسل کے دل و دماغ ابتدا ہی سے ان کے زہریلے اثرات سے متأثر ہوتے رہے، اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود ان ہندوستانیوں نے جو تاریخیں لکھیں وہ بھی بالعموم ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں، اس لئے عرصہ سے ایسی تاریخ کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس میں واقعات کی صحت، غلط واقعات کی تحقیق و تنقید اور قومی تعمیر کے عناصر کا خاص لحاظ رکھا جائے، بعض اصحاب علم نے اپنے مضامین اور تحریروں میں اس مقصد کو پیش نظر رکھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے بس کا نہیں ہے، اب بعض علمی و تعلیمی اداروں نے بھی اجتماعی طور سے یہ کام شروع کیا ہے، چنانچہ انڈین ہسٹری کانگریس، بھارتیہ اتہاس پرشد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تاریخ ہندوستان کی تدوین کا کام ہو رہا ہے، دار المصنفین نے بھی اس کو شروع کیا ہے جس کا تذکرہ ان صفحات میں آچکا ہے،

تاریخوں کے لکھنے کا موقع بار بار نہیں آتا، اس لئے ان اداروں کو ابتدا ہی سے مذکورۂ بالا اہم اور ضروری پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہئے، ورنہ اگر ان تاریخوں میں بھی فروگذاشتیں رہ گئیں تو پھر اس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی، اور چونکہ یہ اپنی قوم کی ہوں گی اس لئے ان کی غلطیاں دوسری اقوام کی لکھی ہوئی تاریخوں کی غلطیوں سے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوں گی،

اس سلسلہ میں چند باتیں خاص طور سے توجہ کے قابل ہیں، ایک یہ کہ تاریخ لکھنے میں کسی قوم اور فرقے کا اپنا

نقطۂ نظر اور مخصوص قومی مقاصد سے یکسر خالی الذہن رہنا بہت دشوار ہے، اس لئے اس کی توقع بھی نہیں کی جاتی، لیکن اگر مذکورہ بالا اہم مشترکہ مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر دوسرے امور میں اپنے مخصوص قومی نقطۂ نظر کی ترجمانی میں چنداں مضائقہ نہیں ہے، دوسری یہ کہ دنیا کی کسی حکومت کا دامن خامیوں اور کوتاہیوں سے پاک نہیں اور نہ سب کے سب حکمران عدل و مساوات کا نمونہ ہوتے ہیں، کیا خود اپنی قومی حکومت کے ہاتھوں اپنے ہم قوم محکوموں کے ساتھ بے عنوانیاں نہیں ہوتیں، اور کیا خود اپنی قوم کے ہاتھوں حکومتوں کو نقصان نہیں پہنچے اور کیا عدل و مساوات کا یہ دور جس کو مذہبی تعصب سے خالی کہا جاتا ہے ایسی مثالوں سے خالی ہے، ایسی حالت میں کسی حکومت یا حکمراں کے ہر فعل کو محض اختلاف مذہب یا تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، بعض بے عنوانیاں حکومت کے ذاتی مصالح، عام سیاسی پالیسی اور مذہب سے قطع نظر ان کی قومی سرشت کا نتیجہ ہوتی ہیں، جن کو مذہبی جذبہ سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا، اور جس کا اثر بلا تفریق مذہب تمام محکوموں پر پڑتا ہے، اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ گذشتہ حکومتوں کے ہر جائز اور ناجائز فعل کو سراہا جائے، بلکہ یہ ہے کہ ان کو محض اختلاف مذہب کی عینک سے نہ دیکھا جائے اور ان کی غلطیوں اور بے عنوانیوں کو ان کی حد کے اندر محدود رکھا جائے، انہیں آب و رنگ دے کر چمکایا نہ جائے اور ان کی کوتاہیوں کے ساتھ فراخ دلی سے ان کے محاسن کا بھی اعتراف کیا جائے، یہ بھی واضح رہے کہ محض حسنِ ظن اور سوء ظن سے ایک ہی واقعہ کے متعلق نتائج بالکل بدل جاتے ہیں، بلکہ بسا اوقات متضاد ہو جاتے ہیں،

کسی تاریخ خصوصًا اپنی قوم کی تاریخ کی تدوین میں اعلیٰ قومی مقاصد کا لحاظ رکھنا تاریخ نگاری کی دیانت کے خلاف نہیں ہے، تاریخی دیانت اور خیانت کا مقصد یہ ہے کہ ذاتی جذبات، فرقہ وارانہ اغراض اور پست مقاصد کے لئے تاریخ کو مسخ یا اس پر ملمع نہ کیا جائے یہ نہیں ہے کہ غایت دیانتداری اور غیر جانبداری میں قومی تعمیر کے عناصر کو نظر انداز کر دیا جائے، اور نہ اس دیانت کا ثبوت آج تک کسی قوم کے مورخ نے دیا ہے، موجودہ زمانہ کی تاریخوں کو نہ صرف قوموں کو نیک نام اور بدنام کرنے بلکہ ان کو بنانے اور بگاڑنے میں بھی دخل ہے، اس لئے ان کی تدوین

میں کسی حال میں بھی قومی مقاصد سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا خصوصاً ہندوستان کی تاریخ میں جبکا ابھی تعمیری دور ہے،

گذشتہ مہینہ کی آخری تاریخوں میں کاشی پرچارنی سبھا کی سلور جوبلی منائی گئی، اس کے محترم صدر نے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں بڑی پرزور تقریر کی، اس میں دو باتیں خاص طور سے دلچسپ نظر آئیں، ایک ہندی کی عالمگیریت یعنی ہندوستان کے باہر اس کی مقبولیت اور اشاعت کا دعویٰ، دوسرے ہندوستان میں ریڈیو کے ذریعہ عربی اور فارسی کلچر کی اشاعت کی سازش کا انکشاف، اب تک ہندی کے مشترکہ اور عمومی زبان ہونے کا دعویٰ ہندوستان کے اندر تک محدود تھا، اس کی عالمگیری کی یہ پہلی آواز ہے دیکھیں آیندہ اس تخم ریزی سے کیا کیا شاخیں پھوٹتی ہیں، لائق صدر نے غالباً اس لئے ریڈیو پر غصہ کا اظہار کیا ہے کہ اس میں عام فہم زبان کیوں بولی جاتی ہے، ٹھیٹھ ہندی کیوں نہیں بولی جاتی، لیکن وفور جوش میں جناب صدر کی نگاہ اس پہلو پر نہیں گئی، کہ ان کا یہ غصہ اور الزام دوسرے لفظوں میں اس کا اعتراف ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان وہی ہے، جو ریڈیو پر بولی جاتی ہے، اس لئے کہ ریڈیو میں وہی زبان چل سکتی ہے، جسے سارا ہندوستان سمجھتا ہو،

مالوی جی کا لہجہ البتہ اس مرتبہ خلاف معمول اردو کے حق میں مشفقانہ تھا، انھوں نے اس کو ہندی کی بہن تسلیم کیا ہے، اور اس کی ترقی کی بھی خواہش ظاہر کی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہندی کو یہ ترجیحی حق عطا فرمایا ہے کہ عدالت کی زبان اسی کو ہونا چاہئے، اردو کو ہندی کی بہن تسلیم کرنے کے بعد پھر مادرِ ہند کے اس ترکہ میں ہندی کا ترجیحی حق کیوں ہے، اردو تو ہندو قانون وراثت کے مطابق بھی اس سے محروم نہیں ہوسکتی، اس پورے مجمع میں ایک بلبلِ ہند کے نغمہ میں صداقت تھی کہ "ہندوستان کی زبان وہی ہونی چاہئے جو صوبہ متحدہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے" اردو کے حامی بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے،

مقالات

حکیم الامت کے آثارِ علمیہ

حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہین کہ اُن سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکتا، اور یہی ان کی جامعیت ہے جو ان کے اوصاف و محاسن مین سب سے اول نظر آتی ہے، وہ قرآن پاک کے مترجم ہین، مجوّد ہین، مفسر ہین، اوس کے علوم و حِکَم کے شارح ہین، اوس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہین، وہ محدث ہین، احادیث کے اسرار و نکات کے ظاہر کرنے والے ہین، وہ فقیہ ہین، ہزارون فقہی مسائل کے جوابات لکھے ہین، نئے سوالون کو حل کیا ہے، نئی چیزون کے متعلق انتہائی احتیاط کے ساتھ فتوے دیئے ہین،..... وہ خطیب تھے، خطبِ ماثورہ کو یکجا کیا ہے، وہ واعظ تھے، ان کے سیکڑون وعظ چھپ کر عام ہو چکے ہین، وہ صوفی تھے، تصوّف کے اسرار و غوامض کو فاش کیا ہے، شریعت و طریقت کی ایک مدت کی جنگ کا خاتمہ کر کے دونون کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے، ان کی مجلسون مین علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے، اور یہ موتی جن گنجینون مین محفوظ ہین، وہ ملفوظات ہین جن کی تعداد بیسیون تک پہنچی ہے، وہ ایک مرشد کامل تھے، ہزارون مسترشد و مستفید اُن کے سامنے اپنے احوال و واردات پیش کرتے تھے، اور وہ ان کے تسکین بخش جوابات دیتے تھے، اور ہدایات بتاتے تھے، جن کا مجموعہ تربیۃ السالک ہے، اونھون نے بزرگون کے احوال و کمالات کو یکجا کیا، اور اس ذخیرہ سے سب کو آشنا کیا، اُن کی متعدد کتابیں اس مضمون مین ہین۔

اونھون نے حضرات چشت کے احوال و اقوال مین سے بظاہر اعتراض کے قابل باتون کی حقیقت ظاہر کی، اور انکی تاویلات کین، اون کی کتابون کے خلاصے اقتباسات اور تسہیلات ان سے الگ ہین، جن کی ترتیب ان کے مسترشدین نے کی ہے، وہ مصلح امت تھے، امت کے سیکڑون معائب کی اصلاح کی، رسوم و بدعات کی تردید و اصلاح رسوم اور انقلاب حال پر متعدد تصانیف کین، وہ حکیم امت تھے مسلمانون کے علاج اور نشأۃ و احیا پر حیوۃ المسلمین وغیرہ رسائل تالیف فرمائے، غرض ان کی زندگی مین مسلمانون کی کم کوئی ایسی مذہبی ضرورت ہو گی جس کا مداوا اس حکیم الامۃ نے اپنی زبان اور قلم سے نہین فرمایا، اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر مین آسکتا ہے،

ان کی تصنیفات ہندوستان کے پورے طول و عرض مین پھیلین، اور ہزارون مسلمانون کی صلاح و فلاح کا باعث ہوئین، اردو اور عربی کے علاوہ مسلمانون نے اپنے ذوق سے اُن کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانون مین بھی کیا، چنانچہ ان کی متعدد کتابون کے ترجمے انگریزی، بنگالی، گجراتی اور سندھی مین شائع ہوئے

ان کی تصانیف کی تعداد جن مین چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہین آٹھ سو کے قریب ہے ۱۳۵۴ھ مین اون کے ایک خادم مولوی عبدالحق صاحب فتحپوری نے ان کی تصنیفات کی ایک فہرست شائع کی تھی، جو بڑی تقطیع کے پورے ۸۰ صفحون کو محیط ہے، اس کے بعد نو برسون مین جو رسائل یا تصانیف ترتیب پائین وہ ان کے علاوہ ہین، کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کا مجدد اپنی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو یہ صدی جو مطبوعات و منشورات کے کمالات سے مملو ہے، اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات و اظہار مین ہو یا باطل کی نشر و اشاعت مین، پریس اور مطبع ہی کے برکات ہین، زبان و قلم اس صدی کے مبلغ ہین، اور رسائل و منشورات دعوت کے صحیفے ہین، اس بنا پر مناسب تھا کہ اس صدی کے مجدد کی کرامت بھی انہی کمالات مین جلوہ گر ہو،

علماے اسلام مین ایسے بزرگون کی کمی نہین جنکی تصانیف کے اوراق اگر انکی زندگی کے ایام پر بانٹ دیے جائین تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے، امام جریر طبری، حافظ خطیب بغدادی، امام رازی، حافظ ابن جوزی، حافظ سیوطی وغیرہ متعدد نام اس سلسلہ مین لئے جا سکتے ہین، ہندوستان مین مولانا ابوالحسنات

ازالہ کیا گیا ہے، صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں، تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھکر اون میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے، ذیل میں اہل علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں، اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات وحقائق ومعارف الگ لکھے گئے ہیں، ماخذون میں غالبًا سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر روح المعانی پر اعتماد فرمایا گیا ہے، یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقۃً مفید ہے کہ تیرہوین صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے، اس لئے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے، اور مختلف ومنتشر تحقیقات اس میں یکجا ملجاتی ہیں،

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیرین صرف عوام اردو خوانون کے لئے علماء رکھتے ہیں، یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا، لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحب نے اٹھاکر دیکھی تو فرمایا کہ مین سمجھتا تھا کہ اردو مین یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی، مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے، خود میرا خیال یہ ہے کہ قدیم کتب تفسیر میں راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے، ساتھ ہی ربط آیات وسور کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے، اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے، مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں، اس لئے وجوہ ربط میں قیاس اور ذوق سے چارہ نہیں، اس لئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس مین اختلاف کی گنجایش ہے، اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال مین سے کسی قول کی ترجیح مین زمانہ کی خصوصیات اور ذوق ووجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے، اس لئے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے،

۲- چونکہ مسلمانون پر شفقت اور ان کی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت غالب تھی، اس لئے وہ ہمیشہ اُن کو گمراہیون سے بچانے مین بجان ودل ساعی رہتے تھے، اردو مین حضرت شاہ عبد القادر صاحب اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے جو ترجمے شائع تھے، وہ بالکل کافی تھے، مگر نئے زمانہ مین پہلے سرسید نے بعض تفسیر اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے نئے اردو ترجمے شائع کئے، تو انھون نے پہلی دفعہ یہ کوشش کی کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمے کرین، اور اولین توجہ زبان کی طرف رکھیں، اور اقوال سلف کی پروا نہ کرین، اس طرز عمل نے علماء کو مضطرب کر دیا، اور ان کو ضرورت محسوس ہوئی، کہ اس کی اصلاح کی جائے، مولانا نے اپنا ترجمہ اسی غرض

سے مجبور ہو کر کیا، مگر اسی پر کفایت نہین کی، بلکہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو بغور پڑھا، اور اس کے اغلاط پر نشان دیکر ایک رسالہ اوس ترجمہ کی اصلاح پر لکھا جس کا نام اصلاح ترجمہ دہلویہ ہے،

۴۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کی عام اشاعت نے دہلی کے ایک بلند بانگ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا، اور انھون نے پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ پر اعتراضات شروع کئے، اور پھر اپنا ترجمہ چھپوایا جس کی نسبت عام طور سے مشہور ہے کہ وہ لکھنؤ کے ایک عالم کا کیا ہوا ہے، لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چھپا ہے، کیونکہ مرزا صاحب خود عربی سے نابلد تھے، بہرحال مولانا نے اس ترجمہ کے اغلاط کی اصلاح پر بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا جس کا نام اصلاح ترجمۂ حیرت ہے،

۵۔ بعض معاصر علمار نے اردو مین قرآن شریف پر حواشی لکھے ہین جن مین ربط آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے، اور آیات کو تاویل و اعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کیا ہے، اور اس تاویل و اعتبار میں کہیں کہیں حد اعتدال سے قلم باہر نکل گیا ہے، مولانا نے ان تاویلات بعیدہ پر تنبیہات لکھین جن کا نام التقصیر فی التفسیر ہے،

۶۔ لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدون مین تفصیل البیان فی مقاصد القرآن کے نام سے ~~جس کا عدد کتاب و خطابت ... اس مین~~ جو شرعی نقائص نظر آئے وہ مولانا نے الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان

عرصہ ہوا رسالہ ساقی دہلی مین پریم پجاری کے قلم سے سچی کہانیون کا ایک دلچسپ سلسلہ نکلا تھا، جو بہت مقبول ہوا، ہم نے بھی اس کو بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا، افسانون کی دلکشی غمازی کرتی تھی کہ پریم پجاری کے پردہ مین کوئی صاحب ذوق نہان ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ اس پردہ میں عندلیب کا نغمہ نکلے گا، مذکورہ بالا کتاب انہی پندرہ کہانیون کا مجموعہ ہے، مصنف کے تعارف کی ضرورت نہین، وہ ایک کہنہ مشق ادیب ہین، ان کا بیان ہے کہ یہ کہانیان سچی ہین اور اصل واقعات مین بہت کم اضافہ کیا گیا ہے، اگر اون کا یہ بیان صحیح ہے، اور غلط ہونے کی کوئی وجہ نہین، تو ان افسانون کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ کبھی سچی سرگذشت بھی افسانے سے کم دلچسپ نہین ہوتی، لیکن حقیقت مین فرضی افسانون سے زیادہ لطف و دلآویزی پیدا کرنا

مصنف کے حسنِ انشاء کا کمال ہے، یہ تمام افسانے دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں،

رنگ بست از جناب نواب مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:- اردو اکیڈمی لاہور

اردو میں دوسری زبانوں کی مشہور اور بلند پایہ نظموں کے منظوم ترجمے کرنا مختلف حیثیتوں سے اردو شاعری کے لئے مفید ہے لیکن یہ بڑا کٹھن کام ہے، ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے قادر الکلامی کے ساتھ بڑے سلیقہ اور حسن مذاق کی ضرورت ہے، ورنہ منظوم تراجم کی کوشش عموماً نہایت مضحک بن جاتی ہے، جس کی مثالیں اردو میں کمیاب نہیں، جناب اثر لکھنوی کی قادر الکلامی اور حسن مذاق مسلّم ہے، انھوں نے اس مجموعے میں یونانی، اطالوی، فرانسیسی، انگریزی، سنسکرت، بنگالی، اور عربی زبانوں کی اٹھائیس مشہور نظموں کے منظوم ترجمے کئے ہیں، الفاظ کی پابندی کے ساتھ منظوم ترجمہ کرنا تقریباً ناممکن ہے، اس لئے کہ ہر زبان کا انداز بیان اور طریقۂ تعبیر جداگانہ ہوتا ہے، اسلئے الفاظ کی پابندی سے زبان کی سلاست میں فرق آجائے گا اگر مفہوم کا بھی پورا ترجمہ ہو جائے تو بھی بڑی کامیابی ہے، اس لحاظ سے یہ ترجمے جناب اثر کی قادر الکلامی کا نمونہ ہیں، انھوں نے ان کو اس طرح اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے، کہ اگر کہیں کہیں خیالات غیر زبان کی غمازی نہ کریں تو ترجمہ کا گمان بھی نہیں ہوتا، بیشتر نظموں میں لطف زبان میں بھی فرق نہیں آنے پایا ہے، اور بعض ترجموں میں تو ادبی اور شاعرانہ نزاکتیں بھی موجود ہیں، یہ ترجمے بیشتر انگریزی کے ترجموں سے کئے گئے ہیں، اس لئے ممکن ہے، ترجمہ در ترجمہ میں اصل سے کچھ فرق پیدا ہو گیا ہو، لیکن اس کا کوئی ظاہری اثر ان نظموں میں نظر نہیں آتا، ان نظموں سے اردو شاعری میں اچھا اضافہ ہوا،

نمودِ زندگی از جناب سید علی منظور صاحب حیدر آبادی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت:- عمر، پتہ:- سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدر آباد دکن،

مصنف حیدرآباد کے مشہور شاعر ہین، اردو کے اکثر ادبی رسالون مین ان کا کلام نکلتا رہتا ہو، نمود زندگی اون کے کلام کا مجموعہ ہے، اس مین مذہب واخلاق سیاست وقومیات، عرفان وتصوّف، حسن وعشق وغیرہ مختلف موضوعون اور جذبات وخیالات پر نظمین ہین، کلام مین تخیل آرائی، اور رنگینی کے بجائے واقعیت اور سادگی بیان زیادہ نمایان ہے، بلکہ یہ دونون اوصاف اون کے کلام کا امتیازی وصف ہین، بعض نظمون مین سادگی اور واقعیت اتنی غالب ہے کہ وہ شاعری کی بہ نسبت واقعہ نگاری سے زیادہ قریب ہوگئی ہین، غزلون کا بھی عموماً یہی رنگ ہے، لیکن کلام مین پختگی ہے،

حالی محب وطن، از جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے،

کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت چھ آنے، پتہ :- اردو گھر احمد منزل کلان محل، دہلی،

مولانا حالی کی پیدایش کی صد سالہ یادگار کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریر فرمائی تھی، جسے کتابی صورت مین شائع کر دیا گیا ہے، آج کل کے انقلابی رجحانات اور ان کی تنگ نظری نے قوم و وطن کی محبت اور خدمت کے معنی ومفہوم کو بہت محدود کر دیا ہو اس تحدید کی بنا پر ہمارے بعض وہ پرانے خدام وطن جنھون نے سب سے پہلے حب وطن اور حب قوم کا سبق دیا، اس زمرہ سے خارج تصوّر کئے جاتے ہین، فاضل مقرر نے اس تقریر مین اس غلط فہمی کو دور کیا ہے، اور بتایا ہے کہ قوم اور وطن کی خدمت محض انقلاب کا نعرہ لگا دینے کا نام نہین ہے، اور اوس کے مختلف پہلوؤن اور مختلف حیثیتون کی وضاحت کر کے مولانا کی خدمت وطن کی نوعیت اور اس کی قدر وقیمت دکھائی ہے، اور ان کے کلام سے ان کے حُب وطن اور حب قوم کا ثبوت دیا ہے، بعض ایسی مثالین بھی پیش کی ہین جو خدمت وطن کے موجودہ معیار پر بھی پوری اترتی ہین، فاضل مقرر کی دوسری تقریرون کی طرح یہ تقریر بھی خیالات کے اعتدال وتوازن نکتہ وری کا نمونہ ہے،

"م"

جلد ۵۳ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۴ء عدد ۴

مضامین

شذرات

زمانہ کے عام اقتصادی حالات اور بعض مستقل آمدنیوں کے رُک جانے کی وجہ سے ادھر کچھ دنوں سے دار العلوم ندوہ کی مالی حالت بہت ناقابلِ اطمینان ہوگئی تھی، بڑی مشکل سے اخراجات چلتے تھے، ندوہ کے دوسرے صیغوں کی مد سے کئی ہزار کا قرض دارالعلوم پر ہوگیا تھا، ان حالات میں اس کی دستگیری کے لئے کارکنوں کی نگاہ اسی اسلامی ریاست کی طرف اٹھی جو ہندوستان کے تمام اسلامی اداروں کا ملجا و ماوی ہے، اور جیسا کہ اس سرکار کی علم نوازی سے توقع تھی، بارگاہِ سلطانی سے ندوہ کی سابق تین سو ماہانہ امداد میں مزید تین سو ماہوار کا اضافہ منظور ہوا، اور متفرق قرضوں کی ادائگی کے لئے پندرہ ہزار نقد کی اُمید دلائی گئی، یقین ہے کہ عام مسلمان اور تمام وابستگانِ ندوہ اعلیٰحضرت سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کی اس دین پروری اور علم نوازی کے منت پذیر و سپاس گذار ہوں گے، اس شاہانہ امداد کے علاوہ حیدر آباد کے اصحاب خیر سے آٹھ ہزار نقد چندہ وصول ہوا، اور ابھی کچھ وعدے ہیں، جن کے انشاء اللہ جلد پورے ہونے کی توقع ہے، اللہ تعالیٰ ان محسنین کو اس کارِ خیر کا صلہ عطا فرمائے، اس گرانقدر امداد سے ندوہ کو فی الجملہ بڑی تقویت حاصل ہوگئی

چند دن ہوئے علی گڑھ میں "اسلامی جماعت" کے نام سے ایک نئی مجلس کا قیام عمل میں آیا ہے، جس کا تذکرہ ان صفحات میں آچکا ہے، اس مجلس کا مقصد مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح اور اسلامی شعائر کی پابندی کی تبلیغ اور اسلامی تعلیمات کا احیاء ہے، حال میں مجلس کے کارکنوں کی جانب سے اس کے اغراض و مقاصد اور اس کا نظامِ عمل شائع ہوا ہے، اس سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اب کارکنوں نے عملی قدم اٹھایا ہے اور وہ ہر صوبہ میں مجلس کی شاخیں قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ ارادہ نہایت

مبارک ہو، لیکن اس قسم کی تحریکیں عموماً آل انڈیا بننے کے بعد بے نتیجہ ہو جاتی ہیں، ایسا نہ ہو کہ اس تحریک کا بھی یہی انجام ہو، اس لئے اگر مجلس مذکور اس وسیع دائرۂ عمل میں اپنی زیادہ توجہ مسلم یونیورسٹی پر صرف کرے تو یہ سارے ہندوستان میں تبلیغ و اشاعت سے کم مفید نہ ہوگا، یونیورسٹی مسلمانوں کا مرکزی تعلیمی ادارہ ہے جس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے نوجوان طلبہ اور اہل علم و صاحب دماغ فضلاء کا اجتماع ہے، اگر اس کے اساتذہ اور طلبہ میں صحیح اسلامی روح پیدا ہو جائے اور وہ یہاں سے مذہبی اثرات لیکر نکلیں تو ان کے ذریعہ خود بخود یہ چیز سارے ہندوستان میں پھیل جائے گی، لیکن اصل سوال عملی کوشش کا ہے، اس قسم کی مجالس کے قیام سے اتنا تو بہر حال اندازہ ہوتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ بدل گیا ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مسلمانوں کی اصلی اور صحیح اصلاح کا احساس پیدا ہو گیا ہے جو امید ہے کہ آیندہ چل کر کوئی مفید صورت بھی اختیار کرلے،

آل انڈیا مسلم ہسٹری کانگریس کا پہلا اجلاس گذشتہ سال لاہور میں منعقد ہوا تھا، دوسرا اجلاس ۷-۸-۹ اپریل کو اسلامیہ کالج پشاور میں منعقد ہو رہا ہے، امید ہے کہ یہ اجلاس کامیاب ہوگا اور ہندوستان کے اہل علم اور فضلاء، اسلامی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پڑھیں گے، اس اجلاس میں ترکوں کی تاریخ کی ترتیب کے مسئلہ پر بھی غور ہوگا، گو اس کانفرنس کا دائرۂ عمل وسیع ہے اور اس میں ہندوستان کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں کی بھی تاریخ آجاتی ہے لیکن سب سے مقدم کام ہندوستان کی تاریخ کی تدوین کا ہے، ترکوں کی تاریخ کی تدوین کا فرض کفایہ ایک حد تک دار المصنفین نے ادا کر دیا ہے اور دولت عثمانیہ کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں ترکی کی تاریخ یہاں سے شائع ہو چکی ہے، جدید ترکی پر تیسری جلد زیر ترتیب ہے

حال میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے حدیث کی دو اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں، ایک

حافظ یعقوب بن اسحاق المعروف بہ ابی عوانہ المتوفی ۳۱۶ھ کی مشہور مسند کا پہلا حصہ، دوسری حافظ ابوبکر محمد بن حسن المعروف بہ ابن فورک المتوفی ۴۰۶ھ کی کتاب مشکل الحدیث و بیانہ۔ مسند کا یہ حصہ کتاب الصلوٰۃ تک ہے، حافظ ابن فورک بہ یک واسطہ امام ابوالحسن اشعری کے شاگرد اور چوتھی صدی کے نامور اصولی فقیہ اور اشعری متکلم تھے، اس کتاب میں اشعری نقطۂ نظر سے ان احادیث کی تاویل و تشریح کی گئی ہے جن کے ظاہری الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق تشبیہ و تجسم کا گمان ہوسکتا ہے، اس پہلو سے یہ کتاب اہم ہے،

اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر مسرت ہوئی کہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد جو حیدرآباد میں زیر ترتیب تھی، پریس میں چلی گئی، اس اہم کام کی توقع حیدرآباد ہی سے ہوسکتی تھی، حیدرآباد کے اہلِ علم نے اردو بولنے والوں کی جانب سے یہ بڑا فرض ادا کیا، لیکن اصل چیز انسائیکلوپیڈیا کی معنوی حیثیت ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وہ علمی معیار پر کہاں تک پوری اترتی ہے، اس کے فاضل مرتبوں سے توقع اسی کی ہے کہ معلومات اور تحقیق دونوں کا معیار بلند ہوگا،

مشہور انگریز مستشرق پروفیسر فلپ کے ہٹی کی قابل قدر تالیف "ہسٹری آف دی عربز" تاریخ اسلام پر جامع اور محققانہ کتاب ہے، عام یورپین مورخین کے برعکس مصنف نے اس کتاب میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو بڑی حد تک صحیح نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کے علمی و تمدنی کارناموں پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے، یہ کتاب اپنی جامعیت اور وسعت معلومات کے لحاظ سے اردو میں ترجمہ کے لائق تھی، ہم کو خواجہ عبدالوحید صاحب سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور کے خط سے معلوم ہوا کہ انسٹی ٹیوٹ مذکور نے اس کام کو انجام دیا ہے، ترجمہ پورا ہوچکا ہے، امید ہے کہ جلد ہی شائع ہوگا، اس کی اشاعت سے تاریخ اسلام کے متعلق اردو میں ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوگا

مقالات

اسلامی معاشیات
کے
چند فقہی اور قانونی ابواب

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ

"مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کے مفید اور پُر از معلومات مضمون اسلامی معاشیات کا جو سلسلہ معارف میں نکلا تھا، اوس کے بعض ضروری اجزار باقی رہ گئے تھے، یہ مضمون رسالہ سیاست حیدرآباد میں شائع ہو چکا ہے، لیکن یہ اس سلسلہ کی ایک ضروری کڑی ہے نیز اس کی افادی حیثیت اس کی متقاضی ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کیجائے، اس لئے اس کو رسالہ سیاست سے نقل کیا جاتا ہے"۔

"م"

مجلہ "تحقیقات علمیہ" ۱۹۴۰ء میں "حکومت کی آمدنی" کے عنوان سے خاکسار کا جو مقالہ شائع ہو چکا ہے، میری جس کتاب کا وہ ایک حصہ تھا، اسی کے بعض دوسرے حصص کو اب "سیاست" میں ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ کی فرمایش پر شائع ہونے کے لئے دے رہا ہوں، مجلہ میں جو حصہ شائع ہوا ہے، اس کے متعلق

یہی مین نے لکھا تھا اور پھر اسی کو دہرانا چاہتا ہون کہ دراصل میری چند یادداشتون کا یہ مجموعہ ہے، کامل استیعاب اور احاطہ کی کوشش نہین کی گئی ہے، مقصود صرف یہ ہے کہ "اسلامی معاشیات" کے متعلق جو حضرات کام کرنا چاہتے ہین ان کے سامنے فقہ کی کتابون مین جو مواد پایا جاتا ہے، وہ پیش کر دیا جائے، جیسے جیسے موقع ملتا چلا جائے گا، اور فرصت ہمدست ہو گی، بتدریج دوسری چیزین بھی آپ کے سامنے آتی رہین گی،

اس موقع پر یہ بھی بتا دینا چاہتا ہون کہ "اسلامی معاشیات" اور مسلمانون کے معاشیات مین جو فرق ہے، کام کرنے والون کو چاہئے کہ اس فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھین، اس قسم کی قومین جن کے پاس اپنے مذہبی وثائق کا کوئی مکمل اور غیر مشتبہ ذخیرہ نہین ہے، وہ تو مجبور ہین کہ اپنے ہم مذہب مفکرین کے خیالات وآرار کو بھی اپنے مذہب ہی کی طرف منسوب کرکے پیش کرین، لیکن مسلمانون کو اسمین فرق کرنا چاہئے' اسلام نے جو نظام زندگی پیش کیا ہے اس کا سرچشمہ کتاب وسنت واجماع ہے فقہی مسائل اسلام کے ان ہی اساسی مستندات سے ماخوذ ہین' باقی تیرہ سو سال مین دنیا کے مختلف حصون مین بجائے خود مسلمان مفکرین نے زندگی کے مختلف پہلوؤن کے متعلق جو کچھ سوچا سمجھا، یا اپنی کتابون مین انھین درج کیا ہے، وہ مسلمانون کی چیز تو کہلا سکتی ہے لیکن غلط بیانی ہو گی اگر ان کو اسلام کی طرف منسوب کیا جائے، اس وقت جو چیز آپکے سامنے پیش ہو رہی ہے، اس کا براہ راست تعلق اسلام سے ہے، مسلمان مفکرین کے آرار ونظریات کو مین نے الگ جمع کیا ہے، جو اس سے بالکل جداگانہ چیز ہے،

(مناظر احسن گیلانی)

صحاح کی مشہور حدیث ہے کہ بندے قیامت کے دن اُس وقت تک اپنی ٹانگون پر کھڑے رہین گے جب تک کہ چار باتون کے جواب سے فارغ نہ ہولین، ان ہی چار گانہ سوالات مین ایک بڑا اہم سوال یہ بھی ہو گا کہ

عن مالہ من این اکتسبہ وفیم انفقہ، (ترمذی) آدمی سے پوچھا جائے گا اپنے مال کے یعنی اس مال کو کن ذرائع سے اُس نے حاصل کیا اور کہاں اُسے خرچ کیا

سچ پوچھئے تو معاشیات کے قانونی یا فقہی مسائل کا تعلق انہی دو باتون سے ہے، دوسرے لفظون مین یون خیال کیجئے کہ دولت کے دخل و خرچ کے متعلق اسلام نے مسلمانون کو جو عملی ضابطہ دیا ہے، اب آپ کے سامنے اسی کی تفصیل پیش ہوگی، دولتِ عباسیہ کے پہلے قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسف نے بھی اپنی مشہور سیاسی و معاشی کتاب کتاب الخراج جو خلیفہ ہارون الرشید کی فرمایش سے لکھی گئی ہے، اس مین بھی قاضی صاحب نے تمہید کلام مین اسی حدیث کو اسلامی معاشیات کی بنیاد قرار دیا ہے،

اس معاشی ضابطہ کے اساسی قوانین کو پیش نظر رکھ کر فقہائے اسلام رحمہم اللہ اجمعین نے جزئیات کے متعلق دفتر کے دفتر جو تیار کر دئیے ہین، ظاہر ہے کہ اس مختصر سی کتاب مین ان سب کا احاطہ ناممکن ہے، تاہم مین کوشش کرون گا کہ ایک خاص ترتیب سے اس سلسلہ کے اہم مسائل کو اپنی اپنی جگہ پر درج کر دون، ہوسکتا ہے کہ راہ بن جانے کے بعد آیندہ کام کرنے والے اس پر اور اضافہ کرین،

معاشیات کے دو اسکول

پہلا اسکول واقعہ یہ ہے کہ مشاہدہ اور تجربہ کے سوا خود قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے بنی آدم مین ایک طبقہ ان لوگون کا پایا گیا ہے، جو مالیات یا تحصیل دولت و صرفِ دولت دونون کو ہر قسم کی اخلاقی و مذہبی پابندیون سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے، "کمانا چاہئے" خواہ کسی ذریعہ سے ہو، "اڑانا چاہئے" خواہ خرچ کی جو راہین بھی ہون،

اس سلسلہ مین یہان تک دیکھا گیا ہے اور اب بھی دیکھا جاتا ہے کہ جن کی زندگی بظاہر دینی اور شرعی ہوتی ہے، یعنی نماز، روزہ، درود و وظائف، حج و قربانی، ان تمام امور کے وہ پابند ہوتے ہین، لیکن یہی لوگ جو اس قسم کی مذہبی پابندیون کو اپنے لئے لازم سمجھتے ہین، مالیات کے مسئلہ مین ہر قسم کی بے قیدیون کا دیدہ دلیری سے ارتکاب کرتے ہین، اس مکتب خیال یا مسلک عمل کا تذکرہ قرآن نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے ذکر مین کیا ہے یعنی حضرت شعیب نے جب ان پر معاشی قوانین کی پابندیون کو عائد کرنا چاہا تو ان کو جواب دیا گیا کہ

قالوا یا شعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک مایعبد اٰباؤنا و ان نفعل فی اموالنا ما نشاء،

اونھون نے کہا شعیب! کیا تمھاری نمازین یہ بھی حکم کرتی ہین کہ جن معبودون کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے، انھین ہم چھوڑ بیٹھین اور یہ کہ ہم اپنے اموال (دولت) کے متعلق جو چاہین کرین (اس مین وہ رکاوٹ پیدا ہو)

صرف یہی نہین بلکہ قوم شعیب کے معاشی ماہرین نے ان کے طرزِ عمل پر اظہار تعجب کیا، اوران کی عقل وفہم جس کا انھیں ایک مدت سے تجربہ تھا، اس کو بیش نظر رکھتے ہوئے ان روشن خیالون نے طنز کے لہجہ مین کہا کہ

انک انت الحلیم الرشید

تم تو بڑے بھاری بھرکم باوقار سوجھ بوجھ کے آدمی ہو،

بہرحال معاشیات کا یہ تو ایک آزاد مکتب خیال ہے تحصیل دولت کے ذرائع پر بظاہر ان کے نزدیک کسی قسم کی قید عائد کرنا سوجھ بوجھ عقل ودانائی کے خلاف ہے، بلکہ جس کو جس وقت جس ذریعہ سے بھی حصول دولت کا موقع ملے، بدعقلی ہوگی کہ اوس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے، یا روپیہ رہتے ہوئے اپنی خواہش خواہ جس بات کی ہو، آدمی پوری نہ کرے، قرآن نے جن الفاظ مین ان کے اس معاشی نظریہ کا ذکر کیا ہے، اوس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب جو عموماً لوگون کے خیال مین پوجا پاٹ یا صلوٰۃ مین منحصر ہے، معاشی کاروبار مین اس کی دخل اندازیون کو وہ ناپسند کرتے تھے، اسی لئے اونھون نے کہا کہ تمھاری نمازین کیا اس سے بھی روکتی ہین کہ ہم اپنے اموال کے متعلق جو چاہین کرین۔

دوسرا مکتب خیال اسی کے مقابلہ مین معاشیات ہی کا ایک دوسرا اسکول بھی ہے، جو دوسرے پہلوؤن کی طرح انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو بھی چند خاص حدود مین رکھنا چاہتا ہے، یعنی وہی بات جو حدیث مین آئی، کہ

من این اکتسبہ وفیما انفقہ

کہان سے کمایا اور کس راہ مین خرچ کیا،

دونون پر نگرانی قائم کرنا چاہتا ہے، تقریباً ہر زمانے مین اس طبقہ کی بھی کمی نہیں رہی، اگرعملی طور پر خواہ اس اصول کے ماننے والون کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو لیکن نظری حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اکثریت کم از کم زبان سے اس

نگرانی کی ہمیشہ حامی رہی ہے، اسی لئے چوری، ڈاکہ، رشوت، خیانت، دھوکا وغیرہ ذرائع کسب کو اچھی سوسائٹیون مین ہمیشہ بُری نظرون سے دیکھا گیا ہے، غالبًا اسی بنا پر دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک مین حد بندی عائد کرنے والے معاشی قوانین پائے جاتے ہین، اسلام کا تعلق بھی ثانی الذکر طبقہ سے ہے، اور اس وقت مین انہی پابندیون کی کلی حیثیت سے تفصیل کرنا چاہتا ہون، جو ان دونون امور یعنی "من این اکتسبہ" یا دوسرے لفظون مین "دخل" اور "فیما انفقہ" یا "خرچ" پر اسلام نے عائد کئے ہین، دونون سوالون پر دو مستقل عنوانون کے نیچے بحث کی جائے گی،

دخل

دخل یعنی مال و دولت کے کمانے اور ان سے استفادہ کے ذرائع پر اسلام نے جو قیود عاید کئے ہین، اسکی تفصیل کے سمجھنے کے لئے چاہئے کہ اجمالًا پہلے دنیا کی چیزون کی اس تقسیم کو سمجھ لیا جائے جو معاشی حیثیت سے اسلام مین اختیار کیگئی ہے،

اسلام مین اشیاء کی معاشی تقسیم واقعہ یہ ہے کہ فقہ کی کتابون مین اگرچہ مالی مسائل کو مختلف ابواب کے ذیل مین منتشر کرکے بیان کیا گیا ہے لیکن تمام ابواب کے مسائل کو پیش نظر رکھکر منطقی طریقہ سے چاہین تو ہم اُن کو یون تقسیم کرسکتے ہین یعنی ان چیزون کا بنی آدم مین کوئی مالک ہے یا نہین، اگر مالک نہین ہے، تو قبضہ کرنے کے بعد بھی آدمی ان کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں، اسی طرح جن چیزون کا کوئی مالک ہے، ان کی بھی دو صورتین ہین، مالک کی مرضی کے بغیر اسلام ان پر دوسرون کو قبضہ کرنے کی اجازت دیتا ہے یا نہین، اگر دیتا ہے تو اس کی کتنی صورتین ہین، اور نہین دیتا ہے، تو پھر ان چیزون کے مالک ہونے کے قانونی ذرائع کیا ہین، اور اسلام ان قانونی پابندیون کو ان چیزون کے مالک ہونے کے لئے کیون ضروری قرار دیتا ہے، چونکہ ان تمام منطقی شقون کے نیچے کچھ نہ کچھ چیزین داخل ہین، اس لئے مین ہر ایک پر الگ الگ بحث کرتا ہون،

ایسی چیزین جن کا اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی مالک نہین، ہدایہ مین ہے :-

کالانتفاع بماء البحر کالانتفاع بالشمس	سمندر دریا کے پانی سے استفادہ کی نوعیت وہی ہے
والقمر والهواء،	جو آفتاب، ماہتاب اور ہوا سے استفادہ کا حکم ہے،

(کتاب الشرب، ج ۴) (یعنی ہر شخص کو ان سے استفادہ کا عام حق حاصل ہو)

جس سے معلوم ہوا کہ سمندر دریا وغیرہ اور ان کا پانی اور آفتاب ماہتاب وغیرہ اور ان کی روشنی اسی طرح ہوا اور فضا کا کوئی مالک نہیں ہے، اسی طرح ہوا کے پرندے جنگل کے جانور اور سمندر کے حیوانات ان سب کا بھی کوئی مالک نہیں ہے، اور یہی حال جنگل، پہاڑ وغیرہ کے درختوں اور دیگر نباتات کا ہے کہ نہ ان کا کوئی مالک ہو اور نہ ان کے پھلوں کا، بلکہ ہر شخص کے لئے وہ شرعاً مباح اور جائز ہیں، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج مین اخروٹ، بادام وغیرہ کے خودرو جنگلی درختون اور شہد وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

اذا کان فی المفاوز والجبال علی الاشجار	جب یہ چیزیں صحرا اور پہاڑون مین درختون
او فی الکھوف فلا شئی فیہ وھو	مین یا پہاڑ کے غار مین ہون تو ان پر کچھ نہیں
بمنزلۃ اثمار تکون فی الجبال والاودیۃ	(یعنی حکومت کوئی محصول عائد نہیں کرسکتی) اور
	ان کا حال ان پھلوں کا ہے جو پہاڑوں اور

(وادیوں میں ہوتے ہیں)

باقی اراضی یعنی زمین کی بھی اسلام مین چند قسمیں ہین، صاحب بدائع نے ان اقسام کو اس طرح بیان کیا ہے،

والارض فی الاصل نوعان مملوکۃ و	زمین کی دراصل دو قسمیں ہین، زمین جو کسی کی ملکیت ہو
الارض مباحۃ غیر مملوکۃ والمملوکۃ	ایک قسم دوسری قسم مباح یعنی کسی کی ملکیت مین نہ ہو
نوعان عامرۃ وخراب والمباحۃ	پھر جو زمین کسی کی ملک ہو اس کی بھی دو قسمیں ہین
ایضاً نوعان نوع ھو من مرافق	آباد اور غیر آباد، اسی طرح غیر مملوکہ مباح زمین
البلدۃ محتطبا لھم ومرعی لمواشیھم	کی بھی دو قسمیں ہین، ایک وہ جس کا شمار بلد (آبادی)
ونوع لیس من مرافقھا وھو المسمی	کی سہولت آفرینیوں سے ہو، مثلاً لکڑی حاصل
بالموات،	کرنے کی جگہ ہے مویشیوں کی چراگاہ ہو، اور دوسری
	وہ جس کا شمار مرافق سہولت آفرین خطہ سے نہ ہو

(بدائع الصنائع، ج ۶، ص ۱۹۲)

جس سے معلوم ہوا کہ زمین کی بعض قسمین غیر مملوک بھی ہوتی ہین، اور ظاہر ہے کہ جب ان پر کسی کا قبضہ نہین تو ان کے مملوک ہونے کے کیا معنی ہو سکتے ہین، سوال اس کے بعد ہوتا ہے کہ ان چیزون کی تملیک کی کیا شکل ہے، عام طور سے ان چیزون کے مالک ہونے کا طریقہ اسلام نے بھی وہی اختیار کیا ہے، جو عموماً دنیا مین مروج ہے ابو داؤد مین سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

من سبق الی مالم یسبق الیہ مسلم فھو احق بہ، — جس پر کسی مسلمان کا پہلے قبضہ نہ ہو تو جو پہلی دفعہ قبضہ کرے گا وہی اس کا زیادہ حقدار ہے،

فقہاء نے اس حدیث کی بنا پر یہ قانون پیدا کیا، جیسا کہ ہدایہ مین ہے،

مَنْ سَبَقَتْ یَدُ یَدِہٖ اِلَیْہِ فِی مِلْکِہٖ، — یعنی پہلی دفعہ جس کا قبضہ اس پر ہوگا وہی اس کا مالک ہو جاتا ہے،

مثلاً کہتے ہین کہ

مَنْ اَحْتَطَبَ فِی مَفَازَۃٍ فَھُوَ لَہٗ وَمَنْ اَصْطَادَ صَیْدًا فَھُوَ لَہٗ — جنگل مین جو لکڑی کاٹ لے اور شکار کو جو شکار کرے وہ اُسی کا ہوگا،

لیکن باوجود اس عام قانون کے چند چیزین ایسی ہین جن کو اسلام مین بعض خاص شرائط کے ساتھ اس قانون سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، میرا مطلب یہ ہو کہ ایسی چیزین جن پر کسی کا قبضہ ہی نہین ہو سکتا، اور ان کو وہ اپنی حفاظت میں نہیں لے سکتا، مثلاً آفتاب و ماہتاب ہوا وغیرہ ان کا تو ظاہر ہی ہے کہ آدمی مالک نہین ہو سکتا، ہدایہ مین ہے کہ

الانتفاع بالشمس والقمر والھواء فلا یمنع من الانتفاع بہ علی ای وجہ شاء، — آفتاب ماہتاب ہوا سے فائدہ اٹھانے سے کوئی روکا نہین جا سکتا، جس طرح چاہے ان سے استفادہ کر سکتا ہے،

اسی بنا پر فقہاء کا یہ مسئلہ ہے کہ دو منزلہ مکان کی نچلی منزل کا کوئی اگر مالک ہو اور اوپر والی منزل کا کوئی اور، پھر اوپر والی منزل گر جائے تو اس فضا یا ہوا کو جس میں یہ اوپر والی منزل تھی، اس کو کوئی بیچ نہیں سکتا، ابن ہمام نے اس کی وجہ فتح القدیر میں یہ لکھی ہے کہ مکان کو بلند کرنے کا جو حق اس کو حاصل تھا وہ

حق متعلق بالھواء ولیس الھواء	ایک ایسا حق ہے جو ہوا کے ساتھ قائم ہے، اور
مالاً یباع (۴۰۲ مطبوعہ مصر ج ۵)	ہوا کوئی مال نہیں ہے، جسے بیچا جائے،

اشتراکی سرمایہ پانی، آگ گھاس

لیکن علاوہ ان چیزوں کے اور بھی چند امور ہیں جن پر خواہ کسی کا قبضہ ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن عام مفاد کے لئے اسلام نے یہ قرار دیا ہے کہ انفرادی طور پر قانوناً کوئی ان کا مالک نہیں ہو سکتا، بلکہ انھیں عام پبلک پراپرٹی قرار دینا چاہتا ہے، اس سلسلہ میں عموماً کتابوں میں اگرچہ تین ہی چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے یعنی مشہور حدیث ہے،

الناس شرکاء فی الماء والکلاء	لوگ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے ساتھی
والنار	اور شریک ہیں، یعنی الماء (پانی) الکلاء (گھاس)
(صحاح)	النار (آگ) ہیں،

اسی حدیث کی بنا پر پانی، گھاس، آگ میں "الناس" یعنی عام پبلک شریک سمجھی جاتی ہے،

اشتراکی سرمایہ کے طبقات

لیکن صرف انہی تین چیزوں تک اشتراک کے قانون کو محدود سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس ذیل میں اور بھی ایسی چیزیں ہیں جن کو انفرادی ملک قرار دینے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ

اذ ملکه احد بالاحتجاز ملك منعه	اگر احاطہ بندی کر کے کوئی اس کا مالک ہو جائیگا
فضاق علی الناس فان اخذ العوض	تو لوگوں کو اس سے روکے گا اور عوام تنگی
عنه اغلاه لا تخرج عن الموضع	میں مبتلا ہو جائیں گے، اور اگر اس کا معاوضہ
الذی وضعه الله من تعمیم ذوی الحوائج	لے گا تو اسے گراں کر دیگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

من غیر کلفة المخنی،	حق تعالیٰ نے جس غرض کے لئے اس چیز کو جو
(ص ۱۵۰، ج ۶)	مقام عطا کیا تھا، وہاں سے وہ چیز ہٹ جائیگی
	یعنی عام حاجتمندون کی ضرورت بغیر کسی کلفت
	ومشقت کے پوری ہو یہ بات جاتی رہے گی،

اسی لئے علامہ ابن قدامہ نے اس سلسلہ مین حسب ذیل چیزون کا اضافہ کیا ہے،

المعادن الظاہرة وھی اللتی یوصل	ظاہری معادن ان کو کہتے ہین جن تک بغیر کسی
ما فیھا من غیر مو نة ینتابھا الناس	محنت ومشقت کے رسائی حاصل ہو سکے لوگون
وینتفعون بھا کالملح والماء و	کی اس پر آمد ورفت جاری ہو، اور لوگ اس
الکبریت والقیر والمومیاء و نفط	سے نفع اوٹھاتے ہون مثلاً نمک گندھک پچ
والکحل والیاقوت ومقاطع الطین	(ڈامر) مومیا، نفط (مٹی کا تیل) سرمہ یاقوت
واشباہ ذلک،	یا مٹی نکالنے کی جگہ ہو،

علامہ لکھتے ہین کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ چیزین

لا تملک بالاحیاء ولا یجوز اقطاعھا	نہ آباد کرنے اور حکومت سے جاگیر ملنے کی وجہ سے
لاحد من الناس ولا احتجازھا دون	ان امور کا کوئی مالک ہوتا ہے، اور نہ یہ جائز ہو
المسلمین لان فیہ ضرر بالمسلمین	کہ عام مسلمانون پر اس سے استفادہ کی راہ بند
وتضییقا علیھم،	کی جائے، کیونکہ اس سے مسلمانون کو نقصان
	پہونچے گا، اور ان پر تنگی ہوگی،

فقہاء نے اس قانون کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث سے مستنبط کیا ہے، جو ابو داؤد و ترمذی وغیرہ مین پائی جاتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ابیض بن حمال نامی صحابی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست پر مارب

(یمن) کے ایک کھاری چشمہ کو بطور جاگیر کے عطا فرما دیا، لیکن سند لے کر جب وہ روانہ ہوئے تو لوگون نے عرض کیا کہ حضورؐ نے خیال نہین فرمایا کہ اس شخص کو جاگیر مین کیا چیز عطا فرما دی گئی، وہ تو ایک نہ ختم ہونے والا جاری چشمہ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر ارشاد فرمایا "فلا اذن" یعنی جب وہ ایسا چشمہ ہے تو پھر وہ جاگیر مین نہین دیا جا سکتا، اسی لئے فقہا نے یہ طے کر دیا ہو کہ حکومت اس قسم کی چیزین کسی کو جاگیر مین بھی دے، جب بھی وہ کسی کی جاگیر نہین بنے گی، اور وہ ہر حال مین پبلک جائداد ہی رہے گی،

علاوہ ان معادن کے فقہا، نے انھین مصالح کی بنا پر لکھا ہے کہ

لیس للامام ان یقطع مالا غنی للمسلمین عنہ یعنی اذا کانت اجمۃ او غیضۃ او بحر نیشربون منہ او مملحۃ لاھل بلدۃ فلیس للامام ان یقطع ذلک لاحد،

(عنایہ برحاشیہ ہدایہ ج ۴ ص ۳۸۲)

ایسی چیزین جن سے عموماً مسلمان بے نیاز نہین ہو سکتا، یعنی ان کی عام ضرورت کی چیزین ہون تو حکومت کو حق نہین ہے کہ کسی خاص آدمی کی جاگیر مین ان کو دے دے مثلاً کوئی اجمہ (آبی نیستان) ہو یا جنگل ہو، یا دریا ہو جس سے پانی پیتے ہون یا نمک بنانے کی جگہ کسی خاص آبادی کی ہو، جائز نہ ہوگا کہ امام کسی کو یہ چیزین جاگیر مین دے،

اسی طرح آبادی کی چراگاہین یا ارد گرد کی جھاڑیان جن سے لوگ ایندھن کا کام لیتے ہین یا آبادی کے اطراف کی ایسی زمینین جن پر کھلیان وغیرہ لگاتے ہین، اور ان کا کوئی مالک نہ ہو تو فقہا نے لکھا ہے،

ماکان خارج البلدۃ من مرافقھا ومحتطباً لاھلھا او مرعی لھم لا یکون مواتاً حتی لایملک الامام اقطاعھا،

[illegible]

آبادی سے باہر جو سہولت کی چیزین ہون اور باشندون کو لکڑی حاصل کرنے کی جگہ ہو تو یہ ساری چیزین نہ موات (یعنی ایسی زمین نہین ہو سکتی ہین جنھین آباد کر کے کوئی ان کو ذاتی ملک بنا سکتا ہو) اور نہ امام (حکومت) ہی

زیلعی نے اس دفعہ کو نقل کرتے ہوئے یہ لکھا ہے :-

فناء العامر فينتفعون به لانهم محتاجون اليه لرعی مواشيهم و طرح حصائدهم فلم يكن انقطاعهم منقطعا عنه ظاهراً فلا يكون مواتاً

آبادی کے اطراف واکناف کی زمین کا بھی یہی حکم ہے، کہ عام لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں لوگ اپنی مویشیوں کے چرانے کے لئے اور کھلیان لگانے کے لئے اس کے محتاج ہیں، اور اس قسم سے استفادہ کا جو حق ہے، وہ اس قسم کی زمینوں سے منقطع نہیں ہوسکتا، اس لئے اس کا الموات (آباد کرکے آدمی جس کا مالک ہوسکتا ہو) اس میں شمار نہیں ہوسکتا،

(زیلعی بر ہدایہ ج ۴ ص ۳۸۰)

اسلام نے جب ان چیزوں میں انفرادی ملک کو ناجائز ٹھہرایا ہے . تو ظاہر ہے کہ شاہراہ عام یا عام آبپاشی کے ذرائع جنھیں یوں بھی پبلک کی ملک خیال کیا جاتا ہے، ان میں انفرادی ملک کو کس طرح جائز قرار دیا جاسکتا ہے، فقہ کی کتابوں میں اس کی صراحت کردی گئی ہے کہ جس طرح مندرجہ بالا امور کو حکومت کسی کی انفرادی ملک نہیں قرار دے سکتی اسی طرح

لا اقطاعة كشارع الماء وطرقات المسلمين،

جائز نہ ہوگا کہ پانی کے خزانوں اور مسلمانوں کی عام شاہراہوں کو حکومت کسی کی جاگیر میں دیدے،

(ابن قدامہ ج ۶ ص ۱۵۸)

نہ حکومت دے سکتی ہے، اور نہ آبادی کے باشندے ان پر قبضہ کرکے اپنی ملک بنا سکتے ہیں، کفایہ شرح ہدایہ میں ہے :-

ولكن لا يجوز احياء ما تعلق به حق

یوں ہی آباد کرکے قبضہ کرنے کی اجازت ان

العامة كما فى النهر والطريق،	چیزون کے متعلق بھی نہین دیجا سکتی جن کے ساتھ عوام کا حق متعلق ہو، مثلاً نہر اور راستہ کا جو حکم ہے،
(ج ۴ ص ۳۰۲)	

خلاصہ یہ ہے کہ پانی، آگ، گھاس، اور ایسے معادن جن کی پیداوار کے حاصل کرنے مین کسی محنت و مشقت جد وجہد اور مصارف کی ضرورت نہین ہوتی، اور عام لوگون کی ضرورت کی چیزین ان سے برآمد ہوتی ہون، آبادی کی چراگاہین، جنگل جھاڑ، جن کا کوئی مالک نہ ہو، آبادی کے اطراف کی وہ زمین جس میں آباد کار اپنی ندعی کاروبا کرتے ہون، مثلاً کھلیان وغیرہ لگاتے ہون، یا شوارع عام (عام راستے) یا آبپاشی کے عام خزانے وغیرہ ایسی چیزین نہ حکومت کسی کو انفرادی طور پر ان کا مالک بنا سکتی ہے، اور نہ قبضہ کرکے خود کوئی ان کو اپنی انفرادی ملک بنا سکتا ہے اگر کوئی قبضہ بھی کرے گا تو قانوناً غلط ہوگا، اور ہمیشہ یہ پبلک جائداد ہی سمجھی جائے گی، گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام ان امور کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اشتراکی رکھتا ہے، اجمالی طور پر توان امور کا یہی حال ہے لیکن فقہا نے ان کی مختلف قسمون پر غور کیا ہے، اور بعض چیزون کو اشتراک کے اس حکم سے مستثنیٰ بھی کیا ہے، مثلاً پانی کی انھون نے چار قسمیں قرار دی ہین، صاحب بدائع لکھتے ہین،

پانی کی مختلف قسمین اور ان کے مختلف احکام | صاحب بدائع لکھتے ہین :۔

المياه اربعة انواع الاول	پانی کی چار قسمیں ہین، پہلی قسم پانی کی وہ ہے
الماء الذى يكون فى الاوانى	جو برتنون اور ظروف میں ہو، دوسری قسم وہ
والظروف والثانى الذى يكون	ہے جو کوؤن اور حوضون اور چشمون مین ہو
فى الآبار والحياض والعيون	تیسری قسم وہ ہے جو ان چھوٹے دریاؤن اور
الثالث ماء الانهار الصغار التى	ندیون مین ہو جن کا تعلق خاص خاص قومون
تكون لاقوام مخصوصين والرابع ماء الانهار	سے ہو، چوتھی قسم وہ ہے جو بڑے بڑے دریاؤن میں

العظام کجیحون وسیحون ودجلہ والفرات | جیحون اور سیحون، دجلہ و فرات وغیرہ میں ہو،

بڑے بڑے دریا کا پانی | پانی کے ان چار اقسام کے متعلق بالاتفاق سب کا یہ مذہب ہے، کہ جو پانی بڑے بڑے دریا مثلاً جیحون، سیحون یا ہندوستان میں گنگا جمنا، کرشنا گوداوری کا ہے، یہ ملک کے تمام باشندوں کا پانی ہے، ہر شخص کو اس سے خود پینے کا جانوروں کو پلانے کا اور کھیتوں باغوں کے سینچنے کا قانونی حق ہے، صاحب بدائع لکھتے ہیں،

الانهار العظام کسیحون وجیحون	بڑے بڑے دریا مثلاً سیحون اور جیحون دجلہ و فرات
ودجلة والفرات ونحوها فلا	اور اسی قسم کے جو دریا ہیں، یہ کسی کی ذاتی ملک
ملك لاحد فيها ولا في رقبة	نہیں بن سکتے، نہ ان کے پانی کا کوئی ذاتی مالک
النهر ولا لاحد حق خاص فيها	ہو سکتا ہے، اور نہ اس رقبہ زمین کا جس میں ان
ولا في الشرب بل هو حق عامة	دریاؤں کا پانی بہتا ہے، اور نہ کسی خاص شخص
المسلمين. فلكل احد ان ينتفع	کا ان کے ساتھ کوئی ذاتی حق متعلق ہو سکتا ہے،
بهذه الانهار بالشفة والسقى،	نہ آبپاشی کا ذاتی حق ان دریاؤں کے متعلق کسی
	خاص شخص کو حاصل ہو سکتا ہے، بلکہ یہ عام
	مسلمانوں کا حق ہے، اسی لئے ہر شخص کو حق حاصل
	ہے کہ ان دریاؤں سے وہ نوشیدنی اور سیرابی
	دونوں قسم کے منافع اٹھا سکتا ہے،

بڑے دریاؤں سے نہر نکالنا | صرف یہی نہیں بلکہ ان دریاؤں سے نہر کاٹ کر اگر کوئی اپنی زمین میں لائے اور کسی دوسرے کی زمین اس کے اس فعل سے برباد نہ ہوتی ہو، یا باشندگان ملک کو اور کسی قسم کا نقصان نہ پہونچتا ہو تو کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ نہر کھودنے سے اس کو روکے حتی کہ حکومت بھی یہ نہیں کرسکتی،

بدائع میں ہے :-

له ان يشق اليها نهراً من هذه الانهار وليس للامام ولا لاحد منعه عنه يضرهم او لم يضر،

اس کا بھی ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنی زمین تک ان دریاؤں سے نہر کاٹ کر لیجائے، اور نہ امام (حکومت) ہی کو اس کا حق ہے، اور نہ کسی اور کو کہ اس فعل سے اس کو روکے بشرطیکہ اس نہر کی وجہ سے کسی کو ضرر نہ پہونچے،

ان دریاؤں کے پانی کی قوت سے چکی وغیرہ چلانا یا موٹ چرس ان پر قائم کرنا

اسی طرح ہر باشندۂ ملک کو اس کا بھی حق ہے کہ اس قسم کے دریاؤں اور ندیوں پر،

ان ينصب عليه رحى ودالية وسانية (ہدایہ)

کہ ان پر پن چکی اور رہٹ موٹ وغیرہ قائم کرے،

البتہ حکومت اور پبلک دونوں کو اس کا حق ہے کہ اس کے ان افعال سے خود نہر یا دریا کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اس کی نگرانی کریں، ہدایہ ہی میں ہے:-

فكان لكل واحد سبيل من الانتفاع لكن بشرط عدم الضرر بالنهر كالانتفاع بطريق العامة وان اضر بالنهر فلكل واحد من المسلمين منعه،

اگرچہ ہر شخص کو نفع گیری کا حق حاصل ہے بشرطیکہ اس کی نہر کی وجہ سے کسی کا کچھ نقصان نہ ہوتا ہو، وہی حکم اس کا بھی ہے جو عام شاہراہوں کا ہے، لیکن اگر اس کی نہر سے نقصان پہنچتا ہو تو ہر مسلمان کو حق ہے کہ اس فعل سے اس کو روک دے،

دریاؤں کے سوا پانی کے اقسام

اسی طرح پانی کی دوسری اور تیسری قسم یعنی مخصوص افراد کی زمین میں جو نہریں ہوتی ہیں، یا مملوکہ زمینوں کے تالاب اور کنوؤں کا پانی اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ

حق الشفعة ثابت،

نوشیدنی کا حق پبلک کے ہر فرد کو آئین حاصل ہے،

یعنی خود پینے یا اپنے جانوروں کو پانی پلانے کا حق تو اب بھی عام پبلک کو حاصل ہے، البتہ چونکہ مملوکہ زمینوں سے اس پانی کو تعلق ہے، اس لئے زمین کے مالکوں کی اجازت کے بغیر دوسروں کو اس پانی سے باغوں یا کھیتوں کے سینچنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، ہدایہ میں ہے،

فان اراد رجل ان یسقی بذالک	اگر کوئی اپنی آباد کردہ زمین کو اس قسم کے پانی
ارضا احیاھا کان لاھل النھر ان	سے سینچنا چاہے، تو نہر والوں کو حق ہے کہ اس
یمنعوہ عنہ اضربھم اولم یضر (ہدایہ جلد ۴ صفحہ ۳۸۶)	کو روک دیں، خواہ نقصان ہو یا نہ ہو،

نہروں کنوؤں تالابوں اور پانی کے فروخت کا حکم

مگر با ایں ہمہ اس قسم کے پانی کے بیچنے یا اجارہ کی بھی اجازت نہیں ہے، فقہا اس باب میں ایک حدیث بھی نقل کرتے ہیں کہ

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کنوؤں
عن بیع نبع البیر،	کے سوت کے پانی کو کوئی فروخت کرے،

"نبع البیر" کا ترجمہ صاحب بدائع نے فضل مائھا یعنی کنوؤں کا زائد از ضرورت پانی کیا ہے، بہرحال اس حدیث کی وجہ سے پینے پلانے سے تو کسی کو کوئی روک نہیں سکتا، لیکن اگر ہر شخص کو ایسی نہروں یا تالابوں یا بائیوں سے آبپاشی کی عام اجازت دے دی جائے گی، تو جیسا کہ صاحب بدائع لکھتے ہیں،

کل احد یتبادر الیہ فیسقی منہ	ہر شخص پیش قدمی کرکے اس پانی سے نفع اٹھانا
زرعہ واشجارہ فیبطل حقہ	چاہے گا، اور اس سے اپنے کھیت اور باغ کو
اصلا،	سیراب کرے گا، بس نہر والوں کا حق مارا جائیگا

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے پانی میں اشتراکیت کا نظریہ صرف "حق الشفۃ" یعنی نوشید نی تک محدود ہے پھر فقہا نے اس کی مختلف شکلوں کے احکام بھی لکھے ہیں، مثلاً اگر کنواں یا تالاب کا مالک پبلک کو اپنی زمین سے آنے سے روکے، اور کہے کہ قانوناً پانی پر تمہارا حق ہے لیکن میری مملوکہ زمین کے احاطہ میں داخل ہونے کی تو اجازت نہیں

تو ایسی صورت مین دیکھا جائے گا اگر نوشیدنی کی ضرورت پبلک کسی اور ذریعہ سے پوری کر سکتی ہے، تو جھگڑنے کی حاجت نہین لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر کنوؤن کے مالک کو مجبور کیا جائے گا، کہ یا تو وہ لوگون کو اپنے کنوئین سے پانی لینے دے ورنہ کوئی نظم کرے کہ لوگون تک ان کا قانونی حق پہنچ جائے یعنی اون کے اور ان کے جانورون تک پانی پہونچ جائے اس حق پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ دونون باتون مین سے کسی پر راضی نہ ہو تو پبلک کو حق ہے کہ باضابطہ مسلح ہو کر اس سے جنگ کرے، اور اپنا حق حاصل کرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے مین اسی قسم کی ایک صورت پیش آئی تو آپ نے فرمایا،

هلا وضعتم فيهم السلاح (بدائع) تم نے لوگون کے درمیان ہتھیار کو کیون نہ ڈالا،

پانی کی وہ قسم جو بک سکتی ہے | یعنی پانی کی چوتھی قسم یعنی جب برتنون یا مشکون مین پانی بھر لیا گیا ہو تو اس قسم کے پانی مین انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے، صاحب بدائع لکھتے ہین کہ اب اس پانی کی حیثیت ایسی ہو گئی کہ

كما استولى على الحطب والحشيش والصيد، کوئی (جنگل) کی لکڑیون اور گھاس اور شکار پر قابو پائے (تو وہ اس کی ملک بن جاتا ہے)

کہ ان چیزون سے استفادہ کا حق اگرچہ پبلک کے ہر فرد کو حاصل ہے لیکن جب ان پر کسی کا قبضہ ہو گیا تو قبضہ کرنے والے کی وہ ملک ہو جاتی ہین اسی طرح برتن اور مشک کا پانی بھی مملوک ہو جاتا ہے،

فيجوز بيعه، اور ایسی صورت مین (مشک و برتن وغیرہ) کے پانی کا فروخت کرنا بھی جائز ہے)

اس قسم کے پانی کی بیع و فروخت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ

السقائين يبيعون المياء المحرزة في الظروف بهجرت العادة في الامصار في سائر الاعصار من غير نكير، (بدائع) برتنون مین جس پانی کو محفوظ کر لیا گیا ہو، اس کو بہشتیون کی جماعت ہمیشہ بیچتی رہی ہے، تمام شہرون اور ملکون مین اس کا عام رواج ہے اور کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا،

اس لئے اس پانی کے متعلق حکم ہے کہ

فلم یحل لاحد ان یاخذ منه شیئا بغیر اذنه، — جائز نہ ہوگا کہ پانی کے مالک کی اجازت کے بغیر کوئی اوس کو لے اور پئے،

البتہ ایسی صورت میں کہ پیاس سے کسی کی جان پر بن آئے، اور دوسرے کے برتن میں زائد از ضرورت پانی ہو تو غیر مسلح لڑائی کرکے پانی زبردستی چھین کر پی سکتا ہے،

شدید ضرورتوں کی چیزوں میں اشتراکیت کا نقطۂ نظر — اور یہ حکم کچھ پانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہلاکت کے اندیشہ کی صورت میں زائد از ضرورت چیز دوسرے سے آدمی زبردستی چھین کر استعمال کرسکتا ہے، خواہ کھانا ہو یا اسی قسم کی دوسری چیز، ہدایہ میں ہے کہ

وکذا الطعام عند اصابة المخمصة (جلد ۴ صفحہ ۳۸۵) — یعنی یہی حکم کھانے کا بھی ہے شدت بھوک میں،

حلوکہ پانی میں بھی اشتراکیت کا اثر — لیکن پانی برتن ہی والا کیوں نہ ہو، حدیث میں چونکہ (الماء) مطلق پانی میں عام لوگوں کو شریک قرار دیا گیا ہے، اس لئے فقہاے اسلام نے یہ فیصلہ کیا ہے، کہ بلا ضرورت اگر کسی کی مشک یا برتن سے آدمی پانی چرالے تو چوری کی شرعی سزا قطع ید کا حکم اس پر نہ لگایا جائے گا، خواہ اس پانی کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو جس کے چرانے پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے، ہدایہ میں ہے،

لو سرقه الانسان موضع یعز وجوده وهو یساوی نصابا لم تقطع یده — اگر کسی ایسے مقام میں جہاں پانی مشکل سے میسّر آتا ہو، اور اگر کوئی (برتن کا) پانی چرالے تو چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا، خواہ پانی کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو جس پر ہاتھ کٹتا ہو،

(کتاب الشرب جلد ۴ صفحہ ۳۵۶)

کیونکہ بہرحال ایک گونہ شرکت کا شبہہ اس میں پیدا ہوگیا ہے، اور شبہہ سے اس قسم کی سزائیں ٹل جاتی ہیں،

مچھلیون کا حکم پانی ہی کے ذیل مین مچھلیون کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ جس طرح ہوا کے پرندون کا کوئی مالک نہین ہے، اور جو ان پر قبضہ کرے گا، وہی مالک ہو جاتا ہے محض اس لئے کہ کسی کے تالاب یا باغ یا کھیت مین یہ پرندے چرتے چگتے ہین، یا رہتے ہین، یا آتے جاتے ہین، کوئی ان کو فروخت نہین کر سکتا، حتیٰ کہ حکومت کو بھی اس کا اختیار نہین ہے، کہ اس قسم کی خشکی یا تری کے جانورون کو کسی کی انفرادی ملکیت قرار دے، غایہ شرح ہدایہ مین ہے،

الامام لا یملك ان یخص واحداً	امام (حکومت) کو اس کا اختیار حاصل نہین
دون واحد بذلك حتی لو امر احداً	ہے، کہ کسی خاص شخص کو ان امور کی خصوصی ملکیت
ان یاخذ شیئاً............	عطا کرے تا آنکہ اگر کسی کو امام حکم دے کہ فلان
............صید البعینه	خاص شکار کو پکڑ لے خواہ خشکی کا ہو یا دریا کا،
من بر او بحر لا یملك المامور قبل	تو جسے حکم دیا گیا ہے وہ شکار پکڑنے سے پہلے
الاخذ الاصطیاد (ہدایہ ج جلد ۲ ص ۳۳)	اس شکار کا مالک نہین ہو سکتا،

سوال ہوتا ہے کہ جب ہوا کے جانورون کا یہ حکم ہے تو مچھلیان جن کی حیثیت پانی مین وہی ہے جو ان وحشی پرندون کی ہوا مین ہے، ان کو بھی کوئی بیچ سکتا ہے یا نہین، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج مین ایک خاص باب اس مسئلہ مین باندھا ہے، خود ان کا اور امام ابو حنیفہ وغیرہ کا خیال یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز نہین ہے، لیکن اس کی وجہ یہ نہین ہے، کہ یہ غیر مملوک شئ کی بیع ہے، بلکہ ممانعت کا سبب یہ بتایا گیا ہے، کہ خریدار کے متعلق دھوکہ کھا جانے کا اندیشہ ہے کہ پانی کے اندر کا حال اس کو کیا معلوم ہو سکتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ فتویٰ قاضی صاحب نے نقل کیا ہے کہ

لا تبایعوا السمك فی الماء فانه غرر،	مچھلی کو پانی کے اندر نہ بیچا کرو کہ اس میں دھوکہ ہے،

اسی قسم کے الفاظ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہین لیکن اسی کے مقابلہ مین حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے اسی کتاب الخراج مین یہ بھی مروی ہے کہ برس نامی مقام مین جو مَن مین واقع ہے،

انه وضع علی اجمة برس اربعة آلاف درهم وكتب لهم كتابا فی قطعة أدم (کتاب الخراج ص ۹۵)

برس نامی مقام کے اجمہ (آبی نیستان) پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چار ہزار درہم مشخص فرمایا اور چمڑے کے ایک ٹکڑے پر ان کو اس کا پٹہ لکھ کر دیا، (اجمہ کے لفظ کی تحقیق آگے آرہی ہے)

صرف یہی نہین کہ حکومت نے اس خزانہ آب کو چار ہزار درہم مین بند وبست کیا، بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیز رض سے بھی اس کتاب مین یہ مروی ہے کہ عبد الحمید بن عبد الرحمن نے جو ان کے صوبہ دار تھے اونھون نے

يسئله عن بيع صيد الآجام

آجام (آبی نیستانون) کے شکار کے متعلق دریافت کیا کہ کیا ان کو فروخت کیا جائے،

جواب مین عمر بن عبد العزیز نے فرمان بھیجا،

ان لا باس به وسماه الحبس (کتاب الخراج ص ۱۱)

اس کے فروخت کرنے مین کوئی مضائقہ نہین ہے اور اس کا نام اونھون نے الحبس رکھا،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالاب کی مچھلیون کے متعلق ابتداء سے کچھ اختلاف چلا آتا ہے، خود قاضی ابو یوسف نے بھی لکھا ہے، کہ اگر کسی ایسے گڑھے مین مچھلی ہو جو بغیر شکاری تدبیرون کے ہاتھ آجائے تو اوس کے بیچنے مین حرج نہین بلکہ آگے بڑھ کر ان کے الفاظ یہ بھی ہین،

ومثله اذا كان يوخذ بغير صيد كمثل سمك فی الجب، (کتاب الخراج ص [illegible])

اور یہی حال ان مچھلیون کا ہے، جو بغیر شکاری تدبیرون کے پکڑی جاتی ہون، جیسا کہ ان مچھلیون کا بیچنا جائز ہے، جو کنوئین مین ہون

ان تمام اقوال کے دیکھنے سے فیصلہ کی صورت یہی معلوم ہوتی ہے، کہ سمندروں، دریاؤں، ندیوں وغیرہ
مچھلیاں جو بند اور محدود پانی میں نہیں رہتی ہیں، ان کو نہ حکومت بیچ سکتی ہے، اور نہ شکار کرنے سے پہلے کوئی
بیچ سکتا ہے، بلکہ وہ عام پبلک کی چیز ہے، ملک کے ہر باشندہ کو ان کے شکار اور ان سے استفادہ کا حق ہو،
بتہ اگر محدود اور بند پانی مثلاً تالابوں وغیرہ میں ہوں تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ
فتویٰ کے مطابق ان کے فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں، خصوصاً ایسی مچھلیاں جنھیں اس زمانہ میں لوگ
پنے مخصوص تالابوں میں خرید کر پالتے ہیں، یعنی ان کے بچے جنھیں زیرہ کہتے ہیں، خرید کر تالابوں میں چھوڑ دیتے ہیں
بلکہ قبضہ کرنے اور مملوک بنانے کے بعد ان کو تالابوں میں چھوڑا جاتا ہے، بظاہر ان کے فروخت میں کوئی مضائقہ
ہیں، لیکن آبادیوں کے اطراف و جوانب کے تالابوں یا جوہڑوں میں جو قدرتی خودزائیدہ مچھلیاں پائی جاتی
ہیں، اگر زمیندار اور جاگیر داران کو گاؤں کے عام باشندوں کو شکار کر لینے کے بغیر کسی معاوضہ کی اجازت دیدیا کریں
کم از کم حنفی مذہب کے رو سے اسلام نے عوام کا جو معاشی حق قائم کیا ہے، اس سے محروم کرنے کے وہ مجرم نہ ہونگے

مچھلیوں کے سوا دوسری آبی پیداواروں کا حکم

مچھلیوں کے ساتھ سمندر، دریا، ندی وغیرہ کی دوسری پیداواروں کا بھی سوال اسلامی فقہ میں اوٹھایا گیا ہے، ہمارے امام ابو حنیفہ کا تو کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ خواہ
س قسم کی چیز بھی ہو اس کی کتنی ہی قیمت ہو مثلاً عنبر ہو یا موتی ہو، یا اس کے سوا کوئی اور چیز ہو، سب کا حکم وہی ہے
مچھلیوں کا ہے، یعنی ملک کے عام باشندوں کا وہ مشترک سرمایہ ہے، جس کا جی چاہے انھیں نکال سکتا ہے
ور فائدہ اٹھا سکتا ہے، حکومت تک کو اس سے کسی قسم کے محصول لینے کا حق نہیں ہے، قاضی ابو یوسف نے اس
کا بھی کتاب الخراج میں ایک مستقل باب باندھا ہے، اور لکھا ہے کہ

قد کان ابوحنیفۃ وابن ابی لیلی	ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں کا خیال تھا
یقولان لیس فی شیئ من	کہ سمندری پیداواروں (مثلاً عنبر موتی وغیرہ)
ذالک شیئ لانہ بمنزلۃ	میں سے کسی پر کوئی محصول یا ان کی قیمت نہیں

السمك،

وصول کیجا سکتی اُن سب کا وہی حکم ہو جو مچھلی کا ہے،

لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک فرمان کی بنا پر قاضی ابو یوسف نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ دریا کی وہ چیزیں جو بطور زیور یا خوشبو کے استعمال ہوتی ہیں، (مثلاً موتی مرجان عنبر وغیرہ) اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، ان کا خیال ہے کہ

فی ذالك خمس واربعة اخماسه لمن اخرجه،

حکومت ان پیداواروں سے خمس (پانچواں حصہ) وصول کرے گی، اور باقی چار خمس (پنجے) اس شخص کے ہوں گے جس نے اسے نکالا۔

لیکن ان کے سوا اور تمام چیزوں کے متعلق ان کا بھی وہی خیال ہے جو امام کا ہے، خود فرماتے ہیں:-

امّا فی غیرها فلا شیء فیه،

جو چیزیں بطور زیور (حلیہ) اور خوشبو کے استعمال ہوتی ہیں، ان کے سوا سمندر کی اور چیزوں پر کچھ نہیں ہے،

حضرت عمرؓ کے جس فرمان سے اُنھوں نے حلیہ اور عنبر کو مستثنیٰ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ یعلیٰ بن امیۃ کو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحر (سمندر) کے علاقوں یا بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تھا، یعلیٰ نے بارگاہ خلافت میں یہ لکھ کر پوچھا،

عنبرة وجدها رجل یسئله عنها وعمّا فیها

عنبر (مچھلی جس سے عنبر نکلتا ہے) ایک شخص کو ملی ہے وہ اس مچھلی اور جو کچھ اس کے اندر سے برآمد ہوگا اس کے متعلق پوچھتا ہے،

جواب میں یہ فرمان گیا کہ

فیما اخرج اللہ جلّ شانہ من

سمندر سے اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو برآمد کرتے ہیں

ان میں خمس (پانچواں حصہ) حکومت کا حق ہے، (کتاب الخراج)	الخمس

اس فرمان کے راوی ابن عباسؓ ہیں، خود بھی فرماتے ہیں :-

اور میری بھی یہی رائے ہے،	وذالک رائی،

بہرحال یہ سارے مباحث تو الما، (یعنی پانی) کے تھے جس میں آنحضرتؐ نے ملک کے عام باشندوں کو شریک قرار دیا ہے، گزشتہ بالا مسائل گویا اسی اشتراکی نظریہ کی تفصیل تھی،

سیال معدنیات کے احکام | پانی اور پانی کے خزانوں اور چشموں کے ذیل میں چونکہ بعض سیال "معادن" کو فقہائے اسلام نے اسی ذیل میں شمار کیا ہے، حتی کہ قاضی ابو یوسف نے تو کتاب الخراج میں صاف طور پر لکھدیا ہے کہ

جہاں تک میں جانتا ہوں مٹی کے تیل (نفط)	لیس فی النفط والقیر والزئبق و
اور قیر (تارکول) مومیائی میں کچھ نہیں ہے	المومیاان کان لشیئ من ذالک
بشرطیکہ زمین سے ان کا کوئی چشمہ ابلتا ہو	عین فی الارض شیئ نعلمہ کان
خواہ یہ چشمے عشری زمین میں ہوں یا	فی ارض عشر او فی ارض خراج
خراجی زمین میں،	(کتاب الخراج ص ۹۲)

لیکن یہ ایک اجمالی بیان ہے ورنہ جیسے پانی کے مختلف اقسام کے مختلف احکام تھے، ان معدنی چیزوں کا بھی یہی حال ہے گنجایش کی حد تک ضروری مسائل درج کئے جاتے ہیں، اس مسئلہ کا پہلے بھی کچھ ذکر آچکا ہے لیکن اس وقت ہم اس کو شرح الکبیر للمقنع الحنبلی سے نقل کرتے ہیں، اس میں ہے :-

ایسے معادن جنھیں معادن ظاہرہ کہتے ہیں،	لا تملک المعادن الظاهرة
مثلاً نمک اور قار (تارکول) سرمہ گچ نفط (مٹی	کالملح والقار والکحل والجص
کا تیل) وغیرہ کے معدنوں کا کوئی شخص	والنفط بالاحیاء ولیس للامام
ذاتی طور پر مالک نہیں ہوسکتا، نہ احیاء اور آباد	اقطاعه (ج ۶)

نہ کوئی شخص آباد کرکے ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے اور نہ حکومت کو حق ہے، کہ کسی خاص شخص کی شخصی جاگیر میں اُن

یہ تو متن کی عبارت ہے شرح اس کی یہ کی گئی ہے کہ

المعادن الظاهرة وهي التي يوصل الى ما فيها من غير مؤنة ينتابها الناس وينتفعون بها كالملح والكبريت والقير والمومياء والنفط والكحل والياقوت ومقاطع الطين واشباه ذالك لا يملك بالاحياء ولا يجوز لاحد من الناس ولا احتجازه دون المسلمين لان فيه ضرر المسلمين وتضييقا عليهم،

ایسے معادن جو ظاہری معادن کہلاتے ہیں جن کی تعریف یہ ہے کہ ا ان تک بغیر کسی محنت ومشقت کے رسائی ہوتی ہو، ۲ لوگوں کی اس پر آمد ورفت جاری ہو ۳ اور اس سے عام لوگ نفع اٹھاتے ہوں، مثلاً نمک گندھک قیر، (تارکول) مومیائی، نفط (مٹی کا تیل)، سُرمہ، یاقوت مٹی نکالنے کی جگہ (لسٹکور) اور اسی قسم کی چیزیں آباد کرکے بھی کوئی ان کا مالک نہیں ہوسکتا، اور نہ کسی کے لئے ایسا کرنا جائز ہے، اور نہ یہ درست ہے کہ عام مسلمانوں کو اُن سے استفادہ سے روکا جائے کیونکہ مسلمانوں کا نقصان ہے، اور ان پر تنگی و ضیق عائد کرنا ہے،

(المغنی لابن قدامہ ج ۶ ص ۱۵۷)

(باقی)

تاریخ فقہ اسلامی

مصری عالم خضری کی تصنیف التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہاء پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہے جس سے یہ فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے، حجم ۴۰۰ صفحے قیمت سے ر

منیجر

کلام اقبال کی دقیتن

اور

ان کی تشریح کی ضرورت

از

جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ لکچرار یونیورسٹی، اورنٹیل کالج، لاہور

(۲)

اقبال کے اہم علمی مسائل کی تشریح

مطالعۂ اقبال سے پہلے بطور تمہید، مقدمے یا دیباچے کی صورت مین ان اہم علمی مسائل کا مختصر اور سادہ تجزیہ ہونا چاہئے، جن سے پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ بلکہ سب کتابین لبریز ہین حکماے مشرق کی طرح اقبال نے حکماے مغرب سے بھی بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، اس لئے کلام اقبال مین جابجا مشرقی اور مغربی حکمت کے بعض مسائل کی طرف اشارات ہین، بعض اشعار مین کسی اسلامی یا مغربی حکیم کی پوری حکمت کا خلاصہ بیان ہوا ہے، کہین کہین خاص خاص علمی اصطلاحات ہین، عام مطالعہ کرنے والے عموماً صرف لطف زبان سے لذت گیر ہوکر آگے چل دیتے ہین، اور شعر کے اصلی مفہوم سے ناواقف رہتے ہین، اس لئے اس قسم کی علمی اصطلاحون اور فلسفہ وحکمت کے مسائل ونکات کی آسان تشریح ابتدائی لوازم مین سے ہے، اس کی تشریح کے لئے دو مثالین پیش کیجاتی ہین، اقبال نے پیام مشرق کے باب "نقش فرنگ" مین "صحبت رفتگان" کے عنوان سے ایک مکالمہ لکھا ہے جس میں بعض حکماے جدید وقدیم نے اپنے اپنے مسائل کا تذکرہ ایک ایک دو دو شعرون مین کیا ہو، ان میں سب سے پہلے ٹالسٹائے، پھر کارل مارکس، پھر ہیگل، پھر مزدک، اور اس کے بعد کوہکن لب کشا ہوکر اپنا

اپنا فلسفہ بیان کرتے ہیں ہیگل کہتا ہے :۔

جلوہ دہد باغ و زاغ معنیٔ مستور را / عین حقیقت نگر حنظل و انگور را

فطرتِ اضداد خیز لذتِ پیکار داد / خواجۂ دمزدور را آمر و مامور را

ان اشعار کے ساتھ ہیگل کے مخصوص فلسفۂ جدل و پیکار کی شرح کس قدر ضروری ہو جاتی ہے، اسی طرح ذیل کے اشعار میں برگسان کی حکمت کا جو خلاصہ موجود ہے، اس کو نمایاں اور متعین کرنے کی ضرورت ہے

پیغام برگسان کے عنوان سے یہ اشعار پیام مشرق میں ہیں،

تا بر تو آشکار شود راز زندگی / خود را جدا ز شعلہ مثالِ شرر مکن

بہر نظارہ جز نگہِ آشنا میار / در مرز و بوم خود چو غریبان گذر مکن

نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است

عقلے بہم رسان کہ ادب خوردۂ دل است

آخری مصرع میں برگسان کا فلسفۂ الہام و تجلی بیان ہوا ہے، اس کے سمجھنے کے لئے برگسان کے خیالات کا ایک خلاصہ کتاب میں ہونا ضروری ہے، پیام مشرق میں ایک دوسرے مقام پر حکماے مغرب کی حکمت کا بیان ایک ایک شعر میں ہوا ہے :۔

لاک	ساغرش را سحر از بادۂ خورشید فروخت	ورنہ در محفلِ گل لالہ تہی جام آمد
کانٹ	فطرتش ذوق مئے آئینہ فامے آورد	از شبستانِ ازل کوکب جامے آورد
برگسان	نہ مئے از ازل آورد، نہ قامے آورد	لالہ از داغِ جگر سوز دوامے آورد

اس کے بعد بعض شعراء کے پیغام کی خصوصیت ان اشعار میں بیان ہوئی ہے :

برونگ	بے پشت بو سو بادۂ پُرجوشِ زندگی	آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم
بائرن	از منتِ خضر نتوان کرد سینہ داغ	آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب | تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

رومی | آمیزشے کجا گہر پاک او کجا از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

ان اشعار میں ہر شاعر کی شاعری کا لب لباب موجود ہے، جس کو مبتدی رہنمائی کے بغیر سمجھنے سے قاصر رہینگے، اس کے علاوہ حکمت، فلسفہ، فقر، سیاسیت، اجتماعیات، مذہب اور روحانیت سے متعلق بیسیوں اشارے کلام اقبال میں اس انداز سے آجاتے ہیں کہ ان کی ماہیت معلوم کئے بغیر، مطالعہ کرنے والا آگے نہیں بڑھ سکتا، مثلاً خودی کا سرسری مفہوم، جہاد اور کش مکش کا ابتدائی تصور، فقر اور اس کی عارفانہ تشریح، عشق، جمال اور جلال کی تعبیر، تقدیر اور توحید کے معانی، جمہوریت، آمریت اور اشتراکیت کی مجمل تعریف، فلاسفۂ یورپ کے خیالات کا خلاصہ، ان تمام امور و مسائل کے تمہیدی پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے، ورنہ اصحاب علم و نظر کے علاوہ، عام مطالعہ کرنے والوں کے بیشتر طبقات کلام اقبال کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ فکر اقبال درحقیقت خواص اور علماء کے غور و فکر کے لئے ہے، عوام تشریح و تعبیر کے بغیر اس سے متمتع نہیں ہو سکتے،

میں اس سلسلے میں ناظرین کرام کو خودی کے تصور کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، تصوف نے آج تک "خود" کو مٹانے اور خودی کو فنا کرنے کی تلقین کی ہے، حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیر فرماتے ہیں،

با ما بسیہ نشین و با خود منشین

لسان الغیب حافظ فرماتے ہیں :-

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

ہمام تبریزی بھی اس قسم کا خیال ظاہر کرتے ہیں :-

درمیان من و محبوب حجاب است ہمام باشد آن روز کہ آن ہم ز میان برخیزد

نفی خودی تصوف کا بنیادی عقیدہ ہے، کیونکہ خودی کا احساس صوفیہ کے نزدیک ایک گناہ ہے؛

وَجُودُكَ ذَنبٌ لَا يُقَاسُ بِهَا ذَنبٌ

اس عقیدے کی بنیاد اس خیال پر قائم ہے کہ انسان دراصل گلشن قدس کا ایک پھول تھا، اور ذاتِ باری کا جزو تھا، اﷲ تعالیٰ کے شوقِ ظہور نے دنیا کو پیدا کیا، اور انسان کو اس نئی بستی کا حاکم اور مالک بنایا، گویا کُل نے جزو کو عارضی طور پر اپنے آپ سے الگ کر دیا، اب یہ جزو کُل سے ملنے کے لئے بیقرار ہے، جب تک حجابِ جسمانی موجود ہے، یہ جزو کُل سے ہم کنار نہیں ہو سکتا، لہذا صوفیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خود کو مٹانا ہی تمام مسرتوں کا سرچشمہ اور راحتوں کا منتہا ہے، اس خیال کو تمام صوفی شعراء بڑی قوت اور بڑے جوش کے ساتھ ظاہر کرتے آئے ہیں،

خواجہ حافظ فرماتے ہیں :-

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود　　　آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

نظیری کی پہلی غزل بھی اسی مضمون کی حامل ہے،

درآں گلشن ہوا بودم کہ مستی زاد از نرگس　　　دراں مجلس صفا بودم کہ عشق از حسن شد پیدا

بزحمت اتصال افتد چو پیوندے برید از ہم　　　کہ بفرصت قطرہ دریا می شود چوں قطرہ شد دریا

رومی کی مثنوی کے ابتدائی اشعار کا مضمون بھی یہی ہے،

از نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ دارم شرحہ شرحہ از فراق　　　من چہ گویم شرح دردِ اشتیاق

تصوف کے اس عقیدے کا اثر اس قدر گہرا اور ہمہ گیر ہے کہ خود علامہ اقبال نے اپنی ابتدائی نظموں میں یہ رنگ قبول کیا، اور یہی صوفیانہ نے نکالی، چنانچہ ایک نظم میں فرماتے ہیں،

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی　　　شامِ فراقِ صبح تھی میری نمود کی

وہ دن گئے کہ قید سے مین آشنا نہ تھا زیب درخت طور میرا آشیانہ تھا وغیرہ

اس سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ خود کو جو کل وجز مین تفریق کا سبب ہو مٹانا تصوف کے مسائل مہمہ مین سے ہے، اس کے برعکس اقبال نے خودی اور بیخودی کا ایک نیا تصور ہمارے سامنے رکھا ہے، جس کا مفہوم معاشیاتی، نفسیاتی، سیاسی یا عمرانی ہے، اسرار خودی سے لیکر ارمغان حجاز تک سب کتابون مین یہ تصور روح روان کا درجہ رکھتا ہے، جس طرح گوشت کو ناخن سے جدا نہین کیا جا سکتا، اسی طرح تصور خودی کو اقبال کے نظام فکر سے الگ نہین کیا جا سکتا، خودی کا یہ تصور بظاہر تصوف کے عقیدۂ خودی کے بالکل ضد ہے، اگر صوفی خود کو مٹا کر کمال کی معراج پر پہنچنے اور پہنچانے کا مدعی ہے، تو اقبال خودی کی تربیت کے ذریعے شرف انسانیت کو اعلیٰ مدارج سے روشناس کرانے کا دعوے دار، ایک کے نزدیک خودی کی موت میں حیات ہے، اور دوسرے کے نزدیک خودی کی تربیت مین زندگی اور اس کی موت مین ممات ہے، یہ ایک تضاد ہے، اور بہت بڑا تضاد ہی جس کو رفع اور دونون مسائل کا ابتدائی تجزیہ کرنا مطالعۂ اقبال کی تسہیل کے لئے ضروری مبادی میں سے ہے،

مندرجۂ بالا تصریحات سے ایک اور ضروری سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اقبال تصوف کو کس نظر سے دیکھتے ہین، کلام اقبال کے ناقص مطالعہ کی وجہ سے ایک خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ اقبال تصوف کے مخالف تھے، لیکن کیا یہ خیال صحیح ہے ؟ مین سمجھتا ہون کہ مروجہ تصوف کے بعض بیمار اور ناقص پہلوؤن سے قطع نظر ہماری تہذیب اور ہمارے علوم بہت بڑی حد تک صوفیون کے اثرات حسنہ کے رہین منت ہین، یہان تک کہ علمائے ظاہر نے مذہب اور دین کی جتنی خدمت کی ہو صوفیاے کرام نے کسی طرح اس سے کم خدمت انجام نہین دی، انھون نے لوگون کو ایمان وایقان کی دولت سے بہرہ ور کیا ہے، یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ امام ابن تیمیہ جو تصوف کے بڑے مخالف خیال کئے جاتے ہین، وہ بھی علامہ ابن قیم کے بقول تصوف کی روح کے منکر نہ تھے، (ملاحظہ ہو اغاثۃ اللہفان اور مدارج السالکین)

پھر کیا علامہ اقبال اس تصوف کے مخالف ہو سکتے ہیں ؟ میرے خیال میں اقبال کے متعلق یہ رائے قائم کر لینا کسی طرح بھی درست نہیں، لیکن مسائل اقبال کی تنقیدی تشریح کے بغیر اس قسم کی بیسیوں غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے،

علامہ اقبال تمام برگزیدہ صوفیوں کے مداح تھے، اور ان میں بعضوں کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے جو ان کے کلام میں موجود ہے، لیکن آخری عمر میں منصور حلاج کی نسبت اُن کا جذبۂ تحسین بہت بڑھ گیا تھا، اس کی کتاب کتاب الطواسین اقبال کی محبوب کتابوں میں سے تھی، یہ امر بھی دوسرے بہت سے مسائل کی طرح قابلِ تشریح ہے، کہ اقبال اپنی شخصیتوں میں منصور کو اتنا اہم درجہ کیوں دیتے ہیں ؟

میں نے اقبال کے مسائل ہمہ کی تشریح کے سوال کو اس لئے زیادہ اہمیت دی ہے، کہ ان کے صحیح اور معین تصور کے بغیر فکر اقبال مبہم ہو کر رہ جاتا ہے، اور مطالعہ کرنے والے سب کچھ پڑھ چکنے کے بعد بھی کہتے ہیں؛

ع حیرت اندر حیرت است و مشکل اندر مشکل است

اقبال کے سرچشمہ ہائے فیض علامہ اقبال نے جن مآخذ سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کی فہرست طویل ہے، ان مآخذ میں کلام اللہ اور سنت رسول اللہ کے علاوہ بہت سے قدیم و جدید اسلامی و مغربی مفکرین کی کتابیں بھی شامل ہیں، مگر اس وسیع استفادے کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا، کہ اقبال نے اپنی حکمت کی اساس اسلام کے عقائد و اصولیہ اور حکماے اسلام کی حکمتِ عالیہ پر رکھی ہے، Humphry Trevelyan نے اپنی کتاب "Popular Background to Goethe's Hellenism" میں گوئٹے کے متعلق لکھا ہے:-

"For good or ill, Goethe could not get away from the Greeks" (Introduction, ix)

حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے کو حکماے یونان سے جو وابستگی تھی، اس سے ہزاروں درجہ زیادہ دلبستگی اقبال کو

فکرِ اسلامی سے تھی، انھوں نے ۱۹۲۶ء میں علوم اسلامیہ کے نصاب کے متعلق صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم کے نام جو خط لکھا تھا، اوس سے ایک طرف ان کی اس محبت اور شیفتگی کا پتہ چلتا ہے، جو انہیں علوم اسلامیہ سے تھی، اور دوسری طرف اس ذہنی اور مذہبی نصب العین کی تعیین ہوتی ہے، جو علامہ کے پیش نظر تھا، وہ چاہتے تھے کہ اسلامی تمدن اور موجودہ علوم کے درمیان حیاتِ دماغی کے تسلسل کو قائم رکھا جائے اور دماغی اور ذہنی کاوش کو ایک نئی وادی کی طرف ممیز کیا جائے، اور ایک نئے دینیات و کلام اور حکمت کی تعمیر و تشکیل میں اس کو بروئے کار لایا جائے، اس غرض کے لئے اونھوں نے جن جن شعبوں کے قیام کی تجویز پیش کی ہے اور جن جن کتابوں کے نام گنائے ہیں، ان سے علامہ کی پسند و ناپسند کا بخوبی پتہ چلتا ہے، علامہ کے خیال میں ان علوم کے بغیر نہ ملت کی روحانی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، نہ نئی نسلوں کا ذہنی اور روحانی مطمح نظر ہی معین ہو سکتا ہے، اور نہ کسی خالص اسلامی تہذیب اور نظام فکر کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے، علامہ نے اپنی زندگی میں اس نصب العین کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کی، ان کے افکار اور کلام میں علوم اسلامیہ کا بہترین خلاصہ موجود ہے، جو شاعرانہ زبان میں ہونے کی وجہ سے اگرچہ تلمیحی اور ایمائی حیثیت رکھتا ہے لیکن اربابِ فکر ان اشارات و کنایات کو کسی قدر کوشش کے ساتھ پوری طرح پھیلا سکتے ہیں، میری رائے میں ان علوم سے ابتدائی واقفیت کے علاوہ ہمارے لئے ان حکمائے اسلام اور صوفیائے کرام کے عقائد کا جاننا بھی ضروری ہے، جن کے سرچشمۂ فیض سے فکرِ اقبال سیراب ہوتا رہا،

رومی ان میں سب سے پہلا نام مولانائے روم کا ہے، فکرِ اقبال کے مآخذ میں رومی کو سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے، اقبال رومی کو اپنا ہادی اور پیشوا خیال کرتے ہیں، اور بار بار اعلان کرتے ہیں، کہ میرے میکدے کی شراب دراصل پیر روم کے خمستان کی حاصل کردہ ہے، اقبال زندگی کے اسرار کی نقاب کشائی کرتے ہیں، مگر اس انکشاف کا سہرا اپنے مرشد رومی کے سر باندھتے ہیں، یہی رومی جاوید نامہ کے زندہ رود کے لئے خضر راہ بنتے اور اسے آسمانی دنیا کی طلسماتی فضا کی سیر کراتے ہیں، اور جب حکیم مشرق زندگی کے کام کی تکمیل کر چکنے کے بعد اقوامِ شرق کو آخری

پیغام دیتا ہے. تو اس وقت اسی حکیم کی روح ندائے سروش بن کر مژدۂ انقلاب لاتی ہے، یہ مولانا جلال الدین الرومی ہی ہیں، جو اقبال کی نظر میں کلیم بھی ہیں، اور حکیم بھی، مجدد بھی ہیں اور مصلح بھی، شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی، ولی بھی ہیں اور مجذوب بھی، طریقت کے دشوار گذار راستوں کے راہبر بھی ہیں، اور حقیقت کے مرحلوں کے ہادی بھی، شریعت کے غوامض کے عقدہ کشا بھی ہیں، اور حکمت کے دقائق کے شارح بھی، غرض اقبال کے نزدیک ہماری موجودہ "کرم خوردہ" ملت کے تمام روحانی اور ذہنی امراض کو شفا بخشنے والا رومی ہے جس کی تعلیمات کو اقبال نے اپنے افکار میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ استغراق اس درجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو "مثیل رومی" قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک عہد قدیم میں رومی ملت کے لئے پیغام حیات لائے تھے، اور اس پرآشوب دور حاضر میں وہ خود اس کے مبلغ اور داعی ہیں،

اقبال کے نزدیک رومی کی زندگی اور ان کی حکمت کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کے پیش نظر فکر رومی کی تدوین اور تشریح کرنا ہمارے لئے حد درجہ ضروری ہے تاکہ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کو رومی کی صحیح عظمت کا احساس ہو سکے، رومی کے فلسفے کی ممتاز خصوصیات سے دنیا کو روشناس کرائیں، ان کے امتیازات اور دور جدید پر اس کے اثرات دکھانے کی کوشش کریں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے رومی کے ان اشعار کی تشریح کی ضرورت ہے، جو علامہ کی تصنیفات میں بڑی کثرت کے ساتھ آئے ہیں تاکہ علامہ کے خیال کا سیاق و سباق سمجھ میں آسکے، مبتدیوں کے لئے اگرچہ اتنا ہی کافی ہے، لیکن اہل علم کا کام اس پر ختم نہیں ہو جاتا، اس سے رومی کے عمیق مطالعہ کی وسیع شاہراہیں ہمارے سامنے کھلتی ہیں، جو مطالعۂ اقبال کی نہایات میں سے ہے، خود علامہ نے بار بار ہمیں فکر رومی کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کی ترغیب دی ہے :-

گسستہ تار ہے تری خودی کا ساز ابتک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز ابتک

اب تک جس قدر مضامین لکھے جا چکے ہیں، ان میں اقبال اور رومی کے مشترکہ خیالات پر بہت کم روشنی

ڈالی گئی ہے، جہان تک مجھے معلوم ہے، شاید ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم ہی ایک ایسے شخص ہین، جنھون نے اپنے مضمون "رومی نطشے اور اقبال" مین واضح طور پر ان خاص تصورات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، جو اقبال نے رومی سے اخذ کئے ہین، اسی طرح چند اور بزرگون نے بھی اشارۃً اور ضمناً اس بنیادی مسئلے کی طرف توجہ کی ہے، لیکن اس اہم بالشان بحث کے متعلق یہ اختصار بالکل ناکافی ہے، کیونکہ فکرِ رومی کی تجدید و ترویج ہی علامہ اقبال کے مقاصد زندگی مین تھی، ایسی حالت مین کیا شارحینِ اقبال کا سب سے ضروری فریضہ نہیں کہ وہ فکرِ اقبال کے طالبین کو حکمتِ رومی کے امتیازات سے روشناس کرین، تاکہ وہ اس کی روشنی مین علامۂ اقبال کے افکار سے پوری طرح سے آگاہ ہو سکیں، مشرق مین مولانائے روم کی مثنوی کو ابتدا سے اس قدر تقدس حاصل رہا ہے کہ عقیدت مندون نے اُسے قرآن در زبانِ پہلوی کا خطاب دے کر آنکھون اور دلون مین جگہ دی، ایران، ترکی، عرب، اور ہندوستان مین مثنوی کی بیسیون شرحین لکھی گئین، علی الخصوص ہندوستان مین مطالعۂ رومی کی طرف جتنی توجہ ہوئی، اس کے مقابلہ مین شاید ہی کسی اور کتاب کو پیش کیا جا سکے، عبد اللطیف عباسی کی لطائف المعنوی، نواب شکر اللہ خان خاکسار کی شرح، ملا ایوب پارسا لاہوری، ملا سعید، محمد عابد اور مولانا محمد افضل الہ آبادی کی شرحین اور بالآخر ملا بحر العلوم کی تفسیر مثنوی اُن چند ممتاز شرحون میں سے ہین، جو مثنوی رومی کے مطالعہ کے سلسلہ میں تحریر مین آئین، مثنوی رومی کے مطالعہ کی طرف سب سے زیادہ توجہ ہندوستان مین اورنگزیب عالمگیر کے زمانے مین ہوئی، نواب عاقل خان رازی میر عسکری کو اسرارِ مثنوی کے حل کرنے مین خاص مہارت حاصل تھی، اس امیر کے زیر اثر مطالعۂ رومی کے شوق و ذوق کو بڑی ترقی ہوئی، عہدِ عالمگیری جیسا کہ باخبر حضرات سے پوشیدہ نہین، شدید سیاسی کشمکش کا زمانہ تھا جس میں ہندوستانیون کے طبائع شورش اور روحانی آشوب کی مخالفتون سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسی نوشدارو کی جستجو مین تھے، ہیجان و اضطراب کے ان ایام مین شاید مطالعۂ رومی ہی وہ نوشدارو تھا، جس کے استعمال سے عہدِ عالمگیری کے لوگ اطمینان قلب حاصل کرتے تھے،

پس علامہ اقبال نے ارشاد و ہدایت کے لئے جس برگزیدہ ہستی کو منتخب کیا ہے، وہ اس امر کا بجا

ستحقاق رکھتی ہے، کہ عالمِ انسانیت، آفات وفتن کے اس نئے دور مین بھی اس کے تجویز کردہ نسخۂ شفا سے اپنے روحانی عوارض کا علاج کرے، موجودہ دور اپنے نتائج کے اعتبار سے ملتِ اسلامی اور مسلمانون کے حق مین تاریکی دور سے کسی طرح کم نہین، جس کی دشواریوں اور پرپیچ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے علامہ اقبال نے مرشد رومی کے دامن سے تمسک کرنے کی ضرورت محسوس کی، رومی کی حکمت "عقلیت" کی دشمن ہے، اور دبستانِ دل کی طرف رہنمائی کرتی ہے، مانا کہ ہم کو رومی کے صفحات مین تجاذب اجسام اور تجدد امثال جیسے دقیق سائنفک مسائل بھی ملتے ہین، لیکن اہلِ کشف وشہود کی بارگاہ مین ان ادنی حقیقتون کا علم کوئی خاص پایہ نہین رکھتا، رومی کا سب سے بڑا امتیاز "عشق" کا جذب وسرور پیدا کرنا ہے، اور دورِ حاضر کے لئے سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے،

رومی کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا اس سے زیادہ اس بحث کو طول دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، آخر مین پھر اسی کا اعادہ کرون گا کہ اقبال کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے رومی کو نہ صرف سمجھنا چاہئے، بلکہ اوس کو مقبولِ عام بنانا چاہئے، اور حکمتِ رومی کے ایسے دبستان قائم کرنے چاہئیں، جن مین اسلامی حکمت وتصوف کے ماہرین فکرِ رومی کے قلزم زخار کی غواصی کرین اور جو کچھ اس تلاش وجستجو سے حاصل ہو اُسے دنیا کے سامنے پیش کرین،

سنائی اور عطار | اقبال نے عطار اور سنائی سے بھی استفادہ کیا ہے، سنائی سے زیادہ اور عطار سے کم، بالِ جبریل مین وہ قطعہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا، جو حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر لکھا گیا تھا، اور جو حکیم علیہ الرحمۃ کے ایک قصیدہ کے تتبع مین ہے، اس قطعے مین کتنا جوش، کتنا سرور اور کتنا سوز ہے، ہر ہر شعر سے جذبات کے طوفان امنڈتے ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعرِ مشرق جب حکیم سنائی کے مزار پر پہنچا ہے تو سنائی کی عظمت اوس کے پہنائے قلب پر چھا جاتی ہے اور رومی کا یہ مصرع بیساختہ اسکی زبان پر جاری ہوجاتا ہے، کہ

ع ما از پئے سنائی وعطار آمدیم

مسافر مین بھی وہ نظم موجود ہے، جس مین حکیم موصوف سے استصواب کرتے ہین :-

حکیم سنائی سے علامہ اقبال کی عقیدت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ حکیم علیہ الرحمۃ بھی سلسلۂ رومی

سے تعلق رکھتے ہیں، یہ وہ بزرگ ہیں جن سے کسب فیض کا رومی کو خود اعتراف ہے؛ بلکہ ان کے ہم سلسلہ ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے، حکیم سنائی کی زندگی کے واقعات نفحات الانس وغیرہ میں بہ تفصیل موجود ہیں جن سے حکیم علیہ الرحمہ کے صاحب عرفان ہونے کا پورا پورا پتہ چلتا ہے، ان کی کتابیں حدیقۃ الحقیقہ اور طریقۃ الحقیقہ فارسی کی صوفیانہ شاعری کے لئے Classes اور بنیادی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں، خود شیخ عطار اور مولانا روم ان سے بے حد متاثر ہوئے، مجھے یونیورسٹی لائبریری کی سابق ملازمت کے سلسلہ میں اس کا پورا علم ہے کہ علامہ اقبال اکثر حدیقہ اور اس کی شرحوں سے استفادہ کیا کرتے تھے، بلکہ ان کا ارشاد تھا کہ حدیقہ کی تعلیم کو ہمارے نظام تربیت میں خاص جگہ ملنی چاہئے،

حدیقہ کیا ہے؟ اس میں کیا خاص اہم علمی و حکمی مسائل زیر بحث آئے ہیں؟ اور وہ کون سے نکات ہیں، جو جدید علوم کی توسیع کے بعد حدیقہ کے ذریعہ زیادہ روشن اور واضح ہو سکتے ہیں؟ علامہ اقبال کو سنائی سے کیوں اس قدر دلچسپی تھی؟ یہ وہ باتیں ہیں جن کا جاننا ہر محب اقبال کے لئے ضروری ہے،

سنائی کی طرح علامہ کو عطار سے بھی دلچسپی ہے لیکن بہت زیادہ نہیں، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عطار کی تصانیف بے شمار ہیں، اور کسی حد تک غیر دلچسپ، یونیورسٹی لائبریری میں مثنویات عطار کا جو قدیم نسخہ ہے، اس میں ان کی کم و بیش چوبیس تصانیف نظم موجود ہیں، اس نسخے کی ضخامت سات سو صفحات کے قریب ہے، مزید یہ کہ بہت سی مثنویاں عطار کی طرف غلط طور پر منسوب ہیں، اس کے علاوہ یہ سبب بھی ہے کہ سنائی اور عطار دونوں رومی کے سلسلۂ اساتذہ میں ہیں، اور ان کے خیالات کا بیشتر حصہ رومی نے اپنی مثنوی میں لے لیا ہے،

تاہم عطار چونکہ اقبال کے اساتذۂ روحانی میں سے ہیں، اس لئے ان کی سوانح حیات، تصانیف اور افکار سے واقف ہونا خالی از فائدہ نہیں،

سعد الدین محمود شبستری | زبور عجم کا "گلشن راز جدید" شبستری کے گلشن راز کے جواب میں لکھا گیا ہے،

شیخ شبستری تاتاری انقلاب کے زمانہ کے بزرگ ہیں، اس دور میں خاکِ ایران نے جو بلند پایہ ہستیاں پیدا کیں، ان میں سے ایک صاحبِ گلشنِ راز بھی ہیں، گلشنِ راز تصوف کی دقیق کتابوں میں سے ہے، علامہ نے اس کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے، پھر اس کے پیغام کو نئے لباس میں ملبوس کرتے ہوئے گلشنِ راز جدید کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

اقبال اور شبستری کے فکر کے مقاماتِ اتصال کیا ہیں؟ اور وجوہ اختلاف کون سے ہیں؟ اقبال اور شبستری دونوں کا مطمحِ نظر کیا ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کس نئے انقلاب کا مدعی ہے؟ ان سب سوالات کا جواب مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں ضروری ہے، میں نے اپنے ایک مضمون "اقبال اور شعرائے فارسی" میں ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں گلشنِ راز کے بہت سے مسائل سمجھنے سے قاصر ہا، میں نے اس مضمون میں اختصار کے ساتھ اقبال کے اسلامی مآخذ کا ذکر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بحث اس درجہ دقیق اور پر از مسائل ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اس کے مبادی تک کا بھی تذکرہ نہیں ہو سکتا، تاہم اس سے اتنا واضح ہو گیا ہوگا کہ حکمتِ اقبال کے اجزائے ترکیبی میں مسلمان صوفیوں اور حکماء کی حکمت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دور کے حکیم اور عارف اقبال کی حکمت کا صحیح تجزیہ کر سکیں تو ہمیں علومِ اسلامیہ اور خاص کر اس چمنِ فکر کی سیر کرنی چاہیئے جس کے گلہائے رنگا رنگ سے گلشنِ اقبال کو یہ رونق حاصل ہوئی،

حکمائے مشرق کی طرح اقبال نے حکمائے مغرب سے بھی بے حد استفادہ کیا ہے، مطالعۂ اقبال کے اس پہلو کے متعلق کچھ کام ہو چکا ہے، لیکن ابھی وہ نا کافی ہے، اس کے لئے فلسفۂ جدید سے عمومی واقفیت اور بعض بڑے بڑے فلسفیوں کے خصوصی اور نمایاں پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً نطشے، برگساں، ولیم بلیک، کانٹ، الیگزینڈر، میک ٹیگرٹ وغیرہ،

امید ہے کہ اقبال کے شیدائی، مطالعۂ اقبال کی تسہیل و تشریح کے لئے کوئی موثر اقدام کریں گے،

اسلامی اور غزنوی علم

از

جناب غلام مصطفٰے خان صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)

(۲)

اس تفصیل کے بعد غزنوی علم کے متعلق کچھ نئی چیزیں پیش کیجاتی ہیں، اس سلسلہ میں اس عہد سے پہلے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے مختلف اعلام کا تذکرہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، اور ہیسٹنگز کی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (جلد دوازدہم، صفحہ ۱۴۵) میں سے کچھ مفید معلومات کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:-

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمان حکمرانوں نے اپنے لیے مختلف نشان اور علم مقرر کئے، خلفائے بنی امیہ نے سفید علم اور بنی عباس نے سیاہ علم اختیار کیا، موخر الذکر نے شقہ علم پر سفید حرفوں میں کلمہ طیبہ بھی لکھوایا، علویوں نے سبز عَلَم اختیار کیا، اور زنگی (۵۶۹ھ / ۱۱۷۴ء) نے ریشمی پھریرے پر قرآن پاک کی کوئی آیت سُرخ اور سبز حرفوں میں لکھوائی، مصر کے فاطمی خلفاء (۲۹۷ھ / ۹۰۹ء تا ۵۵۵ھ / ۱۱۷۱ء) نے اپنے علم میں ہلال لگایا، اور سرخ و زرد حریر کا ایک شیر بھی اُس میں بنوایا، اندلس کے الموحدین (۱۱۵۹ء) نے بھی اپنے علم میں ہلال لگایا، لیکن ہلال مسلمانوں نے سب سے پہلے اختیار نہیں کیا، بلکہ ان سے پہلے روم کے عیسائی حکمرانوں کے یہاں ہلال موجود تھا، وہ عموماً زیبایش کے لئے مستعمل تھا، اس کے ساتھ پانچ ستارے بھی زیب و زینت کے لئے بنائے جاتے تھے، مشہور یہ ہے کہ چاند دیوی کی ایک لڑکی (Keroessa) تھی جس نے ہلال اختیار کیا تھا، اسی نے رومی سلطنت کی

بنیاد ڈالی تھی، لیکن اوہام پرستی کی ان خیالی داستانوں سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو اتنا ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ہلال زیبائش کے لئے بھی اختیار کیا جاتا تھا، صنعاء (یمن) کی ایک مسجد کے مینار پر ۱۲۶۰ء میں ہلال نصب کیا ہوا دیکھا گیا، ترکوں نے جو اپنے علم کے لئے ہلال اختیار کیا ہے، اس کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (طبع یازدہم، جلد دہم ص ۴۶۲) میں یہ بیان ملتا ہے :-

"ترکی ہلال اور ستارہ (غالباً سہا) محمد دوم نے ۱۴۵۳ء قسطنطنیہ کی فتح پر بطور یادگار کے اختیار کیا تھا[1]، کیونکہ یہ نشان وہاں پہلے بھی تھا، بلکہ وہاں کی رومی حکومت کے اثر سے تو روسی گرجاؤں میں اب تک صلیب کے ساتھ ہلال دیکھا جاتا ہے، اس کی ابتدا یوں ہوئی، کہ سکندر اعظم کے والد فلپ (Philip) نے ایک شب قسطنطنیہ کے قلعہ کی دیواریں گرانی چاہیں، تو چاند نمودار ہو گیا، اور محصورین کو پتہ چل گیا، چنانچہ انھوں نے اسے نیک فال سمجھ کر اپنی ملکہ ڈائنا (Diana) کے لئے شاہی نشان بنا لیا، اور پورے چاند کے بجائے ہلال کو اختیار کیا جو غالباً اس غرض سے ہے کہ وہ بڑھنے ابھرنے پر دلالت کرتا ہے، بہرحال ترکوں نے اُسے بطور یادگار کے قائم کر لیا اور اُن کا شاہی علم سُرخ رنگ کا ہے جس میں خلیفۂ وقت کی تصویر بھی ہوتی تھی۔"

ہیسٹنگز کی انسائیکلوپیڈیا (بحوالہ مذکورہ بالا) میں ترکوں کے علم کے متعلق اس خیال کی تردید کی گئی ہے، اور کہا گیا ہے کہ سلطان مراد اوّل (م ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء) کے زمانہ میں جان نثار جماعت نے سُرخ علم اختیار کیا تھا، اور اس میں ہلال (بغیر ستارہ کے) بھی بنا ہوا تھا، یہی علم سلجوقی ترکوں نے بھی اختیار کر لیا، اور اُس زمانے سے ترکی سلطنت میں قائم ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں سے پہلے ہلال ضرور شاہی نشان میں جگہ پائے ہوئے تھا، ایران میں اسلام سے پہلے یزدجرد اور خسرو پرویز وغیرہ کے سکوں میں بھی ہلال اور ستارے منقوش تھے، اور وہاں جب

---

[1] عرصہ ہوا میں نے کسی تاریخ میں پڑھا تھا کہ قسطنطنیہ کی فتح کے وقت قلعہ میں ایک ٹوپی پڑی ہوئی ملی تھی جس کو بطور یادگار کے ترکوں نے اختیار کیا، اور وہ ترکی ٹوپی کہلائی، روم کی اس شاندار فتح کی خوشی ترکوں کو کیوں نہ ہوتی جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بشارت دی تھی، ملاحظہ ہو مشکوٰۃ، باب آلات الجہاد فصل اوّل حدیث نمبر ۱۰۰۳۔

عرب[1] عمال ۶۳۱ھ سے اسلامی حکومت کے علمبردار ہوئے تو انھون نے بھی اپنے سکون مین دوسرے رائج نقوش کے ساتھ یہ نقوش قائم رکھے، اس تاریخ سے ہلال اور ستارے ہمارے یہان بھی رائج ہوگئے،

ایران کے نشان کے متعلق ایک مفید[2] مضمون "تاریخچۂ شیر و خورشید" (کسروی) طہران کے رسالہ "ارمغان" (ستمبر اکتوبر ۱۹۳۰ء) میں ملتا ہے، جس کا ضروری خلاصہ یہان پیش کیا جاتا ہے،

فاضل مضمون نگار نے پہلے شیر اور خورشید کی اہمیت بتائی ہے، کہ یہ زمین اور آسمان کی بہت نمایان شکلین مین اور شیر کا مترادف لوئی ([illegible]) فرانس، روم اور آرمینیہ کے متعدد حکمرانون کا نام تھا، اور اس نام کے بادشاہون نے اور بالخصوص آرمینیہ کے لوئی دوم نے اپنے سکون اور علم پر شیر کی تصویر بنوائی تھی، اسی لوئی دوم نے تیسری صلیبی جنگ مین عیسائیون کی مدد کی تھی، اُس کے صلے مین جرمنی کے بادشاہ فریڈرک باربروسا نے اُسے تاج شاہی دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن وہ ۱۱۹۰ء میں مرگیا تو اُس کے لڑکے نے روما کے پوپ سے سفارش کرکے اُسے ایک شاہی علم دلوادیا، جس مین شیر کی تصویر تھی، لوئی ششم نے خصوصیت کے ساتھ شیر کو اپنے خاندان کا شاہی نشان قرار دیا، اسی طرح خراسان کے مغلون نے اور مازندران کے صفوی حکمرانون نے بھی اپنے سکون مین شیر کندہ کرایا،

بعض شعراء نے بھی علم کے شیر کے متعلق اشارہ کیا ہے، مولوی معنوی (م ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) کا ایک شعر ہے :-

ما ہمہ شیریم و شیران علم   حملہ مان از باد باشد دمبدم

فخرالدین اسعد گرگانی نے پہلوی سے فارسی مین "ویس و رامین" کا ترجمہ پانچوین صدی ہجری کے آخر[3]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اورنٹیل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۰ ابعد [2] مکرمی پرنسپل محمد شفیع صاحب نے اس کی اطلاع مجھے دی تھی، اور میرے بزرگ استاذ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی مدظلہ نے اس کی نقل مجھے بھجوائی تھی [3] حافظ محمود خان صاحب شیرانی نے اس ترجمے کی تاریخ ۴۴۴ھ دی ہے، ملاحظہ ہو رسالہ "اردو" دہلی جنوری ۱۹۴۳ء صفحہ ۴،

ن اور ملک شاہ سلجوقی (م ۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء) کے عہد میں کیا تھا، اُس کے چند اشعار یہ ہیں، جو ساسانی عہد کے اعلام کی ضروری
للاع دیتے ہیں :-

چو سر دستان شدہ دست از درفشان — چو دیبا ے درفشان مہ درخشان
فسر از ہر یکے زرّین یکے مرغ — عقاب و باز یا طاؤس و سیمرغ
بزیر ماہ در شیر آبگون زنگ — تو گفتی شیر دارد ماہ درچنگ

ہخامنشی عہد (۵۵۰-۳۳۰ ق-م) میں "خروس و مرغ زرّین" کی تصویر عَلَم پر تھی، لیکن ساسانی عہد
(۲۲۶ء-۶۳۲ء) میں ضرور شیر اور ماہ رہے ہوں گے، یہ نہیں ہوسکتا کہ شاعر نے ان اشعار میں اپنے
ہد کے اعلام دیکھ کر اُس زمانے کے اعلام کا تخیل باندھا ہو، کیونکہ اُس کے ہم عصر سلجوقیوں نے تو ہلال اختیار کرلیا تھا،
اسی طرح نظامی گنجوی کی مثنوی لیلیٰ و مجنون جو ۵۸۴ھ / ۱۱۸۸ء میں لکھی گئی اور اخستان بن منوچہر کے نام معنون
کی گئی، اِن مفید اشعار کی حامل ہے جو نوفل اور قبیلہ لیلیٰ کی جنگ کے متعلق ہیں :-

خورشید درفش دہ زبانہ — چون صبح دمیدہ دم نشانہ
گشتہ زمی از درم چو دریا — سنگ ابلہ رو تر از ثریا (؟)
ہر شیر سیاہ کایستادہ — چون مار سیہ دہان گشادہ
شیران سیاہ دردریدن — دیوان سپید در دویدن

ان اشعار میں شیر والے عَلَم کے متعلق اشارہ ضرور ملتا ہے، اور یہ یقین ہے کہ یہ اشارہ اُس خیالی جنگ کے
متعلق نہیں ہوگا بلکہ خود شاعر کے سامنے اپنے زمانہ کے علم کی تصویر ہوگی،
آگے چل کر مضمون نگار کہتا ہے کہ شیر کا تعلق آفتاب سے بھی ہے، کیونکہ وہ بُرجِ اسد میں ہے، اس لئے
ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی گئی ہے، اور یہ اُسی طرح ہے جس طرح کہ شاہ طہماسپ صفوی نے اپنے سکوں میں
شیر اور مہش کو محض اس لئے ساتھ کندہ کرایا تھا کہ اس کی پیدائش کے وقت (چہارشنبہ ۲۶ ذی الحجہ ۹۱۹ھ)

(۲۸ جنوری ۱۲۱۱ء) آفتاب برجِ حمل میں تھا، پھر وہ "مختصر تاریخ دول" کا تذکرہ کرتا ہے جس کا مصنف ایشائے[1] کوچک کے سلجوقی حکمران غیاث الدین کیخسرو (بن عزالدین کیکاؤس) کے بعد ہی ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں گذرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ حکمران گرجستان کی ایک عیسائی حسینہ پر عاشق ہوا، اور اس کے ساتھ شادی بھی کر لی، لیکن اُس کی شیفتگی بہت بڑھی ہوئی تھی، اور وہ چاہتا تھا کہ اُس کی تصویر اپنے سکوں میں بنوائے لیکن امرا نے اس کی موافقت نہ کی، اُس وقت اوس نے مجبور ہو کر اپنی محبوبہ کے آفتابی رخسار کی مناسبت سے مروج شیر کے ساتھ آفتاب کا اضافہ کر دیا، چنانچہ اوس وقت سے یہ دونوں شکلیں ساتھ ساتھ سکوں میں کندہ ہونے لگیں، اور اس قسم کا کوئی سکہ ایسا نہیں ملا، جو اس سے زیادہ قدیم زمانے کا ہو،

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "ایران کی جدید شاعری اور طباعت" میں سب سے قدیم روزنامہ "خلاصۃ الحوادث" مرتبہ آقا محمد باقر خان کے پہلے صفحے کا عکس دیا ہے، جس میں ایک شیر کی تصویر ہے، جس کے داہنے ہاتھ میں تلوار ہے، شیر کے اوپر سورج اور اس کے اوپر تاج ہے، یہ روزنامہ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء سے ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء تک جاری رہا،

غزنوی علم

ہیسٹنگز کی کتاب (بحوالۂ مذکور صفحہ ۱۴۶) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) نے ہندوستان میں غلبہ ظاہر کرنے کے لئے ہلال اختیار کیا تھا، جو یہاں کے علم میں بھی ضرور قائم کیا ہوگا، چونکہ محمود اور اس کے جانشینوں کو عباسی خلفاء سے خاص عقیدت تھی، اس لئے ظاہر ہے، کہ یہ علم بھی ان کے علم کی طرح سیاہ ہی ہوگا، اس کے متعلق ثبوت پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں، کہ بغداد سے علم بھی ملتے تھے، چنانچہ سومنات کی فتح پر خلیفہ القادر باللہ (م ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء) نے محمود کو القاب کے ساتھ علم بھی روانہ کیا، جس سے یہ مراد تھی، کہ اُس علم کے متعلق جو ممالک ہیں، اُن میں محمود کی حکمرانی خلیفہ کو منظور ہے، فرشتہ لکھتا ہے:۔

"..... درین سال کہ سلطان از سفرِ سومنات برگشت خلیفہ القادر باللہ عباسی القاب نامہ بسلطان محمود

---

[1] خلاصۃ الاخبار (خواندمیر) ورق ۲۱۴ (الف) حبیب گنج، شاہ طہماسپ صفوی کا انتقال ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء میں ہوا،

نوشتہ بوائے خراسان وہندوستان ونیمروز وخوارزم فرستاد۔ وسلطان وفرزندان وبرادران

اورا درنامہ لقبہا نہادہ، سلطان را کہف الدولہ والاسلام وامیر مسعود را شہاب الدولہ وجمال الملۃ

وامیر محمد را جلال الدولہ وجلال الملۃ وامیر یوسف را عضد الدولہ ومؤید الملۃ خواند، ودیگر نوشت کہ

ہرکرا ولی عہد گردانی ما نیز آن کس را قبول داریم۔۔۔۔"[51]

ظاہر ہے کہ جب خلیفہ کا علم سیاہ ہوگا، تو اسکا بخشا ہوا عَلَم بھی اُسی رنگ کا ہوگا،[52]

محمود غزنوی کے درباری شاعر فرخی (م ۴۲۹ھ / ۱۰۳۸ء) نے اوس کے بھائی یوسف (سپہ سالارِ ہند) کی

مدح کے ایک قصیدہ مین کہا ہے :۔

چترِ سیہ ورایتِ تو سایہ فگندہ ست   در ہند ہر جائے کہ حصنے وحصاریست[53]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمودی چتر سیاہ تھا،[54] اور سیاہ کی صفت اغلب ہے کہ "رایت" کے

ساتھ بھی ہو، کیونکہ محمود یقیناً عباسی خلیفہ کے زیرِ اثر تھا، جس کا علم سیاہ تھا،

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ محمود کے نبیرہ سلطان ابراہیم (م ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء) کے علم مین شیر کی تصویر تھی،

اس سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے، عنصری (م ۴۳۱ھ / ۱۰۴۰ء) نے اسی شیر کے متعلق محمود کی مدح کے ان اشعار

---

[51] تاریخ فرشتہ، طبع لکھنؤ ص ۲۵ [52] عباسی خلفاء سیاہ خلعت روانہ کرتے تھے، جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "خلافت اور ہندوستان" کے صفحہ ۲۱، ۲۲ وغیرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے، عباسی خلیفہ کا ہودج بھی سیاہ ہوتا تھا، جیسا کہ خاقانی کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے : وان ہودج خلیفہ متوج بماہ وزر ÷ چون شب کز آفتاب نہی تاج بر سرش [53] انتخاب فرخی لاہور ۱۳۰۵ھ ص ۲۵ [54] سنجر سلجوقی کا چتر بھی سیاہ تھا، جیسا کہ اس شعر مین ہے: چون چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد۔ با فقر گو بو دہوس ملک سنجرم [55] مسٹر مولوی محمد اسمٰعیل نے مفتاح التواریخ (آگرہ ۱۸۴۸ء ص ۶۹) میں لکھا ہے کہ یہ شعر شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۶۱ھ / ۱۱۶۶ء) کا ہے اور یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ سنجر (م ۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء) اُن کا ہم عصر تھا، لیکن حمیدیہ لائبریری بھوپال کے انتخاب شعراے متقدمین (نمبر ۳- ورق ۳۴۳ ب) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر عراقی (م ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء) کا تھا،

مین اشارہ کیا ہو :-

برون برد علم تو ز مغز شیران ہوش برون برد کرم تو ز روے پیران چین
بدیع نقش تو دُر است و انتخاب صدف بزرگ باس تو شیر است و روزگار عرین [۵۱]

لیکن مجھے کوئی ایسا ثبوت نہین مل سکا جس سے یقینی طور پر یہ کہا جائے کہ محمود کے علم مین بھی شیر کی تصویر تھی، بلکہ اوس کے درباری شعراء بالخصوص فرخی، عنصری اور منوچہری نے کئی جگہ اس کی "شیر شکاری" کا تذکرہ کیا ہے لیکن جہان تک مجھے معلوم ہے کہیں ان شاعرون نے محمودی علم کے شیر کے متعلق کوئی صاف تشبیہ یا استعارہ تک پیش نہیں کیا [۵۲]

اب اوس کے پوتے ابراہیم کے علم کے متعلق ابوالفرج رونی کے یہان وضاحت دیکھئے، جو اوس کی مدح میں کہتا ہے :-

چو شیر رایت شیر دلیر او بیدل چو شاخ آہو شاخ درخت او بے بر [۵۳]

اُس کے بیٹے مسعود سوم (م ۵۰۸ھ / ۱۱۱۵ء) کے متعلق بھی یہی بات ملتی ہے، اور وہی شاعر کہتا ہے :-

در جہد باس او بہ شیر فلک اگر اندر شود بہ شیر علم [۵۴]

یہی شاعر مسعود سوم کے بھائی سیف الدولہ محمود کے متعلق بھی اسی طرح کہتا ہے :-

چندان علم شیر برافراشت کہ بفزود زایشان بفلک برج اسد بے عدد اشکال [۵۵]

مسعود سوم کے بیٹے شیرزاد (م ۵۰۹ھ / ۱۱۱۶ء) کا علم بھی ایسا ہی تھا، مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء) نے

---

[۵۱] دیوان عنصری، لکھنؤ ۱۹۲۲ء ص ۸۹ - ۹۰ [۵۲] اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مصر کے فاطمی خلفاء کے علم مین شیر تھا، اگر محمود کو اس بات کا علم رہا ہوگا، اور یقیناً ہوگا، تو اوس نے ہرگز اپنے علم میں شیر کو جگہ نہ دی ہو گی [۵۳] دیوان رونی، چاپ ایڈیشن ص ۶۱، رونی کی تاریخ وفات ۴۹۰ھ / ۱۱۰۴ء کے بعد قرار دی ہے، ملاحظہ ہو اورنٹیل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۳۸ء ص ۵۵ [۵۴] دیوان رونی ایضاً صفحہ ۹۰ [۵۵] ایضاً ص ،،،

ں کی مدح میں کہا ہے:-

خشتِ او بس کہ کرد شیران کم شیر گردون بماند و شیرِ علم[۱]

مسعود سوم کے دوسرے بیٹے[۲] بہرام شاہ کے علم میں بھی شیر تھا، سنائی (م ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء) کہتے ہیں:-

ہر کجا شاہِ ما بتافت عنان شیر راياتِ او شود ہمہ جان

رائے رایان بہ تیغ کردہ قلم نیزہ را شیر کردہ شیرِ علم[۳]

بہرام شاہ کے درباری شاعر سید حسن غزنوی (م ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) نے بھی اُس کے علم کے متعلق یہی کہا ہے:-

آن چنان شیرِ علم سر بفراز دمثل گوئی از چشمۂ خورشید کند آب خوری

زندہ از باد مشوبہ بیدہ چون شیرِ علم تکیہ بر خاک مکن خیرہ چو ن نقشِ ایوان[۴]

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ محمود نے ہلال اختیار کیا تھا، جو یقین ہے کہ اُس کے اخلاف نے بھی قائم رکھا ہوگا،

س طرح کہ بہرام شاہ کے متعلق وہی شاعر کہتا ہے،

ماہ اگر گشتے زماہِ رایتِ او بہرہ ور مہر اگر بودے زماہِ رایتِ او مایہ دار

رباعی:- بگذشت ہلالِ رایتِ شاہ از ماہ من پائے بگل دو دست کوتاہ از جاہ

دور افتادم بقصد بدخواہ از راہ اے شاہ ز بندہ دور کن کاہ از کاہ[۵]

---

[۱] دیوانِ مسعودِ سعدِ سلمان، طہران ایڈیشن ۱۳۱۰، صفحہ ۵۶۳ [۲] بہرام شاہ کی تاریخ وفات ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء ہی صحیح ہے، میں نے اس بادشاہ کی مکمل تاریخ لکھی ہے، جو انشاء اللہ جلد شائع ہوگی [۳] حدیقہ بمبئی ایڈیشن صفحہ ۴۰۴، اور لکھنؤ ایڈیشن صفحہ ۶۵۹، مترتباً [۴] انڈیا آفس، مخطوطہ نمبر ۹۳۱، ورق ۴۴ (الف) اور ۱۲۸ (ب) مترتباً [۵] ایضاً ورق ۲۱۰ (ب) اور ۱۸۲ (ب) مترتباً، بہرام شاہ کے پوتے خسرو ملک (م ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء) کے سکوں میں ہلال اور ایک ستارہ تھا، دوجہ س کی کتاب (Coins of The Indian Museum) جلد چہارم (کلکتہ ۱۸۹۶ء) صفحہ ۱۶۱ ملاحظہ ہو، اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۰ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ بہرام شاہ اور اس کے بھائی ملک ارسلان وغیرہ کے (ہندوستانی) سکوں میں

اور جس طرح کہ محمود کا علم سیاہ تھا، بہرام شاہ کا علم بھی سیاہ تھا، چنانچہ وہی شاعر کہتا ہے :-

اے رفتہ زمین رایت او — دیدہ بحمایت سیاہی

بہرام شاہ ای شاہ کہ از رایت شبرنگ — در کوکبہ چون نعت تبان ماہ گرفتی

فرخی کے کلام سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ محمود کا چتر سیاہ تھا، سید حسن غزنوی کے ذیل کے اشعار بتاتے ہیں کہ بہرام شاہ کا چتر بھی سیاہ تھا، اور اس کا تاج سفید تھا :-

گر ز چتر تو شام سیاہ گردون خواست — چو فرِ تاجِ تو صبح سپید کار گرفت

رتبت چتر سیاہت چیست مرغ روز کور — لاجرم تا شد ہمہ چشمش سپید از انتظار

روزے کہ بر نہی تو تاجِ سپید و دم — گیرد کنار سایۂ چترِ سیاہ را

ملک دگر دارا امید زان کہ بدادت نوید — صبح ز تاجِ سپید، شام ز چتر سیاہ

از تاج تست عکسے صبح سفید پوش — وز چتر تست خالے شام سیاہ دار

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۷) گائے کی تصویر اور اس کے اوپر ہندی خط میں "شری سمنت دیو" کندہ تھا، میں نے تانبے کے یہ سکے حافظ محمود شیرانی صاحب کے یہاں لاہور میں دیکھے ہیں، یہ سلطانوں کی رواداری کی شاندار مثال ہے ۵۱ انڈیا آفس مخطوطہ ۹۳۱، ورق ۱۱ (ب) تقریباً سبھی غزنوی سلاطین کے سکوں میں (خصوصاً وہ جو غزنین وغیرہ میں رائج تھے) خلیفۂ وقت کا نام بھی کندہ ہوتا تھا ۵۲ مخطوطہ مذکورہ۔ ورق ۲۰ (ب) ۲۲ (الف) ۱۱۳ (ب) - ۱۱۸ (الف) اور پیرس کا مخطوطہ سپلیمنٹ نمبر ۹۰۵، ورق ۱۰ (ب) - ترتیباً، بہرام شاہ کے بھائی ملک ارسلان کی تاریخ معارف (نومبر، دسمبر ۱۹۴۱ء) میں پیش کر چکا ہوں، اس کا چتر بھی سیاہ تھا، جیسا کہ مسعود سعد سلمان (دیوان صفحہ ۶۶۴-۶۹۰) نے کہا ہے،

گوید سپہر باشد و دولت سپید روے — تا ہست چتر ملک ملک ارسلان سیاہ

روے دولت سپید و قصر سپید — روز دشمن سیاہ و چتر سیاہ

سفید تاج کے متعلق بھی اشارہ ملتا ہے،

آداب الحرب (لاہور مئی ۱۹۳۸ء صفحہ ۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ کے والد مسعود سوم کے چتر پر پانڈ تھا

مسعود سعد سلمان نے بھی بہرام شاہ کے سیاہ چتر کا تذکرہ کیا ہے :-

آن خنجر زدودش دولت فزائے گشت روئے عدوے اوشد وچون چتراو سیاہ[۵۱]

یہ ہے غزنوی چتر اور علم وغیرہ کی تفصیل، اگر دوسرے مسلمان حکمرانون کے شاہی لوازمات کی تفصیل دیکھنی ہو تو ذیل کے حاشیے[۵۲] کی کتابین بھی بہت کچھ معلومات بہم پہنچائین گی،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۸) ہم پچھلے حاشیہ پر دیکھ چکے ہین، کہ سنجر کا چتر سیاہ تھا، انوری (کلیات، لکھنو ۱۸۸۰ء صفحہ ۱۰۳) نے سنجر کے چتر کے باز کا تذکرہ کیا ہے،

سلطان سلاطین کہ باز چترش در معرکہ سلطانِ شکار باشد

لیکن حمیدیہ لائبریری کے انتخاب شعرائے متقدمین نمبر ۳ ورق ۲۵۵ (ب) میں اس شعر میں "باز چترش" کے بجائے "شیر چترش" ہو

۵۱؎ بدایونی کلکتہ ۱۸۶۸ء جلد اول صفحہ ۴۴ ۵۲؎ مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی کے کرم سے اور معارف کی علم نوازی کی بدولت مختلف مسلمان حکمرانون کے تخت، چتر، تاج، علم وغیرہ کے متعلق معلومات صبح الاعشیٰ ج ۳ (ص ۴۴۲، ۴۹۰، ۵۲۲) ج ۴ (ص ۶-۸) ج ۵ (ص ۲۰۶، ۳۲۴) میں سے اور مقدمہ ابن خلدون (ص ۲۰۴-۲۰۵) اور خطط مصر مقریزی جلد ۳ (ص ۴۰، ۳۴۲-۳۴۴) وغیرہ سے معلوم ہون گی، صبح الاعشیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق کے سر پر سیاہ علم ہوتے تھے جن کے درمیان ایک سنہری اژدہا بنا ہوتا تھا، اور اس کے میسرہ میں سُرخ علم ہوتے تھے، جن میں دو سنہری اژدہے بنے ہوتے تھے، جنگ مین سلطان پر سات چتر ہوتے تھے' امیر خسرو کی مثنوی مفتاح الفتوح (اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۶ء ص ۱۲، ۲۶ وغیرہ) سے معلوم ہوتا ہے، کہ جلال الدین فیروز شاہ کا چتر سیاہ تھا، اور علم مین ہلال تھا،

القضاء فی الاسلام

تصحیحِ فکر[1]

از

جناب میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

"اس مختصر مقالہ سے میرا مقصود فکر کی اہمیت کو واضح کرنا ہے، جو فلسفہ کا آلہ ہے، بتایا گیا ہے کہ افکار ہی سے اعمال و افکار کا تعین ہوتا ہے، اور افکار ہی اعمال کے ذریعہ ہماری قسمتوں کا تعین کرتے ہیں، فلسفہ جو تصحیح فکر کا دوسرا نام ہے قسمتوں کے ڈھالنے کا ایک زبردست آلہ ہے، ایسے اہم اور مفید مضمون کا مطالعہ ہر اس شخص کیلئے ضروری ہے جو اپنی فکر کو پختہ کرکے اپنی قسمت کا آپ معمار بننا چاہتا ہے، اور اپنی فکر کو خام رکھکر انسان سے حیوان بننا نہیں چاہتا، جیسا کہ اقبال نے کہا تھا ؎

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی　　رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ"

اے برادر تو ہمین اندیشۂ　　مابقی استخوان و ریشۂ

گر گل است اندیشۂ تو گلشنی　　ور بود خارے تو ہمہ گلخنی (رومیؒ)

افکار و خیالات ہی سے مقاصد و غایات کا تعین ہوتا ہے، مقاصد کردار، افعال و اعمال مین ظہور پذیر ہوتے ہین، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت تشکیل پاتی ہے، اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے جیسی سیرت ویسی قسمت۔ لہذا جیسے خیالات ویسی کائنات (انا عند ظن عبدی بی

---

[1] یہ مقالہ "بزم فلسفہ" کی کرسی نشینی کے موقع پر سنایا گیا جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبۂ فلسفہ کی بزم مباحثہ ہے،

یہ قانون ذہن کے دائرہ مین وہی صداقت واہمیت رکھتا ہے جو قانونِ تجاذب دائرۂ فطرت مین قطعی ویقینی!
جب سیرت اور قسمت کی تشکیل وتعیین مین افکار وخیالات ہی کی کارفرمائی ہے، تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے افکار
وخیالات کی اصلاح اس کا اپنا نہایت اہم فریضہ ہے، قوم سازی اور فرد کی روح کی تکمیل اصلاحِ خیال پر منحصر ہے؛

ع یک تنقیۂ دماغ می باید کرد

مقاصد وغایات کا دائرہ ذہنِ انسانی ہے، انسان کا کوئی فعل مصلحت وغایت سے خالی نہین ہوتا، آ
مقاصد کا تعین غور وفکر سوچ اور بچار پر منحصر ہے فکر ہی کائنات کی سب سے زیادہ عظیم الشان قوت ہے، اور یہی ان دونون
انسان مین سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ قوت ہے، اس کی تربیت ہی کے متعلق مجھے یہان کچھ کہنا ہے،

فرض کیجئے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے، اس کے لئے آپ کو چند قوانین پر عمل کرنا ہوگا، جن کو باغبانی کے
قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگایا کہان جائے، پھر اس جگہ کو سطح
اور خس وخاشاک سے پاک کرنا ہوگا، یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، پھر ہمیں پھولون یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب
کرنا چاہئے، اور اس عمدگی سے تیار کی ہوئی زمین مین انھین بونا چاہئے، ہمین اس امر کا بھی خیال رہے کہ بیج عمدہ ہین
ناقص نہیں، پھر موسم گرما میں ان بیجون کو پانی دینا پڑتا ہے تاکہ شدت تمازت انھیں جلانہ ڈالے، اب ہمین انتظار
کرنا پڑتا ہے، کہ وقتِ مقررہ گذر جائے اور بالآخر گل تر رونمائی کرے، اگر بے صبری سے ہم بیجون کو کھود کر دیکھنا
چاہین، کہ یہ جل تو نہیں گئے، تو پھر ان بیجون کو نشو ونما کا موقع نہین ملے گا، بعض دفعہ ہمین کچھ زیادہ دن انتظار
کرنا پڑتا ہے لیکن اگر ہم نے زمین کو خس وخاشاک سے اچھی طرح پاک کیا ہے، بیجون کے انتخاب مین غلطی نہیں کی؛
آبیاری کی ہے، تو ہمین یقین ہے کہ ایک دن زندگی دامن زمین چیر کر پودوں کی شکل مین جلوہ افروز ہوگی، اسی زمانہ
مین ہمین یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ باد وباران، آفتاب وحرارت بیجون کے نشو ونما کے لئے ضروری ہے، طوفان
تک انھین نقصان نہین پہنچا سکتے، عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتین ان کے
ساتھ اشتراکِ عمل کر رہی ہین!!

فرض کرو کہ انتظار کی مدت بحمد اللہ گزر گئی ، بار یک بیج ن نے خوش رنگ و دلفریب لالہ و یاسمن کی شکل اختیار کی ، فطرت کا زبردست لیکن مانوس معجزہ ہماری آنکھون کے سامنے پیش ہوا ، شروع ہی سے ہم جانتے ہین اور یہ علم مرتبہ یقین تک پہنچا ہے کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے ، وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے ، اور ہزارون باریکیون کے ساتھ اپنے اندران تمام چیزون کا اعادہ کرتا ہے ، جو اس پودے میں پائی جاتی ہین جس کا یہ بیج ہے ، کیا اس بیج کو اصلی پھول کی نہ ہونے والی صورت "یاد" رہتی ہے ؟ !

پھول کی غایت تخلیق سے تو ہم واقف نہین ، لیکن اتنا ضرور جانتے ہین کہ یہ ہمارے دل کا سرور آنکھوں کا نور ہے ، کسی کے پاکیزہ الفاظ مین ہم اس کو "ربیع قلبی ، نور بصری ، جلا حزنی ، ذہاب ہمی" کہہ سکتے ہین ، !

باغبانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہی ہین ، کوئی بات نئی نہیں ، لیکن میری دانست مین نئی بات جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہون ، وہ یہ ہے کہ بالکل انہی قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دنیا کی تمام حسین و خوشگوار چیزون کو حاصل کر سکتے ہین ، جو زندگی کے بیج مین مستور ہے وہی ہم میں سے ہر ایک مین موجود ہے ، ان چیزون کے حصول کے لئے ہمین زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھولون کے بیجون کی ہم نے کی تھی ،

دلفریب پھولون کے لئے آپ نے خارج (عالم اکبر) میں باغ لگایا تھا ، شادمانی و مسرت کے حصول کے لئے آپ کو باطن (عالم اصغر) میں باغ کے لئے زمین تیار کرنی ہے ، شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا محل و توع ٹھیک کہان ہے ؟ یہ باغ آپ کو اپنے "میدان فکر" میں لگانا ہے ، کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم مین سے ہر ایک کے ہان ایک عظیم الشان میدان فکر ، موجود ہے ، جس کی وسعت کو ارض و سما نہیں پا سکتے ، صرف ہمارا دل ہی اسکو سما سکتا ہے ، مگر افسوس ہو کہ یہ میدان خس و خاشاک سے پٹا پڑا ہے ! جانتے ہو کہ یہ خس و خاشاک ہے کیا ؟ وہی سلبی افکار و خیالات جن کو مختصر طور پر شر انگیز ، بد و غلط خیالات کہنا کافی ہوگا ، واقفان راز کا اصرار ہے کہ یہی ہمارے تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہین ، ! ان سے ذہن و قلب کو پاک و صاف کرنا چاہئے ! اس راز کو سمجھنے کے لئے اس نفسیاتی قانون

پر غور کرو جس کا ہم نے ابتدا ہی میں ذکر کیا ہے، افکار و خیالات ہی سے ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں، اپنے مقاصد ہی محرک بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں، اعمال کی تکرار عادات راسخہ کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اور سیرت سوائے ان عاداتِ راسخہ کے منظم مجموعہ کے کوئی اور چیز نہیں اور ہماری سیرت ہی ہماری قسمت کا دوسرا نام ہے! سلبی خیالات فاسد مقاصد کا تعین کرتے ہیں، ان ہی سے تو شر کا صدور ہوتا ہے، شر کا ارتکاب عادت بنکر سیرتِ بد کی تشکیل کرتا ہے، اب میکانکی طور پر بغیر غور و فکر کے شر ہی کا صدور ہونے لگتا ہے، اور شر کے نتائج و ثمرات سے ہم سب واقف ہیں: درد و رنج، غم و الم، حزن و یاس!

میدانِ فکر کا سلبی خیالات کے خس و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے، اور نیک خیالات کی تخم ریزی لازمی، سلبی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہیں، ان کا زور مردافگن ہوتا ہے، جب ہم ان سے مقابلہ کرتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ ہماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے، اب حیات (یا "جشنۂ حیات") کا بہاؤ توجہ کی طرف ہوتا ہے، بالفاظِ دیگر، اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کریں، اس کے استیصال کی خاطر سہی، تو زندگی کی تمام قوتیں اس کی جانب رُخ کرتی ہیں، اس طرح اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے، مثلاً اگر ہمیں بے خوابی کا مرض ہے تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کریں گے، اور اس کو دور کرنا چاہیں گے، بالفاظِ دیگر اس کا مقابلہ کریں گے اسی قدر یہ تکلیف زیادہ ہوتی جائے گی، اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بالکل بھول جائیں تو ہم ٹھنڈی نیند سو جائیں گے اسی طرح شر کے مقابلہ سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے،

شر کا مقابلہ خیر سے کرنا چاہئے ظلمت کا مقابلہ نور سے، ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہئے ظلمت کا مقابلہ ظلمت سے کرنا "ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے، اگر تمھیں[1] نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو

[1] احادیث میں خطرات و وساوس کو دور کرنے کے لئے بعض اذکار یا مطلق ذکر کی ترغیب دی گئی ہے، اوپر جو علاج پیش کر رہے ہیں، اس کا استنباط ان ہی احادیث سے کیا گیا ہے، جو عجیب الاثر نفسیاتی طریقہ ہے،

خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت وہمت پر نظر جماؤ، خود غرضی کے بجائے ایثار نفس کا خیال رکھو، اسی طرح تمہیں غصہ کے بجائے حلم، بیماری کی بجائے صحت، کج خلقی کی بجائے خوش خلقی، شکایت کی بجائے صبر وشکر، خلق کی جبہ سائی کے بجائے رازق مطلق کا خیال اپنے ذہن مین جمانا چاہئے، تمھارا معروض فکر جو ہوگا، رفتہ رفتہ وہی تم بھی بن جاؤ گے یہی معنی ہین جامی ساؔئی کے اس قول بلیغ کے ؎

گر در دل تو گل گزرد گل باشی — در بلبلِ بے قرار بلبل باشی!
تو جزوی و حق کل است گر روزے چند — اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی!

اسی فکر کے ایک دوسرے اعتبار پر غور کرو، دنیا مین وہی چیز بُری ہے جس کو ہم بُرا سمجھتے ہین، اگر ہم اس کو بُرا نہ سمجھین تو ممکن ہے کہ وہ ہمارے جسم کو آزار پہنچائے، لیکن وہ ہمارے قلب کو چھو نہین سکتی، یاد رکھو دنیا مین ہر چیز کی قیمت رائے پر منحصر ہے، اور رائے تمھارے اختیار مین ہے، جب چاہو اسے کو ترک کردو، پھر اس ملاح کی طرح جس نے اپنے جہاز کو سمندری پہاڑیون سے بچا نکالا ہو تمھیں ہر طرف سکون نظر آئے گا، اگر تم اپنی رائے کو ترک کردو تو پھر یہ شکایت باقی نہ رہے گی، کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا، اس شکایت کو ترک کردو کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہے گا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ عقلمند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہین"۔

خیالات کا ماحول پر اثر ناقابلِ انکار ہے، خیالات کی پختگی اور قوت انسان کی روح کو سخت جسمانی تکلیف مین بھی مطمئن اور قوی رکھ سکتی ہے، ارادہ نتیجہ ہے توجہ کا یعنی خیال وفکر کا، جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے، ان ہی پر توجہ کو مرکوز کرتا ہے، انہی کو ذہن میں دہراتا ہے، الٹتا ہے پلٹتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا مملو ہوتی ہے، اور یہی خیالات عالم آثار مین عمل کی صورت اختیار کرتے ہین، خیال حقیقت ہے، عمل اس کا ظہور ہے، ولیم جیمس نے سچ کہا ہے" زندگی کا سارا ڈرامہ ایک ذہنی ڈرامہ ہے ساری مشکل ذہنی مشکل ہے" میدان فکر کو خس وخاشاک سے پاک کرکے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو، باغبانی کے بیجون کی طرح خیر کے انتخاب مین بھی حزم واحتیاط ضروری ہے، اور جس طرح بیج کو پودے کی شکل مین نمایان ہوتے کچھ عرصہ لگتا ہے

اور تمہیں انتظار کرنا پڑا تھا اسی طرح خیالات کو قلب میں تغیر پیدا کرنے اور ہر نیک عمل میں ظاہر ہوتے دیر لگتی ہے تمہیں پست ہمت نہ ہونا چاہیے اور نہ رنجیدہ اگر تم نے اپنا کام قاعدے کے موافق کیا ہے خس و خاشاک کو صاف کیا ہے، نیک خیالات کے بونے میں احتیاط برتی ہے، تو شادمانی و مسرت، طمانیت و بے دلی سرور کیف وہ گلہائے شاداب ہیں جو نتیجہ کے طور پر تمہیں حاصل ہوں گے،

ان حقائق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلمند جانتا ہے کہ دنیا میں اوس کا کوئی دشمن نہیں، اگر اوس کا کوئی دشمن ہے تو خود اس کا نفس ہے، اَعْدَیٰ عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ (البیہقی میں حدیث ابن عباسؓ) اس لئے نہ وہ کسی پر ملامت کرتا ہے، اور نہ کسی کی مذمت، بردلی کے ساتھ محاسبۂ نفس کرتا ہے، صبر و سکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے، صرف یہی نہیں کرتا بلکہ کسی مزید قرض میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے، قلب کا دربان بن جاتا ہے، بد یا سلبی خیال کو داخل ہونے نہیں دیتا، داخل ہو جائے تو فوراً نیک یا ایجابی خیال کو اس کی جگہ لے آتا ہے، اپنے افعال کو بے عیب بناتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حال نتیجہ ہے ماضی کا، قسمت نتیجہ ہے خیالات کا !

کامل گوید جہان تمام و اہل است ناقص گوید کہ کوتہ است و سہل است

شطرنج ہمان عرصہ ہمان رخت ہمان این بردن و باختن ز علم و جہل است

(سحابی استرآبادی)

اسلامی قانون فوجداری

مولانا سلامت خان المعروف بہ خدا اقت خان کی کتاب الاختیار کا ترجمہ جس میں تمام تعزیرات و جرائم کے متعلق پندرہ ابواب میں اسلامی قانونِ فوجداری کی تمام دفعات فقہ کی مستند کتابوں کے حوالہ سے جمع کی گئی ہیں قانون پیشہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید اور ضروری ہے، ضخامت ۳۵۲ صفحے قیمت ہے،

منیجر

عہدِ مغلیہ کے دو پروانے

از

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدر آباد

رسالۂ معارف ماہ دسمبر ۱۹۴۳ء مین عنوان مندرجۂ بالا کے تحت جو جواب معارف کی جانب سے شائع ہوا ہے، سطور ذیل مین اس کے متعلق بعض امور واضح کئے جاتے ہین،

واضح ہو کہ سلطنتِ آصفیہ مین گذشتہ ڈیڑھ صدی تک جو آئین ریاست اور نظم و نسق رائج تھا، وہ مغلیہ اصول کے مطابق تھا، معاشون کی عطا اون کی بحالی اور ضبطی اور طریقہ کارروائی سب کے سب بالکلیہ مغلیہ اصول کے پابند تھے، اس لئے انھی امور کی روشنی مین زیر بحث پروانون پر مزید غور کیا جائے تو نامناسب نہین ہوگا،

اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ دورِ مغلیہ مین معاشون کی عطا بذریعۂ "فرمان" یا پروانہ ہوتی تھی، سند یا تصدیق نامہ کے ذریعہ معاش عطا نہیں کی جاتی تھی، "پروانچہ" کے نام سے بھی مغلیہ عہد کے کاغذات موجود ہین، پروانچہ، پروانہ کی تصغیر ہے، اور بلحاظ وجاہت شخصی پروانہ اور پروانچہ کا اجراء ہوتا تھا،[1]

جو عطا یا بادشاہ یا دیوان کے حکم سے ہوتی تھی، وہ عطیۂ سلطانی سے موسوم ہوتی، اور زیادہ موثق اور دیرپا تصور کیجاتی، جاگیردار یا بعض صوبہ دار جو معاش اپنی جاگیر یا اپنے علاقہ مین عطا کرتے تھے، تو وہ اس کی سند خود دیتے تھے، لیکن بعد مین اکثر اس کی توثیق شاہی بھی ہوجاتی تھی، اور اب یہ عطیۂ سلطانی

---

[1] دفتر دیوانی حیدرآباد مین مغلیہ عہد کے کاغذات بھی موجود ہین،

ہو جاتی، جو وثیقہ اس عطا کا جاری ہوتا، اس کی عبارت میں اس امر کا بھی اظہار کر دیا جاتا کہ معاش اولاً کن کی عطا کردہ تھی،

اگر عطا کے وثیقہ (فرمان، پروانہ، سند) میں نسلاً بعد نسلٍ یا دوام کے الفاظ درج نہ ہوتے تو عموماً معطیٰ لہ کے مرنے کے بعد معاش ضبط ہو جاتی تھی، اور اس کے بعد دوبارہ اس کے فرزند اکبر یا وارث کے نام تجدید ہوتی اور یہ تجدید پھر ذریعہ فرمان، پروانہ یا سند ہوتی تھی، گویا معاش کی تحقیقات ہو کر دوبارہ بحالی ہوتی،

اراضی معاش کے لئے ایک مرتبہ عطا ہو جانا کافی ہوتا تھا، لیکن نقدی معاش یعنی یومیہ، سالیانہ آ معمول کے لئے ہر سال دفتر دیوان سے جدید احکام کی ضرورت ہوا کرتی تھی، ہر سال اس قسم کی معاش کے لئے سرکاری حکم نافذ ہوتا تھا،

اس وضاحت کے بعد اب اگر فرمان نصرت جنگ کے متعلق غور کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ قاضی ثنا بدرالدین کو کاکڑ خان اور محمد شفیع خان نے جو معاش عطا کی تھی، اس کی توثیق عطیۂ سلطانی کی حیثیت سے ہوتی تھی اس فرمان کے باعث ان کی عطا شاہی عطا ہو جاتی ہے، یہ تصدیق نامہ نہیں، بلکہ دراصل فرمان یا پروانہ ہی ہے،

اسی طرح دوسرا پروانہ ایک احکام یا سرکاری مراسلہ کی حیثیت رکھتا ہے، چار فلوس یومیہ مسجد کے تیل کے اخراجات کے لئے جاری ہوا ہے،

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے پروانے یا احکام ایک اصولی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے معارف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ

"ان تصدیق ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلقہ کے عمال حکومت قاضی صاحب موصوف کو بار بار پریشان کرتے رہتے تھے، اس لئے قدیم عطایا کی تصدیق دوبارہ کرائی گئی، چنانچہ اسی تصدیق کے لئے عہدِ عالمگیری میں وہ پروانہ صادر ہوا، پھر امتدادِ زمانہ سے جب عمال نے دوبارہ چھیڑ چھاڑ کی تو عہدِ محمد شاہی میں جدید تصدیق نامہ جاری ہوا"۔

چنانچہ خود اس امر سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ہر سال سند مجدّد نہ طلب کرنے کا تذکرہ آخری پروانہ مین کر دیا گیا ہے یعنی اس پروانہ کے بعد دوبارہ اوس کی تجدید کی ضرورت نہین رہی،

معارف: لفظ تصدیق نامہ بطور اصطلاح استعمال نہین کیا گیا تھا، بلکہ بطور مفہوم تھا کہ اس فرمان یا پروانہ شاہی سے سابق عطا کردہ پروانہ کی توثیق و تصدیق ہی مقصود تھی، انہین "فرمان" کے بجائے تصدیق نامہ سے خاص طور پر اس لیے تعبیر کیا گیا کہ مستفسر کی خدمت مین یہ اشارہ کیا جا سکے، کہ ان کے ان مراسلہ فرامین کے ذریعہ قاضی بدر الدین کو اراضی معاش پہلی مرتبہ عطا نہیں کی گئی تھی، بلکہ وہ فرامین جو ان سے پہلے کے ہین، اُنھین مستفسر نے ارسال نہین کیا تھا، در اصل ابتداءً انھی کے ذریعہ اراضی عطا ہوئی تھی، اس لئے آخر مین کہا گیا تھا کہ

"اب اگر اصل پروانہ آپ ارسال کرین تو اس کی صحیح تاریخ متعین کیجا سکتی ہے"۔

ورنہ ظاہر ہے کہ عطیات کے لئے فرامین ہی جاری ہوتے تھے، اور وہ اصطلاحًا فرمان ہی کہے جائین گے،

"س"

عرب کی موجودہ حکومتین

جزیرۃ العرب کے ساتھ مذہبی تعلق وعقیدت کے باوجود ہندوستان کے مسلمانون کو نجد وحجاز کے علاوہ عرب کے دوسرے حصّون اور حکومتون کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے، اس لئے اس کتاب مین عرب کا تفصیلی جغرافیہ اور تمام قابلِ ذکر حکومتون نجد وحجاز، عسیر و یمن، لحج، نواحی تسعہ، بحرین، کویت اور فلسطین و شام کے مختصر حالات جمع کر دیئے گئے ہین،

ضخامت ۱۷۰ صفحے، قیمت: ۱۲ر

منیجر دار المصنفین

استفسار و جواب

فنِ تصوّف

اور

محدثین و صوفیہ مین تطبیق کی راہ!

جناب عبدالرحمٰن صاحب متعلم
پرنس آف ویلز کالج جموّن (کشمیر)

مخترمی جناب سید صاحب مدفیوضہٗ

السّلام علیکم

جب سے آپ کی ذاتِ گرامی سے غائبانہ تعارف ہوا ہے اُسی وقت سے یہ شوق دامنگیر رہا ہے کہ خط و کتابت ہی کے ذریعہ آپ سے کچھ استفادہ کیا جائے،

اپنے دینی شعور کی ابتدا ہی سے مین نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر مسئلہ مین کتاب و سنّت ہی کو معیارِ حق اور دلیلِ راہ بنایا ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ فقہی مسائل مین مسلمانون مین جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی نوعیت کو کسی حد تک سمجھ سکتا ہون، اور ان مسائل مین "اہلِ ظاہر" اور "اصحاب رائے" کے بین بین کی راہ یعنی "فقہاء محدثین" یا "اصحابِ حدیث" کے مسلک کی ترجیح کا قائل ہون، لیکن جو اختلاف محدّثین اور صوفیاے کرام مین پایا جاتا ہے، اس کی حقیقت کے سمجھنے مین ابھی تک پریشان ہون، اور اس الجھن سے نکلنے کے لئے سیرت نگارِ رسول ہی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے، اور وہ سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باطنی اور روحانی زندگی کے حالات و کیفیات کے بیان کرنے مین محدثین عظام اور

صوفیائے کرام میں کس کی ترجمانی زیادہ صحیح ہے، اور آپؐ کی پاک زندگی کے اس شعبہ کے علم و عمل کے جاننے میں کون سا گروہ حقیقت کے زیادہ قریب پہنچ سکا ہے، اور ان میں سے کس جماعت کا راستہ حق کا راستہ ہے؟ اور اگر یہ دونوں گروہ ہی افراط و تفریط سے نہیں بچ سکے، تو اہلِ حق کون ہیں، اُن اصحابِ اقتصاد کا طریق کیا ہے، اور اس مسلک کے ائمہ کون کون بزرگ ہیں؟ اسی سوال سے متعلق چند ایک سوالات ہیں جنھیں نمبروار درج کرتا ہوں!

۱۔ الاحسان (الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ الخ الحدیث) کی غایت کیا ہے؟

۲۔ کتاب اللہ کی تعلیم اور اُسوۂ حسنہ رسول اللہ میں الاحسان کے حصول کا طریق کیا ہے؟

۳۔ کیا "الاحسان" کے حصول کے لیے بیعت کرنا لازم ہے، اور اس کے بغیر الاحسان کا حصول ممکن نہیں؟

۴۔ زمانہ نزولِ قرآن کی عربی زبان قرآن مجید اور احادیثِ رسول اللہ میں بیعت کا مفہوم کیا ہے؟ عہدِ جاہلیت میں اس کی غرض و غایت کیا تھی، اور پھر اسلام میں کیا ہوئی؟

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افرادِ صحابہ سے الگ الگ مختلف اوقات میں جو بیعت لی، اُس کا اقرار اور غرض و غایت کیا تھی؟ اور جو پوری جماعتِ صحابہ سے مختلف اوقات میں لی اُسکے اقرار کے الفاظ اور غرض و غایت کیا تھی؟ کتبِ حدیث میں انکے نام اور اقرار کے جو الفاظ ہیں وہ کیا ہیں؟ عہدِ خلفائے راشدین میں اس انفرادی اور جماعتی بیعت کا کیا حال رہا؟

۶۔ صوفیائے کرام جو بیعت لیتے ہیں، کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟ کیا اس کی نظیر سنت میں ملتی ہے، اور کیا یہ عہدِ رسالت میں عہدِ خلافتِ راشدہ سے ہی رائج چلی آتی ہے؟ رسالت کے بعد کے دوروں میں اس کی کیا حالت رہی؟

میں اگرچہ "اصحاب الحدیث" کے مسلک کو راجح سمجھتا ہوں لیکن "اہلِ حدیث" کے نام سے ملک میں جو جماعت پائی جاتی ہے، وہ ایک طرف تو الاسلام کی بنیادی اور مرکزی دعوت کی علم بردار نظر نہیں آتی، اور صرف فقہ کے چند اختلافی مسائل ہی اس کی دعوت کا مرکز ہیں، جن کی طرف وہ سب کو

بلاتی ہے، اور دوسری طرف یہ کہ جن بزرگون کی طرف اپنی نسبت کرتی ہے، جہان ان کی زندگی کا حقیقی مقصد اوران کی دعوت کا مرکزی نقطہ اوس کی نظر سے اوجھل ہوگیا ہے، وہان ان بزرگون کی زندگی کا ایک خاص پہلو تو خاص طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور وہ ان کی زندگی کا روحانی حصہ اور نبوت کی وراثت کا باطنی پہلو ہے،

اور یہ شاید اس لئے لکھ گیا ہون کہ میرے سامنے ہمیشہ اسی کی نقاب کشائی کی جاتی رہی ہو، کیونکہ میں نے جس ماحول مین آنکھیں کھولین، اس مین فقہ کے اختلافی مسائل کا آنا چرچا تو نہ تھا، البتہ سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی سے لیکر مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہان سنگھ ضلع گوجرانوالا پنجاب) اور العارف باللہ مولانا عبد اللہ غزنوی اوران کے صاحبزادون تک کی کرامات، تزکیۂ نفس، روحانی بلندی اور انابت الی اللہ کی حکایات، ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ضرور تھیں،

اگرچہ مین نے اپنے بچپن مین اپنے ہی خاندان کے دو بزرگ جوان بزرگون سے مستفیض تھے دیکھے، مگر میرے ہوش سنبھالنے تک وہ ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے، اوراب صرف ان کی زبانی حکایتیں سنانے والے ہی باقی رہ گئے تھے، جو مزے لے لے کر بزرگون کی کہانیان سناتے تھے، تاہم اوس کا اثر یہ ہوا کہ بچپن ہی میں مجھے حضرت امیر المومنین سید احمد شہید اور مولانا شہید سے عقیدت ہوگئی، اور پھر انہی کی عقیدت نے میرے دل مین مولانا عبد اللہ غزنوی اوران کے خاندان سے محبت کا ایک خاص جذبہ پیدا کر دیا،

مین نے عربی اس لئے پڑھنی شروع کی تھی کہ مجھے قرآن مجید کا فہم نصیب ہو، لیکن افسوس کہ جب انٹرمیڈیٹ تک پڑھکر بھی قرآن کی زبان نہ آئی، تو قرآن مجید کیونکر سمجھ مین آئے، قرآن مجید سے مجھے جو دلچسپی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن فہمی اور مطالبِ قرآن کو حاصل کرنے کے لئے بھی آپ سے ہدایت اور مشورہ حاصل کرون،

قرآن فہمی کے لئے سامان پیدا کرنے کی ذمہ داری سب سے پہلے "دارالمصنفین" پر عائد ہوتی ہے بلکہ جہان تک جلد ممکن ہو عملی طور پر ندوۃ العلماء مین اس طریق پر قرآن مجید پڑھانے کا انتظام کیا جائے کہ قرآن فہمی کی راہ آسان ہوجائے

معارف:

مکرم زادکم اللہ علماً و عملاً

السلام علیکم، آپ کا خط پاکر مجھے بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ ایک مدت کے بعد مجھے ایسے کسی خوش خیال نوجوان سے مکاتبت کا اتفاق ہوا، آپ جس راہ پر ہیں، وہ بالکل ٹھیک ہے، بشرطیکہ اس راہ اور رائے کے مطابق آپ کو عقیدہ اور عمل کی سعادت بھی حاصل ہو، اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا، بحمد اللہ کہ آپنے فقہاء اور محدثین کے درمیان تطبیق کی راہ پالی ہے، تو اب محدثین اور صوفیہ کے درمیان راہ پانا بھی مشکل نہ ہوگا،

محدثین میں بھی صوفیہ گذرے ہیں، امام ابن حنبل، عبد اللہ بن مبارک، امام بخاری و مسلم ترمذی سب ہی صوفی حقیقی تھے، اور اصطلاحاً محدثین میں امام قشیری صاحب رسالۂ قشیریہ، ابو نعیم اصفہانی صاحب حلیۃ الاولیاء، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی طریق قادریہ کے بانی حنبلی المشرب اور ٹھیٹھ محدث تھے، اون کی کتاب غنیۃ الطالبین چھپی ہوئی ہے، اور آپ پڑھ سکتے ہیں، حافظ ابن قیم کی صوفیت پر ان کی کتاب منازل السائرین و مدارج السالکین گواہ ہے، اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ہیں، ان کے مکتوبات کا مطالعہ آپ کر سکتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ، اور ان کے اخلاف صدق محدثین دہلی بھی صوفی تھے، اور ان کی تصانیف موجود ہیں، مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سلوک کو صراط مستقیم نام کتاب میں مرتب کیا ہے، جو طبع ہوکر بار بار شائع ہوئی ہے، اُس کو بھی آپ پڑھ سکتے ہیں،

لیکن بات یہ ہے کہ حضرات محدثین رحمہم اللہ پر بحیثیت محدث ہونے کے صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے حالات و کمالات کے جاننے، اور دوسروں کو سُنانے کا فرض عائد ہے، یعنی ان کا یہ فرض نہیں کہ وہ بتائیں کہ ان حالات و کمالات کی حقیقت کیا ہے، اور ان کے حصول کی تدابیر کیا ہیں، کیونکہ یہ بھی ایک فن ہوگیا ہے، جس طرح فقہ اور کلام اور فرائض و تفسیر و حدیث ایک ایک مستقل فن ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی اصطلاحیں ہیں، اوسکی عملی و نظری مشکلات ہیں، جن کے سمجھانے کے لئے فقہاء مفسرین، محدثین، اور متکلمین کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح

فنِ سلوک کے لئے سالکین کاملین کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس فن کی علمی و عملی دقتون کو رفع کرین،

یہ فن نظری سے زیادہ عملی ہے، اس کے لئے ایسے کاملین کی ضرورت ہی جو اپنے حسنِ اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اسوۂ نبوی ہون، جو اپنے اعمال، آداب، اخلاق، عادات اور اتباع اوامر و نواہی مین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہون جن کی صحبت مین پرتوِ نبوی کا اثر ہو، اور جن کا سلسلۂ صحبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک صحبت تک منتہی ہو، جس کا اصطلاحی نام شجرہ ہے، جس طرح فنِ روایت مین اس کا نام سلسلہ ہے،

اسی مفہوم کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان لفظون مین بیان کیا ہے کہ علم حدیث جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کا سلسلہ ہے، یہ سلوک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا سلسلہ ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا سارا فیض صحبتِ نبوی کی تاثیر کا نتیجہ تھا، اون کے بعد صحابہ کے فیض سے تابعین اوٹھے، اور تابعین کے فیضِ صحبت سے تبع تابعین کا ظہور ہوا، یہ تین دور ایسے ہین جن مین پچھلی جماعت اگلی جماعت سے بحیثیت جماعت کے متاثر ہوئی مگر ہر دور مین جماعت کم اور کیف یعنی تعداد اور حالت مین کم ہوتی گئی، تبع تابعین کے بعد جب فتنون کا ظہور ہوا، تو تعداد اور بھی کم ہوگئی، اب جماعت کی صحبت جماعت سے جاتی رہی، اب اشخاص کاملین کی صحبت سے اشخاص با استعداد کے پیدا ہونے کا سلسلہ ہوا، جس کا نام متاخرین نے ارادت یا پیری و مریدی رکھدیا ہے، ورنہ قدما اور سلف صالحین کی اصطلاح صحبت ہی کی تھی، مرید کو صاحب یعنی صحبت یافتہ کہتے تھے، جیسے امام محمد اور قاضی ابو یوسف کو صاحب امام ابو حنیفہ کہتے ہین، اسی طرح حضرت شبلی و جنید کے مرید بھی صحبت یافتہ کہلاتے تھے، جیسے یون کہتے تھے کہ فلان شخص نے شبلی کی صحبت اوٹھائی ہے، یا جنید کی صحبت اوٹھائی ہے، یہ رسمی بیعت جو ایک مدت سے رواج پذیر ہے، یہ محض رسم و عرف ہے، اور جس کا مقصد یہ ہے کہ پیر و مرید کا باہمی معاہدہ ہے، کہ پیر اپنے علم کے مطابق تعلیم و تربیت اور خیر خواہی مین کمی نہ کرے گا، اور مرید اسکی تعمیل مین کوتاہی نہ کرے گا، اور اسکی اصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مین ہے، کہ آپ کبھی خاص خاص صحابہ سے اور کبھی حاضر مجلس صحابہ سے امور خیر پر بیعت لیتے تھے، تاکہ جن سے بیعت لیجائے، ان مین اس معاہدہ کی اہمیت ہو اور وہ اس کی تعمیل مین پوری ہمت صرف کرین،

اور ان کو یہ خیال رہے کہ میں نے اس بات کا معاہدہ کیا ہے، اس کے خلاف کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہو، اور چونکہ جس کے ہاتھ پر یہ معاہدہ کیا جاتا ہے، اوس سے عقیدت اور محبت ہوتی ہے، اور یہی عقیدت و محبت اس کے ہاتھ پر معاہدہ کئے ہوئے امور کی تعمیل پر آمادہ کرتی رہتی ہے، یہی اس بیعت کا حاصل ہے، شیخ اپنے سلسلہ کے ارادتمندوں کو امور خیر کی تعلیم دیتا ہے، ان کے حقائق سے باخبر کرتا ہے، اُن کی تعمیل کا طریقہ بتاتا ہے، اور سالک کے ذہنی اور عملی مشکلات کو حل کرتا رہتا ہے، مثلاً غرور بری چیز ہے، اب یہ امر کہ غرور کی حقیقت کیا ہے، اور غرور کہتے کس کو ہیں اور اوس سے بچنے کی تدبیر کیا ہے، اور ایا ہمارا فلاں کام غرور کی حد میں داخل ہے کہ نہیں، اس کا جواب نہ خالص محدّث دے سکتا ہے، اور نہ خشک فقیہ ان کو حل کرسکتا ہے، نہ مفسر بتا سکتا ہے، اور نہ متکلم ان کی عقدہ کشائی کرسکتا ہے، اب ان سوالات کا جواب جو بھی دے سکتا ہے، وہ شیخ طریقت ہے، جو ممکن ہے کہ محدث بھی ہو فقیہ بھی ہو مفسر بھی ہو یا نہ ہو، ہو تو بہتر ہے، نہ ہو تو حرج نہیں، مگر متبع ضرور ہو، جس نے اپنے بزرگوں سے اون کو سیکھا اور جانا ہے، یا اوس نے خود کتاب و سنت سے ان امور کی واقفیت پیدا کی ہے، اور عمل کرکے اس رتبہ پر پہنچا ہو کہ غرور و تکبر سے اپنی استعداد کے مطابق پاک و صاف ہو گیا ہے، اور دوسروں کو بھی اپنی تعلیم و صحبت سے ایسا ہی بنا سکتا ہے۔

اسی تقریر کو ایک اور نہج سے ذہن نشین کرتا ہوں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں دو صفتیں تھیں یُعلّمھم الکتاب والحکمۃ (یعنی آپ لوگوں کو کتاب الٰہی اور سنت نبوی کی تعلیم دیتے ہیں) ویزکیھم (یعنی آپ لوگوں کو عملاً بھی پاک صاف بنا دیتے ہیں، انکے رذائل کو دور کرکے ان کو فضائل سے آراستہ کرتے ہیں) ذات پاک میں یہ دونوں صفتیں یکجا تھیں، صحابہ میں بھی عموماً یہ دونوں صفتیں یکجا رہیں، تابعین میں کچھ کمی رہی تاہم ان میں بھی خاصی یکجائی رہی، تبع تابعین میں آکر یہ یکجائی ایک محدود حلقہ میں رہ گئی، اس کے بعد سے یہ یکجائی صرف اشخاص میں ہونے لگی، ورنہ عام طور پر حال یہ ہوگیا، کہ یُعلّمھم یعنی زبانی تعلیم کی صفت تو علماء اور فقہاء نے اختیار کرلی، اور یزکیھم یعنی تزکیہ کو صوفیہ نے اپنا کام بنالیا، پہلی چیز مدرسہ میں چلی گئی، اور دوسری خانقاہوں میں، مگر ہر دور میں بحمد اللہ تعالیٰ ایسے کاملین ضرور

ہوتے گئے، جو ان دونون صفتون کے جامع اور حامل تھے، اور وہی درحقیقت وارثِ نبوت تھے، مثلاً ہندوستان مین حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ان دونون کا جامع تھا، ان کے جانشینون مین بھی یہی جامعیت تھی،

آج کل یہ ہو گیا ہے کہ یُعَلِّمُھُم یعنی تعلیم نبوی کی خدمت علما، کا شغل ہے، اور یُزَکِّیھِم یعنی تزکیہ کا شغل صوفیہ کا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ یہ دونون صفتین یکجا ہون،

ہمارے اس بیان مین صوفیہ سے مقصود رسمی صوفی نہین جو درحقیقت دکاندار ہین، بلکہ وہ متبعین سنت مراد ہین جنھون نے علماً وعملاً اس راہ کا کمال حاصل کیا ہے، اور منزلِ مقصود تک پہونچتے ہین، صوفی اور تصوف کے لفظ سے بھی بعض لوگون کو بھڑک ہوتی ہے، سو یہ اصطلاحی نام ہے، جو لفظی بدعت ہے، جس طرح تفسیر اور مفسر، حدیث اور محدث، فقہ وفقیہ کی اصطلاحین ان کے خاص جدید معنون مین صحابہ کے عہد مین مروج نہ تھین، یہ لفظ اوس زمانہ مین اگرچہ بولے گئے ہین، اور یہ عربی زبان کے لفظ بھی ہین، مگر ان کے اصطلاحی معنی اون سے مختلف ہین، یہی حال تصوف اور صوفی کا ہے، خواہ یہ لفظ صوف سے نکلا ہو، یعنی پشمینہ پوشی سے جو زہد کی علامت تھی، یا فلسفہ کے لفظ کی طرح یہ یونانی تھیا سوفی سے آیا ہو، لفظ کی بحث نہین تاہم یہ لفظ بے شبہہ بدعت ہے، یعنی بنا ہے، اور باہر سے آیا ہے، مگر اوس کی حقیقت بدعت نہین ہے، قرآن پاک کی اصطلاح مین اوس کو اخلاص کہئے، اور حدیث کی رو سے اوس کو احسان کا نام دیجئے، اور کام کے لحاظ سے اس کو اخلاص فی الدین اور تقوی کے حصول کا فن کہئے، وَلَا مُشَاحَۃَ فِی الْاِصْطِلَاحِ،

یہ امر بے شبہہ صحیح ہے کہ جس طرح دوسرے فنون مین غیر جگہوں سے چیزین آکر شامل ہوئی ہین، مثلاً فقہ کے لئے اصول فقہ تیار ہوگیا، اور قیاس نے ایک فنی صورت اختیار کر لی، علم کلام وعقائد مین فلسفہ داخل ہوگیا، اور منطقی وفلسفی دلائل وحجج وبراہین کا شیوع ہوا، اسی طرح اس علم احسان واخلاص مین بھی بعض باتین باہر سے آگئی ہین، جن کو خواہ تدابیر کے درجہ مین لاکر مان لیا جائے، یا اُن سے بھی احتیاطاً پرہیز برتا جائے، دونون پہلو ہوسکتے ہین، مگر اس سے اصل فن پر کچھ اثر نہین پڑ سکتا، اس فن کی جو اصطلاحین نئی ہین، وہ افہام وتفہیم کی سہولت کی

خاطر اختیار کی گئی ہین، اون سے بڑھکر حماقت ہے جب کوئی چیز فن بن جاتی ہے، تو اصطلاحات سے چارہ نہین ہو سکتا

اب اس فن کے مسائل پر آئیے، مسائل اولین یہ ہین :-

رذائل کیا کیا ہین، ان رذائل کی حقیقت ازروے قرآن وحدیث کیا ہے، اوران رذائل کی بیخکنی کیونکر ہو،

ان کے بالمقابل فضائل کیا ہین، ان کی حقیقت کیا ہے، اوران کے حصول کی تدابیر کیا ہین، ہم غیبت سے کیونکر بچین، ریا سے کیونکر محفوظ رہین، جھوٹ بولنا کیونکر ہم سے چھوٹ جائے، اوراوس کے بالمقابل صدق مقال اوراخلاص عمل کیسے پیدا ہو، توکل، صبر وشکر، استقامت کیسے حاصل ہو، ہمارے قلب سے دنیا کی محبت کیسے نکلے، اوراللہ تعالیٰ کی محبت اوس مین کیسے بیٹھے،

وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً (خدا کی طرف سب سے کٹ جا) اور رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (ایسے لوگ جن کو بیع وفروخت وغیرہ دنیا کے اشغال خدا کی یاد سے غافل نہین کرتے) یہ حالت ہم کو کیسے حاصل ہو اوران فرائض قلبی کے ادا کرنے کا طریق کیا ہے، نماز مین قنوت یعنی خوف وخشوع کیونکر پیدا ہو، اکلِ حلال کیا ہے، تقوی کیسے ہو، ایمان باللہ تعالیٰ کیونکر قوی ہو، دوام ذکر کیسے حاصل ہو وغیرہ،

یہان تک تو مین نے نفسِ فن کی حقیقت کا ذکر کیا ہے، اوران غلطیون کو دور کرنا چاہا ہے، جو آس کے متعلق عام لوگون مین شائع ہین، اب آپ کا سوال یہ ہے کہ اب یہ کہان ہے، سو اوس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ہر علم وعمل کے ماہر عہد بعہد کم ہوتے جاتے ہین، اسی طرح اس کے بھی بہت کم ہین، علماے غزنویہ امرتسر کی تعریف مین نے بھی سُنی ہے، جو محدّث اور صوفی ایک ساتھ تھے، پہلے علماے اہل حدیث مین بھی ایسے لوگ تھے، اوراب بھی ہونگے، میرے علم مین سیالکوٹ کے مولانا ابراہیم صاحب کو ضروران امور سے مناسبت ہے، گو مدّت سے اُن سے ملاقات نہین ہوئی، علماے احناف مین بھی بحمداللہ لوگ ہین،

قرآن پاک کے متعلق جو کچھ آپنے کہا ہے، وہ صحیح ہے، دارالعلوم ندوہ اوردارالمصنفین دونون مین اسکے سلسلے ہین

"س"

عہدِ اسلامی مین تعلیم نسوان کی درسگاہین

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی.
ممتاز مینشن، خیرت آباد، حیدر آباد دکن

۱- تاریخون سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی ہجری مین دنیاے اسلام کے مساجد مین مدرسے قائم ہو گئے تھے، اور ان مین ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی، پانچوین صدی ہجری سے علٰحدہ درسگاہین اور جامعات تعمیر ہونے لگے، چنانچہ علامہ شبلیؒ اور مولوی ابو الحسنات صاحب ندوی کے مقالہ سے اسلامی ممالک اور ہندوستان کے مدرسون کا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے، لیکن ان مین کسی نسوانی مدرسے کا نام شریک نہین ہے، یہ تو نہین ہوسکتا کہ نسوانی مدارس موجود ہون، اور ان کا تذکرہ تاریخ اسلام کی کتابون مین نہ ہو، لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا، کہ دنیاے اسلام مین علٰحدہ مدارسِ نسوان نہین تھے،

۲- جب مدارس نسوان قائم نہین تھے، تو دنیاے اسلام مین تعلیم نسوان کا کیا طریقہ تھا، ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کس طرح ہوتی تھی، یہ تو نہین کہا جا سکتا کہ اسلام مین عورتون نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہین کی کیونکہ تاریخ اسلام مین بیسیون خواتین کے نام ملتے ہین، جنھون نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پائی، اور حتی کہ بعض شیوخ وقت کے اساتذہ مین خواتین کے نام شامل ہین،

۳- شیخ سعدی کی گلستان کے ساتوین باب کی چوتھی حکایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مدرسون مین لڑکے اور لڑکیان (جن مین بالغ بھی شامل تھے) ایک ساتھ درس لیا کرتے تھے، نیز الف لیلہ کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ

اس وقت لڑکے اور لڑکیان ایک ساتھ تعلیم لیا کرتی تھین تو کیا یہ صحیح ہوسکتا ہے، کہ ابتدائی تعلیم جو موجودہ ثانوی تعلیم قرار دیجا سکتی ہے، اسلامی مدارس مین مخلوط ہوتی تھی،

۴۔ غالباً ہندوستان میں شروع سے اس طرح کی مخلوط تعلیم نہیں تھی، بلکہ اکثر محلوں میں شرفا کے مکانوں میں مدرسۂ نسوان قائم ہوتے تھے،

غالباً ان کا نہج تقریباً وہی تھا جس کو مولانا نذیر احمد نے اپنی کتاب میں اصغری خانم کے مدرسے کا حال لکھا ہے، فقط،

معارف: جواباً عرض ہے:۔

جہاں تک میری نظر ہے چھوٹی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے گھر سے باہر کوئی چہار دیواری مسلمانوں نے نہیں بنائی، اور نہ مساجد میں اور نہ کتاب یعنی مکاتب میں لڑکوں کے ساتھ وہ نظر آئیں، صرف سواحلِ ہند میں ایک ساحلی شہر تھا جہاں ابن بطوطہ کو لڑکیوں کے مکاتب نظر آئے، اس کا بیان ہے کہ سواحلِ ہند میں ہنور کے مقام میں ۱۳ مکتب لڑکیوں کے تھے

(جلد ۳ ص ۱۳۳، مصر)

عملی تواتر سے جو واقعہ ثابت ہوتا ہے، وہ وہی ہے جو اصغری خانم کے مدرسے کا ہے، یا یہ کہ امرا اپنی لڑکیوں کے لئے کوئی معلمہ یا مستند و ثقہ و معمر معلّم بپابندی پردہ مقرر کرتے تھے، جیسا کہ سلاطین مغل کی خواتین زیب النسا وغیرہ کے احوال میں ہے،

بےشبہ اعلیٰ تعلیم جیسے علم حدیث وغیرہ میں یہ طریقہ بھی مذکور ہے، کہ مساجد و محافل میں کسی استاد یا محدث کے املا میں عورتیں بھی حاضر ہو کر سنتی تھیں، اور روایت کرتی تھیں، بلکہ وہ بھی مجلس میں بیٹھکر املائے حدیث کرتی تھیں، اور مرد تلامذہ و سامعین ان کو سنتے تھے، لیکن پہلی صورت میں عورتوں کا انتظام نشست الگ تھا اختلاط نہ ہوتا تھا، جیسا کہ احادیث میں ہے، کہ عورتوں کے لئے الگ انتظام ہوتا تھا، اور دوسری صورت میں بیچ میں پردہ حائل ہوتا تھا، جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے احوال میں ہے، یا اگر وہ بہت بڑھی ہوتی تھیں تو کشف وجہ بھی کرتی ہوں گی، مگر تصریح میری نظر میں نہیں ہے،

یہ بھی تھا کہ باپ اور بھائی اپنی عزیز بیٹیوں اور بہوؤں کو خود اعلیٰ تعلیم دیتے تھے، اور اس کی مثالیں

بکثرت ہندوستان مین پہلے بھی تھین، اور اب بھی ہین، اور بعض فقیہات اسلام کے تذکرون مین بھی ہے، بعض اپنے شوہرون سے حاصل کرتی تھین،

"س"

رجب علی سرور اور اس کی ایک عرضداشت

جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی ایم اے
قائم مقام پرنسپل اسلامیہ کالج بریلی

۱- رجب علی سرور کے مفصل حالات کہان ملین گے؟

۲- "انشاے سرور" مین ایک عرضداشت ہے جس کی نقل درج ذیل ہے :-

"عرضداشت حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، عرصہ ہوا خانہ زاد نے نسخہ فسانۂ عجائب پیشکش کیا تھا، گو ہدیۂ مور ناتوان پیش سلیمان زمان اور تحفۂ گدا آگے سلطان جہان کہ حقیقت نہیں رکھتی مگر نگاہ پرورش شاہنشاہ زمان مثل خورشید درخشان گل و خار پر یکسان ہوتی ہے، اس امید پر ہمہ تن چشم و گوش عتبہ بوسی کا رہا، لیکن ناسازی بخت نے محروم رکھا، اب جمعیت پریشانی اور سامان بے سامانی سے گھبرا کر عرض رسا ہوں کہ اگر سلک کفش برداروں اور زمرہ جان نثاروں میں آ رہا ہوں تو سر خاک افتادہ سے کرۂ خمیدۂ فلک تک پیر چھو آؤن، بقدر لیاقت خانہ زاد کو جو کچھ فرمان بندگان والا ہو، بجا آوری اس کو فخر و سعادت جان کر جان تک دریغ نہین، الٰہی کرسی جود و سخا و علم کشورستانی و شہرہ جہانبانی بلند آوازہ و گلشن سلطنت شاداب، تر و تازہ بادے

الٰہی درجہان باشی باقبال جوان بخت و جوان دولت جوان سال (ص)

خیال ہے کہ یہ عرضداشت سنہ ۱۲۳۳ھ اور سنہ ۱۲۴۰ھ کے درمیان لکھی گئی، اس میں کسی شبہہ کی گنجایش نہیں، سنہ ۱۲۴۰ھ میں فسانۂ عجائب ختم ہوئی،

اس عرضداشت کے مخاطب غالبًا واجد علی شاہ نہیں، اس لئے کہ وہ ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے، اور ۱۸۴۲ء ہی میں سرور کا تقرر ہو گیا "عرصہ ہوا خانہ زاد نے نسخۂ فسانۂ عجائب پیش کش کیا تھا" اس جملہ سے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے اگر اس عرضداشت کو واجد علی شاہ کی طرف منسوب کیا جائے، تو مذکورہ بالا فقرہ مہمل ہو جاتا ہے، اس لئے قیاس ہے کہ یہ عرضداشت نصیرالدین حیدر کو لکھی گئی، لیکن پھر محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کو کیوں چھوڑا جائے ؟ ان دونوں کو ادب سے خاص لگاؤ تھا ؟ کیا یہ قیاسات صحیح ہیں؟

۳۔ تذکرۂ خندۂ گل میں رقعات جعفر زٹلی کا ذکر ہے، یہ رقعات تمثیلی اور فرضی ہیں یا اصلی اور حقیقی؟

معارف : محترمی زاد لطفکم

السلام علیکم :۔ آپکے دونوں گرامی نامے موصول ہوئے، جوابًا گذارش ہے :۔

۱۔ رجب علی سرور کے حالات محض جستہ جستہ حسب ذیل ماخذ میں ملتے ہیں تذکرہ ذکا (اسپرنگر) گلشن بیخار شیفتہ (ص ۱۰۵) سخن شعرا ر نساخ (ص ۲۱۳) گلستان سخن قادر بخش (ص ۲۶۵) موجودہ دور کی تصنیفات میں سیر المصنفین تنہا حصہ اول (ص ۱۴۹) مقدمۂ انتخاب فسانہ عجائب مخمور اکبرآبادی، جواہر سخن (ہندستانی اکاڈیمی) تاریخ ادب اردو سکسینہ، وغیرہ میں ذکر آیا ہے،

۲۔ فسانۂ عجائب کی تاریخ اختتام تصنیف آپنے ۱۸۲۴ء کہاں سے متعین کی ہے ؟ اس کی تاریخ تو خود مصنف نے خاتمۂ تصنیف میں لکھی ہے،

جس نے کہ سنا اس کو جی میں یہ لگا کہنے ۔۔۔ یارب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا
تاریخ سرور اس کی منظوم ہوئی جس دم ۔۔۔ بے ساختہ جی بولا نشتر ہے رگ دل کا

۱۲۴۰ھ

۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء

رجب علی سرور کے سوانح میں آپ کی نظر سے گذرا ہوگا، کہ غازی الدین حیدر کی شان میں اس نے ایک قصیدہ اس امید میں لکھا کہ شاید وطن کی واپسی کی اجازت مل جائے، پھر نصیرالدین حیدر کے زمانہ میں

وہ فسانہ عجائب کا مسودہ اور قصیدہ لیکر لکھنو واپس آیا،

اس واقعہ سے آپ کی اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے، کہ انشاء و سرور سے جو عرضداشت آپنے نقل کی ہی، وہ واجد علی شاہ کے بجائے نصیر الدین حیدر ہی کے نام ہو، غالبًا جو قصیدہ وہ لکھکر لایا تھا، اوس کو اور فسانۂ عجائب کو اوس نے اس کے سامنے پیش کیا ہو، اور کوئی پذیرائی نہ ہونے پر یہ عریضہ بطور یاددہانی پیش کیا ہو، اور "عرصہ ہوا" سے اشارہ اسی پہلی درخواست کی طرف ہو،

نصیر الدین کے نام اس عرضداشت کے ہونے مین یہ قیاس بھی کام آسکتا ہے، کہ تصنیف کے خاتمہ کے بعد ہی مصنف نے اس سے فائدہ اٹھانے اور اس کو اپنی زندگی خوشگوار بنانے کا ایک ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہو، محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کا زمانہ اس کے بعد آتا ہے، اور وہ کتاب کے عہد تصنیف سے دور پڑ جاتا ہی،

۲- تذکرہ خندۂ گل ہمارے یہان موجود نہین، کہ آپ کے اس سوال کا مقصود سمجھ سکون، اگر مدعا جعفر زٹلی کے رسالہ "اخبار دربار معلی" سے ہے، تو اس مین فرضی و تمثیلی وقائع بیان کئے گئے ہین، شیرانی کی کتاب "پنجاب مین اردو" مین اس کا مفصل ذکر آیا ہے، نیز اردو شہ پارے مین بھی تذکرہ ہے، مراجعہ فرمائین،

"ص"

دولت عثمانیہ جلد اول

(مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے رفیق دار المصنفین)

یہ مسلمانون کی زندہ حکومت ترکی کے عروج و زوال اور جمہوریہ ترکی کی مفصل تاریخ ہے، پہلے حصہ مین عثمان اول سے مصطفٰے رابع تک پانچ صدیون کے مفصل حالات ہین، اردو مین اب تک ترکی حکومت کی اس سے زیادہ مبسوط اور مستند تاریخ نہین لکھی گئی، حجم ۰۹ ۴ صفحے، قیمت سے ر

مینجر

وفیات

وَفاتِ عیسیٰؒ

حضرت مولانا سید محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی نے جو حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اوّلین خلفا میں تھے، ۵ ۲ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کی سہ پہر کو جونپور میں جہاں وہ بغرض علاج آئے تھے، ۶۳ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، خیال تھا کہ مرشدؒ کے بعد ان کی ذات مرجع انام ہوگی، مگر اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو آپ جانتا ہے، اون کا وطن محی الدین پور ضلع الہ آباد تھا، نسباً سادات کرام میں سے اور گھر کے خوشحال زمیندار تھے، غالباً ۱۳۰۱ھ کی پیدایش ہوگی، بچپن ہی سے وہ زاہد و متقی تھے، باپ کے حکم سے انگریزی شروع کی، اور بی اے تک پڑھ کر چھوڑ دیا، اور ایک اسکول میں انگریزی کے ماسٹر، اور آخر میں گورنمنٹ کالج الہ آباد میں عربی کے پروفیسر ہوگئے،

نوجوان ہی تھے کہ الہ آباد و کانپور میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ سننے کا اتفاق ہوا، جو باتیں سُنیں وہ دل میں گھر کرتی چلی گئی، اور روز بروز یہ نشہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا، یہانتک کہ بیعت و ارادت سے مشرف ہوکر مجاہدہ و ریاضت میں مصروف ہوئے، آخر تکمیل طریق کے بعد خلافتِ اجازت سے سرفراز ہوئے،

اللہ تعالیٰ کی شان بندہ نوازی نظر آتی ہے کہ ایک انڈر گریجوایٹ میں جس نے صرف انگریزی ہی کی تعلیم پائی تھی چند روز میں یہ انقلاب پیدا ہوا کہ اوس نے اس عمر میں آکر سرکاری ملازمت کے ساتھ عربی تعلیم پوری کی، اور قرآن و حدیث کا علم حاصل کیا، اور ساتھ ہی قرآن پاک حفظ کیا، اور سیرت و صورت میں یہ رنگ پیدا کیا، کہ کوئی دیکھ کر یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ

وہ انگریزی کا ایک حرف بھی جانتا ہے،

سلوک وطریقت، مسلک ومشرب، صورت وسیرت حتی کہ نشست وبرخاست اور خط وکتابت اور گفتگو مین اپنے مرشدِ کاملؒ سے اس درجہ مشابہت حاصل کر لی تھی، کہ ان کو دیکھکر یہ کہنا پڑتا تھا ع

تاکس نہ گوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری

وہ نہایت ہی زاہد، عابد، متبعِ سنّت، اور مرشد کے اصولون کے سختی سے پابند تھے، اطراف مین حلقۂ ارشاد بھی قائم تھا، اپنے مرشدؒ کی متعدد کتابون کے خلاصے اور شروح شائع کئے، جن مین سب سے اہم انفاسِ عیسٰی ہے، جو سلوکِ اشرفی کی معتبر ترین کتابون مین ہے، مردون کے لئے بہشتی زیور کا خلاصہ بہشتی ثمر کے نام سے کیا، جو مکاتب مین رائج ہوئی تفسیر بیان القرآن کا خلاصہ مترجم قرآن کے حواشی کے طور پر کیا، جو الہ آباد میں زیرِ طبع تھا، حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کمالات امدادیہ کے طرز پر انھون نے کمالاتِ اشرفیہ لکھی جو فنِ سلوک ومعرفت کے متعلق ان کی استعداد وصلاحیت کی آئینہ دار ہے،

صاحبِ مقامات مستجاب الدعوات، اور وارداتِ صحیحہ سے سرفراز تھے، کالج سے پنشن لینے کے بعد اپنے گاؤن مین مقیم ہو گئے تھے، اور طالبین کو اپنے رشد وہدایت سے سیراب کرتے تھے، اسی عالم مین دو برس ہوئے کہ ایک شب تہجد کیلئے اٹھے، تو فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد امسال دوسرا حملہ ہوا، جس کے بعد علاج کے لئے جونپور آئے، جہان ۱۱ رمارچ کو تیسرا حملہ زبان پر ہوا، اور زبان بند ہوگئی، وفات کے آخری لمحہ میں آخری بار زبان کھلی، اور تین دفعہ بلند آواز سے اللہ اللہ کہا اور جان، جان آفرین کے سپرد کر دی،

عجیب بات یہ ہے کہ جونپور مین وہ بالکل مسافرانہ وارد تھے لیکن حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے متعدد خلفاء، مجازین اور صحبت یافتہ بغیر کسی ظاہری داعیہ کے عین وقت پر پہنچ گئے، انہی میں سے ایک نے یٰسین پڑھی، ایک نے غسل دیا، ایک نے نماز جنازہ پڑھائی اور سب نے پڑھی، اور دو نے قبر مین اتارا، جونپور ہی مین محلہ رضوی خان کی اکبری مسجد کے عقب مین ۲ بجے رات کو تدفین عمل مین آئی، رحمہ اللہ تعالیٰ،

"س"

ادبیات

ساحل و طوفان

از جناب روشن صدیقی

بوئے گل، وفا کو پریشان نہ کر سکے
معذور تھے کہ چاک گریبان نہ کر سکے

دشوار اس قدر تو نہ تھی منزلِ حیات
یہ اور بات ہے کہ ہم آسان نہ کر سکے

وہ راز اوس نے میرے جنون کو عطا کیا
تمکینِ ناز بھی جسے پنہان نہ کر سکے

ہر انقلاب مین غمِ ہستی کی تھی نمود
ہم اعتبارِ گردشِ دوران نہ کر سکے

اس درجہ ہم کو غم کی نزاکت کا پاس تھا
درمان تو کیا تصورِ درمان نہ کر سکے

ایسی ہی ایک لہر کو کہتے ہین زندگی
جو امتیازِ ساحل و طوفان نہ کر سکے

شبنم ہے لالۂ چمنِ عشق کے لئے
وہ آرزو جو تجھ کو پشیمان نہ کر سکے

ممنونِ یک خیال رہی زندگی روشن!
کیا خواب تھا کہ جس کو پریشان نہ کر سکے

حشرِ جذبات

از جناب مولوی سید ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری

بیتاب سی اک زندگیِ عشق بسر کی
اللہ رے اشارت تری دزدیدہ نظر کی

ہر جلوۂ رنگین مین تجھے دیکھا ہے مین نے
کھاتا ہون قسم دلکشی شام و سحر کی

میں اپنی تمناؤں کا حاصل اسے سمجھوں | وہ شرم اگر رکھ لے مرے دیدۂ تر کی
جس سجدے سے روشن تھا کبھی خانۂ ہستی | پھر مجھ کو تمنا ہے اسی سجدۂ در کی
بوسے لیے اس حسن مکمل کے نظر سے | کرنی نہ تھی جرأت مجھے محفل میں مگر کی
سینے پہ مرے رکھ دیا کیا ہاتھ کسی نے | اب دل کی خبر ہے نہ مجھے درد جگر کی
میں اپنی ہی تخئیل میں کر لیتا ہوں سجدے | تصویر ہے آنکھوں میں تری راہ گزر کی
اٹھی نہ مری سمت کبھی بزم طرب میں | ہاں مجھ کو شکایت ہے ترے حسن نظر کی
اب کیا کہوں وہ قصۂ فرسودۂ بے کیف | جس طرح قفس میں ترے اک عمر بسر کی
بے بہرہ ہے تو آگہیٔ کیف اجل سے | تقلید تو کر زندگیٔ برق و شرر کی
تھی عشق میں ثاقب غم کونین کا حاصل | وہ رات جو فرقت میں کبھی میں نے بسر کی

غزل

از جناب شیدا کاشمیری

چمن میں جب بھی نظر منظر بہار آیا | نہ جانے کون تصور میں بار بار آیا
نہ وہ زمانہ، نہ وہ موسم بہار آیا | جو ابتدائے محبت میں ایک بار آیا
فضائے وادی غربت میں اے بہار وطن | "ترے بغیر تجھے کس طرح قرار آیا"
بیان کروں تو بیاں ہو سکے نہ محشر تک | وہ لطف جو مجھے ہنگام انتظار آیا
ہم اس کی یاد کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں | وہ جس کو بھولے سے ہم پر نہ اعتبار آیا
ادائے سجدہ کو جھک جھک گئی جبین نیاز | جو چلتے چلتے کہیں نقش پائے یار آیا
وہ گل ہوں میں جو خزاں آشنا ہوا نہ کبھی | چمن چمن سے مجھے مژدۂ بہار آیا
کبھی جو تیرے تصور میں کھو گیا شیدا | تو اس کے لب پہ ترا نام بار بار آیا

مطبوعات جدیدۂ

ادبیاتِ فارسی مین ہندوؤن کا حصہ } ازجناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ لکچرار پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ رغیر مجلد عہ ر، پتہ انجمن ترقی اردو نمبرا، دریا گنج دہلی،

مسلمانون کی بے تعصبی اور علم دوستی کا یہ ناقابلِ تردید کارنامہ ہو کہ اپنے دورِ حکومت مین اونھون نے بلا تفریق قوم ومذہب، ہندوستان مین تعلیم کی عام اشاعت کی، اور اپنی کل محکوم قومون کو ترقی کے یکسان مواقع عطا کئے، یہ انھی کی علم دوستی کا نتیجہ تھا، کہ یہان علم ایک خاص محدود طبقہ کی میراث سے نکل کر کل باشندون کی مشترک ملک بنا، اور مختلف طبقون مین ارباب کمال پیدا ہوئے، جو علم کی مسند سے لیکر ایوانِ حکومت تک مسلمانون کے شریک وسہیم رہے، اس موضوع پر سب سے اول حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف مین "ہندوؤن کی علمی وتعلیمی ترقی مین مسلمانون کی کوشش" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا، جو آج تک اس موضوع پر لکھنے والون کے لئے رہنمائی کا کام دیتا ہے، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی موضوع پر ایک مفید اور قابلِ قدر اضافہ ہے، لائق مولف نے ڈی لٹ کی ڈگری کیلئے انگریزی مین یہ مقالہ لکھا تھا، اسی کا انھون نے ملخص ترجمہ کردیا ہے، مسلمانون کے دورِ حکومت میں حکومت کی زبان فارسی تھی، اور اہلِ علم واصحاب قلم اسی زبان مین اپنے کمالات کا اظہار کرتے تھے، لائق مولف نے فارسی زبان مین ہندوؤن کی علمی وادبی خدمات کو دکھایا ہے، کتاب پانچ ابواب مین تقسیم ہے، پہلا باب مغلون سے قبل کے حالات میں ہے لیکن یہ محض فارسی سے ہندوؤن کے تعلق کے آغاز پر مشتمل ہو، ان کی اصلی علمی تعلیمی تاریخ مغلون کے عہد سے شروع ہوتی ہے، چنانچہ دوسرے باب مین عہد اکبری، تیسرے مین جہانگیر سے

فرخ سیر تک، چوتھے مین شاہ عالم اول سے شاہ عالم ثانی تک مغلون کے دورِ انحطاط کے، پانچوین مین ان کے آخری دور سے لیکر موجودہ زمانہ تک ہندوؤن کی فارسی تعلیم، ہندو ادبار وشعرار، مصنفین و مترجمین اور ان کی تصانیف و تراجم کا تذکرہ، اور بعض اہم مصنفات پر تبصرہ ہے، ان کی خطاطی کے بھی چند نمونے دیئے ہین، چھٹے باب مین گذشتہ پانچون ابواب پر جامع تبصرہ ہے، کتاب کے آخر مین مولوی محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور کے تین مضامین "گورونانک کی فارسی تعلیم"، "مثنوی ہیر بیراگی" اور "بدائع وقائع انندرام مخلص" جو اورنٹیل کالج میگزین مین نکل چکے ہین، بطور ضمیمہ کے شامل کردیئے گئے ہین، ماخذون کی فہرست اور اشخاص وکتب کا انڈکس بھی دیدیا ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا کامل استیعاب بہت مشکل ہے، تاہم مصنف نے جہانتک ممکن تھا محنت و تلاش سے کافی مواد کو جمع کردیا ہے، اور ان کی کامیابی مبارکباد کے لائق ہے،

مُردون کی مسیحائی از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۴ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد درجہ اول للعہ ردرجہ دوم ہے، ادارۂ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن،

مذکورۂ بالا کتاب سیرۃ نبوی اور اس کے متعلقات پر مولانا عبد الماجد صاحب کے سترہ مضامین کا مجموعہ ہے، مردون کی مسیحائی، یتیم کا راج، یتیم کی جیت، دوراستے، ذکرِ رسول کی بلندی، سیرت نبوی اور علماے فرنگ، محبوب سے خطاب، فقر محمدی، صابر رسول، خطبۂ نکاح، مسئلۂ طلاق، عتاب محبوب، میلادی روایات، ناک کا داغ، اعداے رسول کی ہجو، اسوۂ حسنہ، تقدیس رسول، ان مین سے بیشتر مضامین مستقل اور بعض کسی شبہہ یا استفسا کا جواب ہین، خطبۂ نکاح اور مسئلۂ طلاق کا تعلق گو براہ راست سیرت نبوی سے نہین ہے، لیکن ان دونون امور پر اسوۂ رسول اور سنتِ رسول کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے، اس لئے بے تعلق بھی نہین ہین، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کثرت سے مضامین بلکہ مستقل کتابین لکھی جا چکی ہین، کہ اگر کسی دوسرے موضوع پر اس کا عشر عشیر بھی لکھا جاتا، تو اس مین کوئی نیا پہلو پیش کرنا مشکل تھا، لیکن ع

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایان

اس لئے آج بھی اس موضوع کی تازگی کا وہی عالم ہے، اور عقیدت مندون کو سیرت پاک مین ہدایت و رہنمائی کے نئے نئے گوشے ملتے جاتے ہین، چنانچہ مذکورہ بالا کتاب مین مصنف کی شان امتیاز قائم ہے، اس مین عرب جاہلی کی ظلمت و ضلالت، عربون کی بداخلاقیون اور بدکرداریون، ان کے تمرد و سرکشی کے واقعات ظہور اسلام، اور تبلیغی تشدد کے حالات اور اسلامی تعلیمات کے انقلاب انگیز اثرات اور اس کے نتائج اور خلق نبوی و اسوۂ نبوی کے مختلف سبق آموز پہلوؤن کو اس موثر اور دلنشین انداز مین پیش کیا گیا ہے، کہ سیرت نبوی کی روح نبوت کی عظمت و جلالت اسلام کی حقانیت و صداقت حق و باطل کی کشمکش، اور حق کی فتحمندی و سربلندی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، یون تو پورا مجموعہ پڑھنے کے لائق ہے لیکن ذکر رسول کی سربلندی، سیرت نبوی اور علماے فرنگ، اور صابر رسول خاص طور سے مفید مضامین ہین، یہ مضامین نہ صرف مسلمانون کے بلکہ درس اخلاق، اور تشکیل سیرت کی حیثیت سے غیر مسلمون کے بھی پڑھنے کے لائق ہین، مولانا کی انشا کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے، ان کی انشا پردازی سادے خطوط مین رنگ بھر دیتی ہے، اور یہ تو موضوع ایسا والا ویز ہے کہ قلم مین خود کیف و تواجد پیدا ہو جاتا ہے، البتہ اس کتاب کا نام کچھ موزون نہین معلوم ہوتا ہے،

نقش حق از جناب پروفیسر محمد اکبر صاحب منیر تقطیع بڑی، ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت، ار، پتہ:- مدرسۃ البنات جالندھر،

اسلام کی بنیاد و تمامتر خدا اور اس کے رسول کی محبت پر ہے، اور اس کی آخری منزل تصوف تو سرا سر عشق و محبت ہے، اور اکثر صوفیاے کرام نے اس محبت کو عشق سے تعبیر کیا ہے، لیکن بعض محتاط بزرگ باری تعالی کے ساتھ عشق کی اصطلاح کا انتساب اسکی عظمت و تقدیس کے منافی تصور کرتے ہین، لائق مؤلف نے اس کتاب مین اسی عشق و محبت کی تشریح کی ہے، اور کلام مجید احادیث نبوی ائمۂ اسلام اور اکابر صوفیہ کے اقوال و صاحب دل شعراء کے کلام کی روشنی مین عشق و ایمان کی حقیقت، اس کے عناصر اور لوازم و شرائط، اسلام و ایمان اور نفاق کی تعریف مومنون اور منافقون کے اوصاف و خصوصیات پر بحث کر کے دکھایا ہے کہ ایمان نام ہے یقین و اذعان اور محبت خدا

ورسول کا اسی کو صوفیائے کرام نے عشق سے تعبیر کیا ہے، اور عشق یا محبت کا یہ درجہ صرف احکام الٰہی کی پابندی اور سنت رسول کی پیروی سے حاصل ہوسکتا ہے، یہ بحث نہایت لطیف و دلنشین ہے، اور موضوع کی نزاکت کے باوجود قلم جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹنے پایا ہے، اس مقالہ مین اسلام کی اصلی روح بیان کر دی گئی ہے جو اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

چند جواہر ریزے از جناب خواجہ عبدالحمید صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت طباعت بہتر، پتہ اقبال اکیڈمی تاجپورہ ظفر منزل لاہور،

خواجہ عبدالحمید صاحب سر اقبال مرحوم کے حلقہ نشینون مین ہین، ان کو اکثر ان کی خدمت مین حاضری کا اتفاق ہوتا تھا، انھون نے مختلف صحبتون مین علامہ مرحوم کی زبان سے جو علمی نکات و لطائف، ان کے سفر اور قیام یورپ کے متفرق حالات اور مختلف قسم کے جو مفید و دلچسپ واقعات سُنے تھے، ان کو کئی سال ہوئے معارف مین "چند جواہر ریزے" کے نام سے مضمون کی شکل مین شائع کیا تھا، اب اقبال اکیڈمی نے اس کو کتابی صورت مین شائع کر دیا ہے، یہ مختصر جواہر ریزے اقبال مرحوم کے عقیدتمندون کے لئے تبرک کی حیثیت رکھتے ہین،

میلاد شمسی، از شمسی عباد الرحمٰن صاحبہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۴ر پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی،

عام طور سے جو پرانے طرز کے میلاد نامے رائج ہین ان مین عموماً غیر معتبر روایتین زیادہ ہوتی ہین جس سے ذکر رسول کا صحیح فائدہ حاصل نہین ہوتا، اس لئے زنانہ مجلسون مین پڑھنے کے لئے مصنفہ نے یہ میلاد نامہ لکھا ہے، گو یہ میلاد نامہ بہت مختصر ہے، لیکن اس میں روایات کی صحت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، زبان صاف اور شستہ ہے، زنانہ مجلسون مین پڑھنے کے لئے اچھی کتاب ہے،

پودون کی کہانی از جناب سیدالدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات عثمانیہ یونیورسٹی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۰ر پتہ سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن،

یہ مختصر رسالہ فن نباتات پر ہے، اس مین نباتات کی زندگی کے مختلف پہلوؤن پر علمی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور نباتات کی عام خصوصیات غذا اور توانائی حاصل کرنے کے طریقون، نائٹروجن کے قدرتی مخزنون، اس کے حصول اور نباتات کی افزایش نسل کے قدرتی نظام کو عام فہم اور سادہ طریقہ سے بیان کیا گیا ہے،

اخلاص مشرق از جناب شفیق جونپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۴ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت: عہ، پتہ: مصنف دفتر نظام ادب جونپور،

جناب شفیق جونپوری نواح مشرق کے مشہور شاعر ہین، ان کے کلام کے بعض مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہین، اخلاص مشرق ان کے قصائد، حمد و نعت و منقبت اور دوسری مذہبی نظمون کا مجموعہ ہے، مصنف گو نئے دور کے شاعر ہین، لیکن فن سے باخبر اور شعر و ادب کے صحیح ذوق شناس ہین، اس لئے ان کی شاعری قدیم و جدید کے امتزاج کا لطیف نمونہ ہے، زبان کی صحت و صفائی اور حلاوت و شیرینی ان کے کلام کا نمایان وصف ہے، یہ تمام نظمین خیالات کی بلندی و پاکیزگی، اور لطف زبان کے اعتبار سے پڑھنے کے لائق ہیں، کاغذ اور کتابت و طباعت اتنی خراب ہو کہ اس لطیف شراب کے جام سفالین سے نگاہ کو تکلیف پہنچتی ہے، تعجب ہو کہ مصنف کی شعریت نے اس کو کیونکر گوارا کیا،

کلام حرمان از جناب حرمان خیرآبادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عکر
پتہ: دفتر مجلس اردو نمبر ۴، جی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور،

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب مصنف کے کلام کا مجموعہ ہے، اس کا بیشتر حصہ غزلون پر مشتمل ہے، چند نظمیں اور رباعیان ہین، شاعر کو اس سرزمین سے نسبت ہے جس نے ریاض اور مضطر کو پیدا کیا، اس نسبت کا اثر ان کے کلام مین ظاہر ہے، مصنف مین شاعری کی پوری صلاحیت ہے، اور جذبات و خیالات اور زبان و طرز ادا کے لحاظ سے کلام خاصہ ہے، لیکن ابھی نومشقی کی وجہ سے جا بجا خامیان نظر آتی ہین جن کا ہونا تعجب انگیز نہین، اور جو امید ہے کہ مشق و مہارت سے دور ہو جائینگی،

جلد ۵۳ ماہ جمادی الاول ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۴ء عدد ۵

مضامین

شذرات

مسلمان طلبہ کی امداد کے لئے ڈاکٹر حامد علی صاحب حیدر آبادی کے گرانقدر عطیہ کی خبر جس کی مقدار تیرہ لاکھ ہے، اخبارات میں شائع ہوچکی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایسی اولو العزمی اور ایسی عظیم الشان فیاضی کی یہ پہلی مثال ہے جس کی شکرگذاری ساری قوم پر فرض ہے، مخیر معطی کے حالات اور اس عطیہ کی تاریخ معلوم ہونے کے بعد اس کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، وہ کوئی موروثی دولتمند اور بڑے سرمایہ دار نہیں، بلکہ اپنی قوت بازو سے ترقی کرکے انھوں نے یہ دولت پیدا کی، موصوف ڈاکٹر ہیں اور حیدر آباد میں معمولی تنخواہ سے پندرہ سو ماہانہ تک ترقی کی، لیکن اتنے بڑے عطیہ کے لئے پندرہ سو ماہانہ کی کوئی بساط نہیں، موصوف کے دل میں شروع سے ہونہار اور حاجتمند مسلمان طلبہ کی امداد کے انتظام کی لگن تھی، اس مقصد کے لئے وہ طالب علمی کے زمانہ سے انتہائی سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی بسر کرکے روپیہ بچاتے، اور اس کو بڑھانے کے لئے مختلف کاروبار میں لگاتے رہے، انکی نیت کی برکت سے اسکی تعداد تیرہ لاکھ تک پہنچ گئی اور عمر بھر کی یہ ساری کمائی انھوں نے اک مشت قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کے لئے وقف کردی،

کسی موروثی امیر کبیر کا قومی کام کے لئے اپنے معمور خزانہ کا کوئی حقیر حصہ دیدینا کوئی بڑی قیمت نہیں رکھتا، لیکن اپنی قوت بازو سے حاصل کیا ہوا ساری عمر کا سرمایہ جو تکلیف اٹھا کر جمع کیا گیا ہو اس طرح قوم کی نذر کردینا ایثار و قربانی کا وہ نمونہ ہے جس کی نظیر مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل سے ملیگی،

قومی فیاضی کا یہ نمونہ ہماری پوری قوم خصوصاً صاحب ثروت طبقہ کے لئے سبق آموز ہی، اللہ تعالیٰ اسکو اس کی تقلید کی توفیق اور مجبز محسن قوم کو اس کار خیر کا صلہ عطا فرمائے،

ترقی پسند ادب کی عریاں نویسی اور فحش نگاری کے متعلق معارف میں بھی لکھا جا چکا ہی اور ہندوستان کے بہت سے سنجیدہ اصحاب علم اور اہل قلم حضرات نے بھی اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں لیکن یہ وبا برابر پھیلتی جاتی ہے، اس پست اور مخرب اخلاق لٹریچر کی اشاعت مین پنجاب کے بعض ادبی رسالوں کا قدم سب سے آگے ہی، اور انھوں نے ادب لطیف کے پردہ میں ادب کثیف کی اشاعت کو مستقل مقصد بنا لیا ہے، جس کو کوئی سنجیدہ انسان پڑھ نہین سکتا،

پنجاب خصوصاً لاہور ہندوستان میں اردو ادب کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے لیکن افسوس ہیں وہاں کے بر عکس نام نہند "ترقی پسند" ادیب، اپنی نافہمی سے اُسکے اس امتیاز کو داغدار بنا رہے ہیں، ناصاف آبادی کے اژدحام میں جہاں وبا کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے، حفظان صحت کے اہتمام کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے، اس لئے پنجاب کی ادبی پیداوار کی نگرانی کی بڑی ضرورت ہی اور یہ فرض سب سے زیادہ وہاں کے سنجیدہ اصحاب قلم پر عائد ہوتا ہی جن کی لاہور میں کمی نہیں وہاں زمین شعر و ادب کے زمیندار بھی ہیں، آسمانِ صحافت کے مہر بھی ہیں، راہِ ادب کے سالک بھی ہیں، کثافتون کی تطہیر کے لئے زمزم و کوثر بھی موجود ہیں، ان کی موجودگی میں یہ ادبی گمراہی حیرت انگیز ہے، ان کی نوک قلم میں تو بڑے بڑے فاسد مادوں کو خارج کر دینے کی قوت ہے، یہ ادبی فساد تو ان کی ادنیٰ توجہ سے دور ہو سکتا ہے،

گذشتہ مہینہ اسلامک ہسٹری کانفرنس کا دوسرا اجلاس اسلامیہ کالج پشاور میں منعقد ہوا، اس کے

قائم مقام سکریٹری جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اس کی روداد ہمارے پاس اشاعت کے لئے بھیجی ہے، جو اسی پرچہ میں شائع کیجارہی ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلامی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر عربی، انگریزی اور اردو میں مقالات پڑھے گئے اور اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون اور عربی فارسی اور ترکی زبانوں کی اشاعت و ترقی نادر قلمی کتابوں کی فہرست سازی اور اسلامی آثار قدیمہ کے تحفظ کے متعلق بہت سی مفید تجویزیں منظور ہوئیں، ابھی کانفرنس کی عمر دو تین سال سے زیادہ نہیں ہے، اس لئے پابندی کے ساتھ اس کے اجلاس ہوتے رہنا بھی غنیمت ہے، لیکن آیندہ ہم کو اس کے فاضل کارکنوں سے اس سے زیادہ ٹھوس کام کی توقع ہے، اگر کانفرنس کی جانب سے اس کا مجوزہ رسالہ نکل جائے تو یہ ایک مستقل اور مفید کام ہوگا، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون کے سنجیدہ علمی رسالوں کی تعداد انگریزی اور اردو ملاکر دو چار سے زیادہ نہیں ہے، اس لئے ایسے رسائل کی بڑی ضرورت ہے۔

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کی صحت کچھ عرصہ سے برابر خراب رہتی ہے، گذشتہ مہینہ مزاج زیادہ ناساز ہوگیا تھا، اب بفضلہ تعالیٰ افاقہ ہے، لیکن ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق کچھ دنوں تک مکمل آرام کی ضرورت ہے، اور زیادہ خط و کتابت کی بھی اجازت نہیں، گرمی کی شدت کی وجہ سے مئی، جون دو مہینے دارالمصنفین میں قیام بھی نہ رہے گا، اس لئے ناظرین معارف اور دوسرے تعلق رکھنے والے اصحاب سے گذارش ہے کہ وہ موصوف کی صحت کے خیال سے کچھ دنوں تک غیر ضروری خط و کتابت خصوصاً ایسے خطوط سے احتراز فرمائیں جن کے جواب میں دماغی بار پڑنے کا احتمال ہو، باقی ضروری خطوط کا جواب ملتا رہے گا،

مقالات

خطبۂ صدارت مجوزہ اردو کانفرنس بنگال

"اواخر ۳۹ء یا شروع ۴۰ء مین بنگال مین اردو کانفرنس بڑے پیمانہ پر منعقد ہونے والی تھی اوس کی صدارت کی خدمت حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے سپرد ہوئی تھی، مگر کسی وقتی مجبوری سے یہ مجوزہ کانفرنس منعقد نہ ہوسکی، اس کانفرنس کے لئے جو خطبۂ صدارت لکھا گیا تھا اس مین اردو ہندی کے مسئلہ کے بعض پہلوؤن اور بعض ایسے نظریون اور دلیلون پر غور کیا گیا تھا جو آج کل بھی ہندی کے بعض ممتاز حامیون کے قلم و زبان پر ہیں، اتفاق سے اس وقت کاغذات میں اس خطبہ کا مسودہ مل گیا جس کو ذیل مین شائع کیا جاتا ہی کہ ان مسائل پر صحیح نقطۂ نظر بھی سامنے آجائے، اسی طرح خطبہ کے آخر میں بنگال کے مسلمانون سے جو کچھ خطاب کیا گیا تھا، وہ آج بھی اُن توجہ کا طالب ہی"

"م"

ہمزبانو! ممنون ہون کہ آپنے اپنی محفل کی صدارت کی عزت دیکر اپنی زبان کی خدمت کا ایک اہم موقع عنایت فرمایا آج کل نہ صرف دُنیا ایک نازک دور سے گذر رہی ہے، بلکہ خود ہمارا ملک بھی ایک ایسے پرخطر دور سے گذر رہا ہو کہ اگر مسلمانون نے تھوڑی سی غفلت برتی تو پھر اس نقصان کی تلافی صدیوں میں بھی نہیں ہوسکتی، ہم آپس میں سیاسیات میں کتنے ہی مختلف ہون، مگر اس بارہ مین ہم مین سے ایک کو بھی اختلاف نہین کہ ہم کو اس ہندوستان مین مسلمان ہی ہوکر جینا اور مسلمان ہی ہوکر مرنا ہے، البتہ یہ خیال ہمارے ساتھ ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان ہین، اس لئے ہم پر

جس طرح بحیثیت مسلمان ہونے کے فرائض ہین، بحیثیت ہندوستانی ہونے کے بھی ہم پر کچھ حقوق ہین، اور جہانتک ہوسکے ان فرائض اور حقوق کے دوہرے بوجھ کو اٹھا کر ہی آگے کو چلنا ہے، اور ایسی کوشش کرنا ہو کہ ان دونون مین تصادم اور ایسی ٹکر نہ ہو جو دونون کو پاش پاش کر دے،

ہم نے اس مشکل کو اسی دن سمجھ لیا تھا جس دن اس سرزمین پر پہلی مرتبہ پاؤن رکھا تھا، یہ اسی رواداری اور صلح جوئی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں خواہ عرب سے آئے، ترکستان اور خراسان سے آئے، ایران سے آئے، افغانستان سے آئے، مگر یہان آکر نہ وہ عرب رہے، نہ ترک رہے، نہ ایرانی رہے، اور نہ افغانی، خالص ہندوستانی ہوگئے، عربون نے عربی، ترکوں نے ترکی، ایرانیون نے فارسی اور افغانون نے پشتو چھوڑ کر اسی دیس کی بولی، اپنی بولی بنائی، اور ایسی بنائی کہ وہ اس زبان میں شاعری اور انشا پردازی کرنے لگے، اردو تذکرہ کی کتابون مین سیکڑون ایسے شاعر ملین گے، جن کے حال مین لکھا ہو گا کہ ان کے باپ دادا، عرب، ایران اور ترکستان سے آئے مگر وہ خود اسی ملک کی زبان بولنے اور اس مین داد سخن دینے لگے،

آج ہمارے دیس کی جو بولی ہے، اور جس کو آج سب ہندو مسلمان بول رہے ہین، وہ اسی دیس کی پیداوار ہے، وہ عرب، ایران، ترکستان سے نہیں آئی، فرق اتنا ہے کہ مسلمانون نے اپنی زبانون کے کچھ لفظ بھی اس مین ملا دیئے اور ایسا ہونا ضروری تھا، زبان بولنے والون کی ضرورتون کا آئینہ ہوتی ہے، اس لئے مختلف قومون کے درمیان قومون کی مختلف ضرورتون کی بنا پر اختلاف ہونا ضروری ہے، ایسے اختلاف سے ایک زبان دو نہین بنجاتی، مسلمانون کا ایمان ایمان ہی ہے، اور ہندوؤں کا دھرم، دھرم ہی رہیگا، ہمارا مذہبی فاقہ روزہ کہلائے گا، اور ان کا برت، ہم حج اور زیارت کرتے ہین، اور وہ تیرتھ، ہمارا مردہ جنازہ ہوتا ہے، اور ان کا ارتھی، ہم مر کر جنت جاتے ہیں، اور وہ بیکنٹھ، لیکن اس اختلاف کو اتنا بڑھانا کہ ہم پانی پئین، اور وہ جل، ہم اوپر کہین اور وہ تھا، اور ایسے ہی اختلافون کو اور بڑھا بڑھا کر ایک بولی کو دو بنانے کی کوشش کرنا ہمارے نزدیک مسلمانون کا جرم عظیم اور ہندوؤن کا مہاپاپ ہے،

یہ زبان جس کو ہم ہندو مسلمان آج بول رہے ہیں یہ آج نہیں ایک ہزار برس میں بنی ہے، اس کے بنانے میں ہندو مسلمان بزرگون کی ایک ہزار برس کی عمر بیتی ہے، یہ ہندوستان مین ہندو مسلمان سمجھوتہ کی سب سے بڑی یادگار ہے، جو لوگ اس زبان کو مٹانا چاہتے ہین، وہ ہندو مسلمانون کے تعلقات کو نئے سرے سے پھر الجھانا چاہتے ہین، اور ایک ہی ملک بلکہ ایک ہی صوبہ، بلکہ ایک ہی شہر، بلکہ ایک ہی گاؤن مین ایسی برابر کی قومین پیدا کرنا ہے جو ایک دوسرے کی نہ سمجھ سکین، اور جب ایک دوسرے کی زبان نہ ملے گی، تو دل کیا ملے گا،

ہندو بھائیون کے ایک طبقہ مین اس زبان کے خلاف جو جذبہ کام کر رہا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ بدیسی ہے اور قومیت پروری کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اپنے دیس کی بولی بولین، اور بدیسی بولی کو چھوڑ دین، حالانکہ ہندوستان کی کوئی زبان چند بدیسی عربی اور فارسی لفظون کے مل جانے سے عربی اور فارسی نہین بن جائیگی، جیسے چند انگریزی لفظون کے ملنے سے انگریزی نہین بن جاتی، اگر ہم کو بدیسی سے ایسی ہی چڑ ہے تو پہلے یہان سے مسلمانون، عیسائیون اور پارسیون کو نکالنا چاہئے، انگریزی علوم اور تمام یورپین ایجادات اور وہان کی مصنوعات سے ملک کو خالی کر دینا چاہئے، بلکہ خود سنسکرت کو یہان سے خارج کیجئے، کہ وہ بھی سنٹرل ایشیا سے آئی ہے، اور برہمنون کو بھی نکالئے کہ وہ بھی باہر سے آئے ہین،

صاحبو! راہین دو ہین، ایک یہ کہ ہم یہ سمجھین کہ ہندوستان خالص ہندوون کا ملک ہے، اس مین جو کچھ ہو وہ خالص ہندوانی ہو، زبان وہی ہو، لباس وہی ہو، تعمیر وہی ہو، مذاق وہی ہو، علم و فن وہی ہون، اور جو بھی اس ملک کی چہار دیواری کے اندر رہے، وہ اسی کا محکوم ہو کر رہے، یہ راہ بے حد خطرناک اور مشکلون سے بھری ہوئی ہے اور اس راہ کی کامیابی مین بہت کچھ شک کیا جا سکتا ہے، دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ ہندوستان ایک گلدستہ ہے جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہین، ع

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

لیکن رنگ و بو کے اس اختلاف کے باوجود وطن خواہی کے دھاگے نے ان سب کو ایک جگہ باندھ کر ایک

بنا دیا ہے، یہ وہ راستہ ہے، جس پر چل کر ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی قوم زندہ رہ سکتی ہے، اور کل کا جز بنکر کل کی طاقت کا باعث ہو سکتی ہے،

میرے نزدیک کسی ہندو طبقہ کا قومیت و وطنیت کے مفہوم کو اتنا تنگ سمجھنا کہ خود اس ملک کے مختلف رہنے والے بھی وہاں کے اصلی رہنے والے ثابت نہو سکین، ان کی وہی موروثی اور پرانی تنگ خیالی ہے جس نے تاریخ میں ان کو ہمالیہ اور سمندر کی چار دیواریوں مین بند اور چھوت اور چھوت کی پرانی لڑائی ہزارون برس سے کھڑی کر رکھی ہے، اور جس نے تاریخ کے ہر دور مین ان کے اندر نفاق پیدا کیا ہے، اور انہی کے اندر کے مظلوم فرقون کو مجبور کیا ہے، کہ وہ باہر کا سہارا ڈھونڈین، اور باہر والون کو اپنی مدد کے لئے اپنے گھر بلائین، اور نتیجہ مین اپنے ساتھ دوسرون کو بھی غلامی کی زنجیرون میں اسیر کرائین، یہ ایک تاریخی نکتہ ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہین لیکن جسکو کسی موقع پر کبھی بھولنا نہیں چاہئے،

اس زبان کو جو اس وقت ملک کے بڑے حصہ مین بولی اور سمجھی جاتی ہے، خالص اسلامی بولی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے، یہ ہندو مسلمانون دونون کی محنتون اور کوششون سے بنی اور پروان چڑھی ہے، یہ حقیقت ہر، لیکن اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش برابر جاری ہے لیکن حقیقت کی سچائی چھپائے نہین چھپ سکتی، ہم خود بھی اس غلطی مین تھے کہ شاید تیس چالیس برس کی لگاتار کوششیں اس حقیقت پر پردہ ڈال چکی ہین، مگر پچھلے سال اردو دن منانے کی جو تحریک ہوئی، اور اس مین پنجاب سے لیکر بہار تک کے مسلمانون کے ساتھ ہندو دوستون نے بھی جو دلچسپی لی، اور جو تقریرین کیں، اُن سے یہ پتہ چلا کہ یہ زبان ملک کی زبان ہی پر نہین بلکہ دل مین بھی اتر چکی ہے، اور حقیقت کے پہچاننے والے ہندو دوست بھی اس کی سچائی کو دل سے مانتے ہین، اور اسی کو اپنی مادری زبان مانتے ہین، خصوصیت کے ساتھ سر تیج بہادر کی وہ فاضلانہ تقریرین جو الہ آباد، لکھنؤ، پٹنہ، حیدر آباد اور ابھی کشمیر مین ہوئین، ان سے ہم کو پوری طرح یقین ہوتا ہے، ملک مین بہت سے ایسے سمجھدار ہندو ہین جو سچائی کے ساتھ اس حقیقت کو مانتے ہین، اور ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہین کہ سنسکرتی

ہندی کے خواہشمند در اصل ملک کے باشندوں کے درمیان تفریق اور عناد کا بیج بو رہے ہیں،

الہ آباد یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر پروفیسر جھا نے ابھی جنیو پہنے ہوئے گوالیار میں ایک تقریر فرمائی ہے جس میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سنسکرتی ہی ہندی ہندوستان کی عالمگیر زبان بن سکتی ہے، یہ خیال واقعات اور عملی سیاسیات سے قطع نظر کرکے ظاہر کیا گیا ہے، اور یہ سمجھ کر ظاہر کیا گیا ہے، کہ گویا ہندوستان میں آریہ برہمنوں کے سوا کوئی اور قوم نہیں بس رہی ہے، یہ خیال مدراس اور دکن میں ظاہر کیا جاتا، تو پروفیسر صاحب کو معلوم ہو جاتا، کہ یہ واقعات کی منطق سے کس قدر دور ہے، وہاں کی ڈراویڈی قومیں جو تامل تلگو اور کنڑی بولتی ہیں، وہ ہندی پرچار کی اس لئے مخالف ہیں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ہمارے دشمن آریہ برہمن اس بہانہ سے ہماری زبانوں کو اور کلچر کو مٹانا چاہتے ہیں جب یہ خیال ایک ایسے طبقہ کا ہے جو مذہب کے روسے گویا ہندو ہی ہے، تو ملک کے اس طبقہ کا یہ خیال کیوں نہ ہو جو اتحاد وطن کے علاوہ ہر حیثیت سے ان سے الگ ہے۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ زبان اسلامی زبان ہے، تب بھی یہ کوئی کہہ نہیں سکتا، کہ اقلیت والی زبان کے چل جانے سے اکثریت والی قوم کے رواج و تمدن و تہذیب مٹ جائیگی، وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیشہ قائم رہے گی، جیسا کہ اب تک قائم رہی ہے لیکن اقلیت کی اس زبان کے مٹ جانے سے جس کے مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے تو اقلیت کے خاتمہ میں کوئی شک ہی نہیں رہتا، کیونکہ اس کی عمارت تو اسی قسم کے ستونوں پر کھڑی رہ سکتی ہے،

پنجاب کے ایک ہندو پروفیسر نے یہ بات خوب کہی ہے کہ اردو مادری زبان کی حیثیت سے تو اسی ملک میں بولی جاتی ہے جہاں ہندو آبادی کی اکثریت ہے یعنی انبالہ سے لیکر بھاگلپور تک اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، جیسے کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ، پنجاب اور بنگال، وہاں کے ہر ایک صوبہ میں اوسی صوبہ کی زبان ان کی مادری زبان ہے، کشمیر کے مسلمان کشمیری، سندھ کے سندھی، سرحد کے پشتو، پنجاب کے پنجابی، اور بنگال کے بنگالی بولتے ہیں اس لئے اس زبان کو سلامی کہنے کے بجائے ہم ہندوہی کہہ سکتے ہیں لیکن باوجود اس کے مسلمانوں نے اس زبان

قومی اور ملکی یکرنگی کی خاطر اپنی قومی اور ملکی زبان بنایا ہے، اور چونکہ صدیون سے اس کو اپنی عمومی زبان بنا چکے ہین اس لئے کوئی وجہ نہین ہے کہ اب اوس کی جگہ کسی دوسری زبان کو دی جائے،

یہان پر اس غلطی کو بھی دور کر دینا چاہئے، جو اکثر لوگون کی زبانون سے نکل جاتی ہے، کہ ان صوبون مین جہان اُن کی الگ الگ بولیان ہین مسلمان اور ہندو ایک ہی بولی بولتے ہین، صوبۂ بنگال مین بنگالی مسلمان اور بنگالی ہندو ایک ہی زبان رکھتے ہین، ایسے ہی گجرات میں گجراتی، اور مرہٹہ مین مرہٹی، اور مدراس میں کنڑی، اور تلگو وغیرہ، مگر یہ سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی، سچ تو یہ ہے کہ بے شبہ ان زبانون کے فعل اور حرف تو وہان کے ہندو اور مسلمان ایک ہی بولتے ہیں، مگر اسما مین ان دونون قومون مین اتنا ہی فرق ہے جتنا ان کے تمدنون اور ضرورتون یا پچھلی روایتون میں، ایک مسلمان بنگالی پروفیسر نے مجھے بتایا کہ مسلمان بنگالی پانی بولے گا، اور ہندو بنگالی جل، مسلمان بنگالی خالہ کو کھالا کہے گا، اور ہندو بنگالی موسی وغیرہ، اور گجراتی اور مرہٹی کا تو مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ مسلمان گجراتی، پارسی گجراتی، اور ہندو گجراتی مین اتنا ہی فرق ہے، جتنا ان کی قوموں میں، یہی حال مرہٹی کا ہے، کہ مسلمانی مرہٹی، ہندو مرہٹی، سے امتیاز رکھتی ہے، یہی بات مدراس کی ہندو مسلمان بولیون کا ہے، اور ایسا ہونا قدرتی بات ہے، ہمارے نزدیک اردو اور ہندی مین بھی اتنا ہی فرق ہونا چاہئے، اس سے زیادہ نہین، لیکن اس سے آگے بڑھکر یہ کہنا اور سمجھنا کہ سنسکرتی ہی ہندی ہماری اصلی بولی ہونی چاہئے، دیس کے اتحاد اور یکتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے،

ابھی پہلی اکتوبر ۳۹ئہ کے پائنیر میں الہ آباد یونیورسٹی کے سنسکرت ریڈر پروفیسر سکسینہ کا جو مضمون ہندوستانی زبان پر نکلا ہے، وہ ان کے طبقہ کے خیال کا پورا آئینہ ہے، صوبہ یوپی کے ایک وزیر تعلیم نے اسمبلی کی ایک تقریر مین بہت خوب کہا کہ نہ ہندو تمدن، نہ مسلمان تمدن، بلکہ ہندوستانی تمدن، میری عرض ہے کہ اس فلسفہ کو اور آگے بڑھائیے اور کہئے کہ نہ ہندو بولی نہ مسلمان بولی، بلکہ ہندوستانی بولی، لیکن کیا وفاداری کے ساتھ ہم سب اس کے ساتھ ہین،

ہمارے وزیر تعلیم نے ابھی بنارس مین ہندی کے ایک جلسہ مین فرمایا ہے کہ اردو ہندی جھگڑے کا فیصلہ قسمت نے خود کر دیا، یعنی یہ کہ اب نوے فیصدی لڑکے ہندی لے رہے ہین، جہان تک کاغذ اور امتحان کے پرچون کا

تعلق ہے، ہمارے وزیر صاحب کا سرکاری بیان بالکل صحیح ہے لیکن جہانتک واقعیت کا تعلق ہے یہ بیان ابھی صداقت سے بہت دور ہے، گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے ہم وطنوں میں جھوٹی قومیت پرستی کا یہی جذبہ ہے تو یہ بیان آگے چل کر واقعی صداقت نہ بن جائے گا،

صوبہ بہار میں جو ہندوستانی کمیٹی دو سال سے بنی ہے، اس میں اسی کی کوشش کی جا رہی ہے، کہ اونچی اردو اور کرامی ہندی سے اتر کر بیچ کی ہندوستانی کو ادب اور تعلیم کی زبان بنا کر پھیلایا جائے، چنانچہ اسی اصول پر ڈاکٹر تاراچند اور مولوی عبدالحق صاحب ہندوستانی لغت اور ہندوستانی اصطلاحوں کا کام کر رہے ہیں، اور ہم لوگ ہندوستانی ریڈروں کی زبان درست کرنے کا کام اپنے ذمہ لے رہے ہیں لیکن ہم کو معلوم ہے کہ اس تحریک کے دبانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جا رہا ہے، اور اس کی کھلی مثال پروفیسر سکسینہ کی وہ تحریر ہے جس کو اونھوں نے بہار کی ہندوستانی کمیٹی سے استعفا دیتے ہوے لکھا ہے،

یوپی کی کانگریسی حکومت کے صیغۂ تعلیم کا غالبًا یہ منشا تھا کہ اردو اور ہندی کو ابھی ایک ساتھ چلنے دیا جائے لیکن قومی کوششوں کے علاوہ سکریٹری امدادی ذریعوں سے بھی ایسی کوشش کی جائے، کہ سنسکرتی ہندی کا پلہ دن پر دن بھاری ہوتا چلا جائے، یہانتک کہ اردو کس مپرسی سے اپنی موت آپ مر جائے، اور سنسکرتی ہندی ہر جگہ چھا جائے پھر اس وقت کا وزیر تعلیم بے جھجک یہ کہہ سکے گا کہ اردو ہندی کا فیصلہ خود بخود ہو گیا، کیونکہ اب سو فیصدی لڑکے ہندی پڑھ رہے ہیں،

پہلے تو ایک میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکولوں میں لڑکوں کو ہندی پڑھانے پر زور دیا جاتا تھا، اور اردو کے استاد نہ ہونے یا نہ رکھنے کے سبب سے دیہاتی لڑکوں کو ہندی سیکھنے پر مجبور کیا جاتا تھا، یا وہ مجبور ہوتے تھے، اب آج کل کی روشنی میں یہ اندھیر ہو رہا ہے کہ ہندی کی کوششوں میں اوپر سے نیچے تک سکریٹری عہدہ دار اس کام میں لگے ہوئے ہیں، جگہ جگہ دورے کرتے ہیں، جلسوں میں اپنی رتبہ کی حیثیت سے جاتے ہیں اور ہندی کی ترقی کے لئے پورا زور دکھاتے ہیں، حالانکہ ان کو یا تو دونوں کے ساتھ ایک طرح کا برتاؤ کرنا یا دونوں سے ناطرفدا

ہوجانا چاہئے، میرے خیال میں یہ کانگریس کے ساتھ ہمدردی نہیں بلکہ کھلی دشمنی ہے، اور مسلمانون کے ذہن مین یہ غلطی بٹھانی ہے کہ جب ہم آدھے اختیار پاکر یہ کر رہے ہین تو پورا اختیار پاکر کیا کچھ نہ کرین گے، ملک کی پالیٹکس پر اس غلطی کا جو بُرا اثر اب پڑ رہا ہے، اور جو آگے پڑے گا، وہ چھپا نہین، مین نے اس وقت صفائی سے جو کچھ کہا ہے امید ہے کہ ہمارے دوست اوس کو نیک نیتی سے سنین گے، اور کہنے والے کی بھی نیک نیتی سمجھین گے،

زبان کے مسئلہ میں ہماری پالیسی کھلی ہوئی یہ ہونی چاہئے، کہ زبان وہ ہے جو بازارون مین بولی، اور عدالتون اور اسٹیشنون میں سمجھی جاتی ہے، اور جو ہندو مسلمان دونون کے بیچ مین سمجھنے اور سمجھانے کے کام مین آتی ہے، وہ نہین جو شبد ساگرون اور قاموسون مین لکھی ہوئی ہے، اس بولی کے لفظ بازار کے چلتے ہوئے سکے ہین، نہ کہ کونون اور گوشون مین پڑے ہوئے زنگ کھائے ہوئے غزنوی اور بکرماجیت کے زمانہ کے سکے، جن سے پرانی یادگارون کے ماہر اور پرانی تاریخ کے شائق تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں، مگر ان سے بازار کے چلن کا کام نہین لیا جاسکتا،

مسلمان اس مسئلہ مین بھی وہی کوتاہی کر رہے ہیں جو ان کے ہر قومی کام مین ہے، یعنی یہ زبان اور قلم کے شیر بنے ہوئے، صرف بول رہے ہین، اور لکھ رہے ہین، کچھ کر نہین رہے ہین، ان کو یقین کرنا چاہئے کہ زبان اور قلم کے یہ بند اس سیلاب کے دھارے کو نہین روک سکتے، جو پورے زور سے بہ رہا ہے، ضرورت ہے کہ ہم ہاتھ پاؤن ہلائین اپنی گاڑھی کمائی کے کچھ ٹکڑے مانگنے والون کی جھولی مین ڈالین،

ان پڑھون کو پڑھانے کی جو تحریک دو برسون سے چل رہی ہے، ہمارے نوجوان اس کے لئے ابھی تک کچھ نہین کر سکے ہین، کچھ برسون کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اردو اور ہندی پڑھے لکھون مین تعداد کا کتنا بڑا فرق ہو گیا اور اس فرق کی وجہ سے اگر کوئی نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلے، تو اس کی ذمہ داری ہمارے ہی سر ہوگی،

پورے ملک مین انجمن ترقی اردو کے علاوہ اردو کی دیکھ بھال اور ترقی کے لئے کوئی دوسری انجمن نہین ہے، اور اس کی شاخین بھی صرف بڑے بڑے صوبون تک ہین، شہر شہر اس کی شاخین اور ان شاخون مین کام کرنے والے

لوگ نہین، جب تک ہم پوری سرگرمی اور جوش و خروش سے کسی کام کو نہین کرین گے، اوس کا ہونا معلوم،

بڑی بڑی کتابون اور تصنیفون کو چھوڑ کر جن کے پڑھنے والے کم ہین، ہم کو عوام کی خاطر چھوٹی چھوٹی عام پسند کتابین اور رسالے سیکڑون اور ہزارون کی تعداد مین چھپوا کر پھیلانا چاہئے، بلکہ اگر ہوسکے تو ہندی خط مین صاف ستھری بولی کی کتابین بھی لکھوائی اور چلائی جائین، اور بتایا جائے کہ ہم اس ہندی کے خلاف نہین، جو ہندو مسلمان دونون کی زبان ہے،

ملک کی زبان کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے صحیح راستہ یہ ہو کہ ہندوستانی اردو یا اوس کو آسان ہندی کہ لیجئے ہندو مسلمانون کی مشترک زبان ہے، اور خالص ہندی کی حیثیت وہ ہے، جو مسلمانون کی فارسی کی ہے، اور سنسکرت کا درجہ عربی کا ہے، اگر ہم اس تصفیہ پر ایک ہوجائین تو ہماری سب مشکلین دور ہوجائین، مگر افسوس ہو کہ ملک مین ایک طبقہ ایسا ہے جو نہ صرف ہندی، بلکہ سنسکرتی ہندی کو ہندوستان کی زبان بنانے پر تلا ہے، اور وہ ایک ایسی غلطی کر رہا ہے جس سے قومی تنگدلی کے سوا کوئی دوسرا فائدہ نہین پہنچ سکتا، اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا، کہ ملک دو حصون مین بٹ جائے،

ابھی تک گو کہ چالیس برس سے یہ طبقہ یہ سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا ہے، کہ اردو مسلمانون کی اور ہندی ہندوون کی زبان ہے، پھر بھی واقعہ یہ ہے کہ اردو ہندو مسلمانون کی مشترکہ زبان باقی ہے، ہندو اخبار اور رسالے اس زبان مین نکل رہے ہین، ہندو مصنف اس زبان مین کتابین لکھ رہے ہین، ابھی ستمبر کے اخیر مین یوپی سرکار کے صیغۂ توسیع تعلیم مین دیہاتی لائبریریون کے لئے کتابین مانگی گئی تھین، اس سلسلہ مین ۱۸۰ اردو کتابین اور ۱۰ اردو کے مسودے اس صیغہ کو موصول ہوئے، ان چھپی ہوئی کتابون مین آدھی سے کچھ کم کتابین ہندو مصنفون کی تھیں، اور مسودون مین ۱۰ مین سے ۶ مسودے ہندو مصنفون نے بھیجے تھے، ہم اس واقعہ سے اس نتیجہ پر پہونچتے ہین، کہ سمجھدار ہندو طبقہ جس نے تنگ خیالی سے اپنے کو ادنچا رکھا ہے، ابھی تک ہمارے بزرگون کے اس فیصلہ کو کہ یہ زبان دونون قومون کی مشترکہ میراث ہے" مان رہا ہے، اور اس کے

پختگی کے ساتھ یقین رکھتا ہے،

بعض مسلمان مصنفون نے جنھون نے اردو زبان کی تاریخ لکھی ہے، یہ بڑی غلطی کی ہے کہ اونھون نے اس زبان کی تاریخ لکھتے وقت مسلمانون کی کوششون کا ذکر تو پورا کیا ہے لیکن ہندو شعراء اور اہل زبان و اہل قلم کی کوششون کو نظر انداز کر دیا ہے، ضرورت ہے کہ اب اس زبان کی ایک ایسی تاریخ لکھی جائے جس میں دونون کی محنتون اور کوششون [illegible] کی تفصیل ہو، آج یہ واقعہ کس کو معلوم ہے کہ لکھنؤ میں اردو شاعری کا سب سے بڑا استاد رائے سرب سنگھ دیوانہ تھا جس کی تربیت کی گود مین لکھنؤ کے اچھے اچھے شاعر مرزا جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیران پلے تھے، لالہ کانجی لال حیا، [illegible] قم، پنڈت دیا شنکر نسیم، تفتہ، پنڈت رتن ناتھ سرشار، چکبست، برق، ہتر دتا شاد، نوبت رائے نظر، ساحر دہلوی، ہری نرائن نگم، پریم چند، کشن پرشاد کول، پنڈت برجموہن دتاتریہ وغیرہ کی کوششون کا پایہ کم نہین ہے، یہ چند نام یون ہی زبان پر آگئے ہین، ورنہ اگر ان کے نامون اور کامون کو جمع کیا جائے تو ایک دفتر ہو جائے،

غرض یہ ہے کہ جس راستہ پر ہمارے بزرگ اب تک چلتے آئے ہین، وہی راستہ ہمارے اتحاد اور آگے کے کام کی ضمانت ہے، اس [illegible] دوسرا راستہ اختیار کیا جا رہا ہے، وہ ہم سب کو گمراہ کر دے گا،

یہ کہنا بھی درست [illegible] کہ ہم کو بنگال، مہاراشٹر اور مدراس کے لوگون کو ملا کر چلنا ہے جن کی صوبہ دار زبانین سنسکرت ماخذ سے ملتی ہین، اس لئے سنسکرتی ہندی ہی ان سب کو ایک کر سکتی ہے، یہ دلیل ایک آنکھ بند کر کے پیش کی جاتی ہے، اگر ہم دونون آنکھین کھول کر دیکھین تو معلوم ہوگا کہ ہم نے یہ دلیل دیتے وقت واقعی ایک آنکھ بند کر لی تھی، اس لئے ہم نے آدھے ہندوستان کو دیکھا اور آدھے کو نہین دیکھا، کیا ہندوستان مین کشمیر، سرحد، سندھ، بلوچستان اور پنجاب نہین، ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ان لوگون کی زبانون کے اصلی ماخذون سے کیون آنکھین بند کیجائین، اس کے علاوہ ڈراویڈی زبانون سے کیون غفلت برتی جائے، جن کو نہ اردو سے لگاؤ ہے، اور نہ ٹھیٹھ ہندی سے، اس پر بھی اسلامی مدراس کے ہر حصہ مین اردو بولی اور اس

زیادہ بھی جاتی ہے، اور ملیا تک اوس کا نشان پایا جاتا ہے،

الہ آباد یونیورسٹی کے لائق پروفیسر جھا نے اپنی ستمبر ۱۹۳۹ء کی گوالیار والی تقریر مین فرمایا ہو :-

"اردو ڈیڑھ سو برس سے اتر ہندوستان کے اون شہرون کی زبان ہے جو اسلامی تہذیب کے مرکز تھے اور مسلمان درباروں کی اور اُن کی جو اُون درباروں سے لگاؤ رکھتے تھے، مشترک زبان تھی اور جس کی شاعری کا وزن، محاورہ اور تشبیہیں کوئی چیز ہندوستانی نہین"

اردو کا لفظ گو بہت پیچھے کا ہے، اسی لئے مین اس نام کو صحیح نہین سمجھتا، لیکن اس سے مقصود تو وہ زبان ہے جو مسلمانون کے یہان آنے سے پہلے سندھ یا پنجاب یا ہریانہ اور دہلی کے آس پاس بولی جاتی تھی، اور جس مین مسلمانون کے آنے سے کچھ ان کی ضرورت کے عربی فارسی یا ترکی لفظ ایسے گھل مل گئے کہ اب وہ اپنے اصلی معنون مین بہت کم رہ گئے ہین کیا اس زبان کی تاریخ ڈیڑھ سو برس کی ہے، اور کیا وہ مسلمان درباروں مین بنی ہے اور کیا اس کے خیالات، محاورون اور مثلون مین کوئی چیز ہندوستانی نہین، ہندوستانی ایکاڈیمی کے کسی پچھلے نمبر مین شاہ معین الدین ندوی کا وہ مفصل مضمون چھپ چکا ہے جس مین دکھایا گیا ہو کہ اس زبان مین ہندی تمدن اور تہذیب کا کتنا بڑا حصہ ہی،

اردو مین جو تاریخی اور فرضی نام اس کے ادب کا جزو ہین، ان مین اسلامی اور غیر اسلامی سب ہی قسم کے نام ہین، رستم، سہراب، حاتم، سکندر، دارا، افلاطون، ارسطو، جمشید، فرعون، نمرود، ان مین کوئی بھی مسلمان نہین، یہ اسلام سے پہلے کے عربی یا اسلام سے پہلے کے ایرانی مصری اور یونانی نام ہین، یہ نام پچھلی دنیا مین وہی حیثیت رکھتے تھے، جو آج نپولین، قیصر، سالسبری، بسمارک، جارج واشنگٹن، ہٹلر، مسولینی وغیرہ کے ہین، جن کا تعلق قومون سے نہیں بلکہ دنیا سے ہے، انہی مین وہ نام بھی ہین جن کو ہمارے ہندوستان نے پیدا کیا ہے، جیسے بھیم، ارجن، کرشن، رام، سیتا، گوتم بدھ، بھگت وغیرہ یا جو الہ طلب تقے ہین، جیسے مہابھارت، رامائن، بھرت ملاپ، گوپیان، یا تہوار ہین، جیسے ہولی، بسنت وغیرہ یہ سب ہماری زبان کی مثلون اور مثالون مین

وقت پر آتے ہین، اور زبان مین بڑا مزہ دیتے ہین، جو قوم رستم اور سہراب اور سکندر اور دارا کے نامون اور کامون سے خوش ہو، وہ بکرماجیت اور رام چندر کے نامون اور کامون سے کیون خوش نہ ہوگی، جو مذہبی حیثیت اون کی ہے، وہی ان کی ہے، پھر ایک سے محبت اور دوسرے سے نفرت کی کوئی وجہ نہین،

ہندوستان کی وہ میٹھی اور پیاری بولی جس کا نام اصل مین ہندی ہے وہ ہمارے بزرگون مین پہلے بھی مقبول تھی، اور اب بھی ہے، بڑے بڑے صوفی بزرگون کی محفلون مین حضرت سید حسین گیسو دراز اور سعد اللہ فراز لکھنوی کے زمانہ سے وہ گائی جاتی تھی، اور اب بھی ہماری خانقاہون مین گائی جاتی ہے، اور اوس مین کبت اور گیت کہے جاتے اور سُنے جاتے تھے، اور ایسے مسلمان جو پریم اور محبت کی اس پیاری بولی مین شاعری کرتے تھے، سیکڑون سے زیادہ ہین،

لیکن جو ہندی آج پھیلائی جارہی ہے، فورٹ ولیم کالج سے پہلے وہ موجود نہ تھی، اوس کا پتلا انگریزون کی سیاسی جادوگری سے بنا ہے، اور اسی سے اوس مین جان پڑی ہے، اور اسی جادو کا کھیل ہے، جو آج ہندی اردو جھگڑے کی شکل مین دونوں قومون کو اب تک لڑا رہا ہے، یہ حقیقت ہے، اور اس حقیقت کو کوئی جھٹلا نہین سکتا،

اگر کسی زبان کا کسی اسلامی زبان سے لگاؤ رکھنا کوئی پاپ ہے، جو معاف نہین ہوسکتا، تو مین کہتا ہون کہ آج صوبون کی اکثر بولیان جو زبان کے درجہ کو پہنچی ہین، اون مین سے اکثر اسلامی دربارون کی سرپرستی مین پھلی اور پھولی ہین، جیسے بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ، کیونکہ سنسکرت کے سوا ایسی چھوٹی چھوٹی زبانین مسلمانون سے پہلے پڑھنے لکھنے مین کام نہین آتی تھیں، تو پھر کیا یہ زبانین اس لئے آج بھارت ورش سے نکال دیکا نکالی جائینگی کہ انھیں اسلامی دربارون سے لگاؤ رکھنے والون نے پھیلائی ہین، اور انہی دربارون کے سایہ مین وہ پھلی پھولی ہین، ان ساری زبانون مین بڑی بہتات سے عربی فارسی کے ضروری لفظ بھی ملے ہین، لیکن اس پر بھی وہ ناپاک نہین ہوئین،

یہ کہنا بھی سچ نہیں کہ ہندی دیہاتوں کی زبان ہے اور اردو شہر کی، دیہات اور شہر دونوں کی بولی ایک سی ہے، فرق ان میں وہی ہے جو دیہات اور شہر کی زندگی میں ہے، جو ہندی اخباروں اور رسالوں میں لکھی جاتی ہے وہ دیہات تو دیہات شہروں میں بھی نہ بولی جاتی ہے، اور نہ سمجھی جاتی ہے، اور اس کا تجربہ ہر روز اور ہر وقت کیا جا سکتا ہے، اور اُسی وقت اِس دعویٰ کی سچائی کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

میں پھر ہندو مسلمان دونوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ تنگ دلی اور چھوٹی قومیت کی غلط پاسداری کرکے اپنے ملک کو تباہ نہ کریں، اور اس کشتی میں وہ سوراخ نہ کریں جس سے وہ پھر کبھی نہ بن سکے گی، اور جس کا نتیجہ سب کے لئے ایک ہے، میں اپنے اس بیان کو سر تیج بہادر کے اُس مخلصانہ اور بہادرانہ بیان پر ختم کرتا ہوں جو انھوں نے ۲۶ اگست ۱۹۳۹ء کو کشمیر میں ایک مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

اردو زبان ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے"۔

آخر میں مجھے اس صوبہ کے اہلِ فکر کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بنگال میں بنگالی کی اہمیت صوبہ کی مقامی بولی کی حیثیت سے زیادہ ہے، پھر بھی یہ بھولنا نہ چاہئے، کہ اردو کی پرورش میں اور ملک کو ایک مشترکہ زبان کے بخشنے میں بنگال کا حصہ کم نہیں ہے، مرشد آباد اور ڈھاکہ اردو ادب کی آخری سرحدیں تھیں، اور جہاں اردو کے بڑے بڑے شاعروں نے جنم لیا ہے، اور شہرت کے بال و پر پیدا کئے ہیں، انھوں نے شعرائے لکھنؤ کے مقابلہ میں میدان مارے ہیں، اور ان کے دیوانوں پر نسخ کا قلم پھیرا ہے، محمد صادق اختر، عبدالغفور نساخ اور نواب سید محمد آزاد کے نام اردو ادب میں یادگار رہیں، اور آج بھی وحشت کی شاعری سے لکھنؤ اور دہلی کی ادبی محفلیں مانوس ہیں، موجودہ اردو ادب کا مافوق انشا پرداز جس کے قلم میں سحر حلال ہے اسی خاک سے اٹھا ہے، فورٹ ولیم کالج جس نے اردو کے الجھے ہوئے بالوں میں بھی کنگھی کی، اسی سرزمین کے ایک گوشہ میں تھا، میرامن کا باغ یہیں پر بہار ہوا، اور حاتم طائی کی محفل نے یہیں آرایش پائی، اور اخوان الصفا نے انسانوں کو حیوانوں کا فلسفہ یہیں پڑھایا، پھر کتنی عجیب بات ہے، کہ جب انگریزوں کی تعلیمی رائے بدلی تو اس سرزمین کو

اپنے اُس بچہ سے جس کو اس نے گود ون مین پالا تھا، ایسی بیگانگی ہوگئی کہ اب بنگال اور اردو دو متضاد چیزین ہین۔ بنگال کو اس زبان سے اوتنی بیگانگی کسی طرح نہیں جتنی مدراس کو ہندی یا ہندوستانی سے ہے، مگر یہ کس کو معلوم نہین کہ مدراس کی سابق گورنمنٹ نے جب وہان ہندی یا ہندوستانی کی اشاعت کی ضرورت سمجھی تو ڈراویڈی قوموں کی ہر قسم کی مخالفت کے باوجود اس کی تعلیم کو ضروری قرار دیدیا، اور احاطہ مدراس مین اسکی اشاعت پر ہزارون روپئے خرچ کئے، اگر اسی نظیر کو بنگال مین سامنے رکھا جاتا، تو ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوتی، اور ہندوستانی صوبون کی برادری میں بنگال کی اس کوشش کی بڑی تعریف کیجاتی،

کہاجاتا ہے کہ بنگال مین مسلمانون کا سب سے بڑا حصہ آباد ہے، اگر یہ سچ ہے تو بنگال کے کندھون پر بھی اسلامی فرضون کا سب سے بوجھ ہے، ہندوستان کی ساری اسلامی برادری نے اردو کو اپنی مشترک زبان مانا ہے اور اوس کے پھیلانے اور بڑھانے مین صدیان لگائی ہین، بڑا افسوس ہوگا اگر ہندوستان کا سب سے بڑا اسلامی صوبہ اس زبان سے اپنی بے التفاتی کا ثبوت دے،

آج سارے ہندوستان مین جو اسلامی تحریکیں پھیلی ہیں، اور اسلامی ہندوستان نے جو بڑے بڑے مورمصنف اور اہلِ قلم پیدا کئے ہین، بنگال کا بڑا حصہ اس لئے اون سے ناآشنا ہے کہ وہ اوس زبان سے جس مین وہ خیالات امانت ہیں، بیگانہ ہے، اور اس طرح ہندوستان کا سب سے بڑا اسلامی صوبہ، اسلامی تحریکات اور خیالات سے سراسر غیر متاثر ہے، اور اوس سے جو نقصان اسلام کو اس ملک میں پہنچ رہا ہے وہ بیان کا محتاج نہین،

ہم کو معلوم ہے کہ بنگال کے اندرونی حصون تک میں ہزارون مسلمان اس زبان کو بولتے اور سمجھتے ہین لیکن اردو قواعد کی بعض مشکلون اور تذکیر و تانیث کے جھگڑون کے سبب سے ان کو الجھن ہوتی ہے، لیکن اگر اہلِ بنگال جرأت کرتے تو اپنی ضرورت کے مطابق وہ لاہور اور پٹنہ کی طرح اپنی اردو آپ بنالیتے اور دلی اور لکھنؤ والون کو اس کے ماننے پر مجبور کر دیتے،

وقت اب بھی نہیں گیا ہے، اور آج سے زیادہ اوس کے لئے کوئی دوسرا مناسب وقت مشکل سے مل سکتا ہے

ع اے ز فرصت بے خبر در ہرچہ باشی زود باش

بنگال کی سرکار کو چاہئے کہ ہندوستانی اردو کو اس صوبہ کے اسکولون کی تعلیم مین مناسب حصہ دے، اور شہرون مین اس زبان کی لائبریریان قائم کرے، اور سرکاری حیثیت سے ہٹ کر خود بنگال والون کی ایک طاقتور جمعیت نجی طور پر یہ کام اپنے ہاتھ مین لے، اس کے ممبر شہرون سے گاؤن تک پھیل جائین، اردو پرچارک سبھائین بنائین، اور لوگون کو یہ زبان سکھائین اگر اردو رسم خط کی مشکل ہو تو شروع مین اس رسم خط کو بھی چھوڑین، اور بنگالی یا لاطینی خط مین اس زبان کے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھیں اور پھیلائین، بنگالی ہندوستانی اردو ڈکشنری لکھین، ادبی اخلاقی اور مذہبی قصے لکھ کر لوگون کے ہاتھون مین دین، آپ دیکھیں گے کہ چند سال کے اندر بنگال ہندوستان کا جزء ہو جائے گا، اور بنگال کی یہ قربانی ایک طاقتور ہندوستان کے بنانے مین بڑی مدد دے گی، آج پنجابی بولنے والے پنجاب کا اردو ہندوستانی پریس سارے ہندوستان پر راج کر رہا ہے، پھر کیون بنگالی بولنے والے بنگال میں ایسا ہندوستانی پریس نہ ہو جو ان مقبوضات کو اسی طرح اپنے قبضہ میں نہ لے آئے، ہمت شرط ہے، اور ایثار و قربانی کی تھوڑی ضرورت آج زبان کے مسئلہ کی کنجی دوسرے کے ہاتھ مین نہین بنگال کے ہاتھ مین ہے، کیا اہل بنگال اس مشکل کے قفل کو کھولنے کو تیار ہین،

کلیات شبلی اردو

مولانا شبلی مرحوم کی تمام اردو نظمون کا مجموعہ جس مین مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف جلسون مین پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمین جو کانپور، ترکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہین، یہ نظمین درحقیقت مسلمانون کی چہل سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے،

قیمت:- عہ ضخامت عہ صفحے،

منیجر

سلسلۂ شاہ ولی اللہ کی خدمتِ حدیث

از

جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی

"یہ مقالہ جس کا موضوع امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے تلامذہ کی خدمتِ حدیث ہے

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے اورنٹیل کانفرنس بنارس کے شعبۂ اسلامیات میں پڑھکر سنایا تھا"

خدمتِ حدیث میں ممالکِ اسلامیہ کا حصہ

عالم اسلامی یکے بعد دیگرے باری باری خدمتِ حدیث کے فریضہ کو ادا کرتا رہا ہے اگر ایک وقت میں کسی ایک ملک نے کوتاہی کی تو دوسرے ملک نے قدم آگے بڑھایا اور خدمتِ حدیث کا حق ادا کرنے میں مشغول ہوگیا، اولاً سب سے زیادہ حصہ ممالکِ عراقیہ نے خلافتِ عباسیہ کے ایام عروج میں لیا، ان ممالک نے جملہ علوم شرعیہ و عقلیہ و ادبیہ میں ترقی کی اور علوم حدیث و فقہ کی سب سے زیادہ خدمت کی، علماء عراق کے آثار باقیہ جو اب تک چمک رہے ہیں، اس پر شاہد عدل ہیں، خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد خدمتِ علوم شرعیہ بالخصوص علم حدیث کی خدمت کا سہرا مصر کے سر رہا، مصر میں اسلامی سلطنت کر دونوں دور اس خدمت میں کامیاب رہے، سلاطین و خلفاء مصر نے جو عالیشان مدارس قائم کئے اور ان لوگوں نے جس فراخدلی سے اس پر روپیہ خرچ کیا وہ تاریخ میں ہمارے سامنے ہے، یہی نہیں بلکہ سلاطین و امراء مصر نے علماء کے دوش بدوش خود بھی تحصیل علوم میں حصہ لیا، ملک ظاہر برقوق نے امام اکمل الدین بابرتی سے فقہ حاصل کی اور صحیحین کی روایت کے لئے زمرۂ محدثین میں شامل ہوئے، ابن ابی المجد جیسے بڑے بڑے عالی الاسناد محدثین کو دور دراز سے مصر بلایا تاکہ محدثین مصر کو اپنی سند عالی کرنے کا موقع ملے، سلطان المؤید صحیح بخاری کو سراج بلقینی سے

خود بلا واسطہ روایت کرتا ہے، حافظ ابن حجر نے الملک المؤید سے حدیث سنی، اور اوس کو المعجم المفہرس میں اپنے شیوخ میں شمار کیا ہے، المؤید نے علامہ شمس الدین دیری کو جو المسائل الشریفیہ فی ادلۃ الامام ابی حنیفہ کے مصنف ہیں مصر بلایا، اور اہل مصر کو اُن سے استفادہ کا موقع دیا، ملک ظاہر چقمق نے ابن الجزری سے صحیح بخاری سنی، اور بڑے بڑے صاحب اسناد محدثین کو مصر میں جمع کیا تاکہ اہل مصر ان کی روایات کو سنیں، اون سے صحاح و مسانید کو حاصل کریں، مصر کا قلعہ ان علما و محدثین کی قیامگاہ تھا، اسی میں طلبہ ان حضرات سے حدیث پڑھتے تھے، شاہی قلعہ کو دار الحدیث بنا دینے سے شان علم کی جس قدر عظمت و وقعت عام لوگوں کے قلوب میں پیدا ہوئی ہوگی، اس کو خود ہی سمجھ لیا جائے، سلاطین و امرائے مصر کی اس توجہ اور رغبت علمی کی وجہ سے ساتویں آٹھویں نویں صدی میں مصر برابر حدیث وفقہ و ادب کا مرکز بنا رہا، تاریخ علما و محدثین مصر کے کارناموں کو ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے، مصر میں بکثرت علما پیدا ہوئے، اودھوں نے تمام علوم بالخصوص علم حدیث میں بڑا درجہ حاصل کیا، اور اس کثرت سے کتابیں لکھیں کہ نہ صرف مصر بلکہ تمام عالم اسلامی کو اُن پر ناز ہے، مصر میں یہ علمی ترقی دسویں صدی کے اوائل تک رہی، پھر سلطنت برجیہ کے زوال کے ساتھ یہ علمی نشاط روبہ تنزل ہونے لگا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ علمی تحقیقات کی بلند عمارت میں زلزلہ آگیا، دسویں صدی اور اوس کے بعد کے علما کا موازنہ گذشتہ تین صدیوں سے کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ اس وقت مصر میں علمی نشاط کس قدر پھیکا پڑ گیا تھا،

خدمتِ حدیث میں سرزمین ہند کا اقدام

سنۃ اللہ کے موافق اب دوسرے ممالک نے قدم آگے بڑھایا، اور سرزمین ہند نے خدمتِ علم اور تحقیق حدیث میں نشاط کا ثبوت دینا شروع کیا، اس سے پہلے ہندوستان نے خدمتِ فقہ میں کافی حصہ لیا ہے، فتاوی تاتارخانیہ اور لباب المناسک وغیرہ اس کی شاہد ہیں، خدمتِ علوم حدیث میں بھی ہندوستان برابر حصہ لیتا رہا، امام صغانی لاہوری[1] (ف ۶۵۰ھ) کی مشارق الانوار ہمارے سامنے ہے، مگر

---

[1] ھو حسن بن محمد الصغانی لاھوری فقیہ محدث اخذ من صاحب الہدایۃ بواسطۃ ولد عبد المرغینانی تو جج اسانید اکابر ائمۃ الطریق مثل الشیخ زین الدین الاجودنی والسلطان نظام الدین الدھلوی وکان من فقہاء الہند المتوفی سنۃ ۶۵۰ھ ۱۲ ظ

دور نشاۃ قرن عاشر سے شروع ہوتا ہے، جس میں علامہ محمد طاہر پٹنی (ف ۹۸۶ھ) کی مجمع البحار اور المغنی اور شیخ علی متقی (ف ۹۷۵ھ) کی کنز العمال آسمان علم حدیث پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکی ہیں،

مجدد الف ثانی (ف ۱۰۳۴ھ) رحمۃ اللہ علیہ

گیارہوین صدی میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اشاعت حدیث و سنت اور تحقیق و حفظ علوم حدیث کا جذبہ اسلامیان ہند مین پیدا فرمایا، جس پر آپ کے مکاتیب شاہد عدل ہین، اسی کا یہ نتیجہ تھا جو ہم نے اپنے مشائخ سے سنا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو بارہ ہزار احادیث حفظ تھین، سلاطین ہند مین علم حدیث کا یہ شوق و شغف اس سے پہلے نہین دیکھا گیا، فتاوی عالمگیریہ سلطان عالمگیر کے شغف علمی کی زندہ یادگار اب بھی ہمارے سامنے ہے جس کی نظیر ممالک اسلامیہ نے بھی گیارہوین صدی سے اب تک پیش نہیں کی، ہم اس کو حضرت مجدد صاحبؒ کے برکات مین شمار کرتے ہین، مکاتیب مجددیہ کی عظمت شان کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ علامہ محمود آلوسی بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی مین ان سے استفاضہ کرتے اور جابجا تفسیر آیات اور شرح احادیث میں ان سے مدد لیتے ہین، تفسیر روح المعانی کا درجہ اہل علم کی نظر سے مخفی نہیں ہے، ہمارے سامنے علماے عراق کا یہ آخری شاندار کارنامہ ہے جس پر وہ جس قدر بھی ناز کرین بجا ہے،

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ ف ۱۰۵۲ھ

دسوین صدی ہجری کے آخر مین محدث ہند شاہ عبد الحقؒ حجاز سے علم حدیث حاصل کرکے دہلی تشریف لائے اور نشر و اشاعت حدیث پر توجہ فرمائی، مشکوٰۃ کا مقدمہ عربی مین لکھا، جو باوجود اختصار کے اصول حدیث میں بے نظیر ہے، مشکوٰۃ کی شرح عربی مین بنام لمعات اور اشعۃ اللمعات فارسی میں لکھی جو آج تک محدثین کی آنکھین روشن کر رہی ہے، سفر السعادۃ کی شرح لکھی،

ماثبت بالسنۃ فی احکام الشہور والسنۃ تحریر فرمائی، جو اپنے باب مین سب سے پہلی اور آخری کتاب ہے، آپ کے صاحبزادے مولانا نور الحقؒ (ف ۱۰۷۳ھ) نے شرح بخاری اور شرح مسلم لکھی ہے، جو بہت مشہور ہین، زبدۃ التواریخ بھی آپ ہی کی تصنیف ہے جس میں عہد اکبری کے حالات بڑے منصفانہ انداز سے بیان کئے گئے ہیں (باقی آئندہ)

مولانا سلام اللہ حنفی نے جو شیخ ہی کی اولاد میں ہیں، موطا امام مالک اور شمائل ترمذی کی شرح لکھی، (مقدمۃ التعلیق الممجد)

امام الہند شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۱۷۶ھ)	بارھوین صدی کے شروع میں دارالعلوم والحکمۃ یعنی شہر دہلی میں حجۃ اللہ فی الارض امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پیدا ہوئے، جن کی شان تحدیث و تجدید دین کا غلغلہ

ہندوستان اور بیرون ہند عرب وعجم مین بلند ہوا جیسا کہ آپکے شاگردون کے سلاسل اور آپ کی تصانیف حدیث سے ثابت ہے، آپ نے ترویج حدیث کے لئے وہ راہین اختیار کین، جن پر آپ سے پہلے ہندوستانی علما کی توجہ نہ ہو سکی تھی،

علم حدیث کی سبسے قدیم کتاب موطا امام مالک کی آپ نے دو شرحین عربی و فارسی مین المسوی اور المصفیٰ کے نام سے لکھین، یہ شرحین اگرچہ زیادہ مفصل نہیں، مگر نہایت وزن دار اور پُر مغز ہین، جو یقیناً موطا امام مالک کو سمجھنے کے لئے ایک سلیم العقل وصحیح الاستعداد کے لئے کافی ہین، شاہ ولی اللہ کی اولیات میں سے یہ ہے کہ آپنے درس قرآن کریم کے بعد درس موطا کو بقیہ کتب احادیث پر مقدم فرمایا، کیونکہ وہ اول تو ان سبسے پہلی ہے، و الفضل للمتقدم، دوسرے یہ کتاب مکہ و مدینہ و عراق و شام و یمن و مصر و افریقیہ و اندلس وغیرہ جملہ بلادِ اسلام مین مقبول و مشہور اور متفق علیہ ہے، ہر زمانہ مین علما نے بکثرت اس پر کام کیا ہے، کسی نے موطا پر تخریج لکھی، کسی نے اوس کی احادیث کے متابعات و شواہد جمع کئے، کسی نے اس کے لغات کو حل کیا، مشکلات کو ضبط کیا، کسی نے اوس کے رجال کی تاریخ لکھی، کسی نے اوس کی بلاغات وموقوفات و مراسیل و مقاطیع کو متصل کیا، غرض موطا پر اس قدر کام ہو چکا ہے کہ اوس سے زیادہ متصور نہین، صحیح بخاری و صحیح مسلم اگرچہ اوس سے زیادہ ضخیم اور مبسوط ہین، لیکن روایات حدیث کا طریقہ، رجال کی تمیز و تنقید کا راستہ، استدلال و استنباط کا طرز سب نے موطا ہی سے سیکھا ہے، تیسرے موطا میں وہ احادیث مشکلہ نہین ہین جن کے سمجھنے مین کسی مبتدی یا نو مسلم کو دشواری پیش آئے، پس قرآن کے حصۂ احکام کو سمجھنے کے لئے موطا امام مالک کافی ہے،

موطا امام مالک کی یہ بھی خصوصیت ہو کہ اس پر فقہا ر مجتہدین نے بھی کام کیا ہے، امام شافعیؒ نے موطا کو امام مالکؒ سے حاصل کیا، اپنی کتابون مین اس کی احادیث کی تحقیق کی، امام محمد نے بھی تین سال مدینہ منورہ رہ کر موطا کو امام مالک سے سنا پھر موطا محمد اور کتاب الحجج میں اُس پر تحقیق و تنقید کی، یہ بات موطا امام مالک کے سوا کسی کتاب کو نصیب نہین ہوئی،

پس شاہ ولی اللہ کی راے یہ ہو کہ موطا امام مالک کتب حدیث کا متن ہے، بقیہ جملہ کتب اوسی کی شرح ہین، اور یہ ایسی بات ہے جس کا کوئی صاحب انصاف انکار نہین کر سکتا،

شاہ ولی اللہ نے اپنی دوسری کتاب الانصاف فی بیان سبب الاختلاف مین ان اسباب کو اچھی طرح واضح کیا ہے جس کی وجہ سے فقہا کے درمیان بعض مسائل اجتہادیہ مین اختلاف نظر آرہا ہے، اس کتاب کو سمجھ لینے کے بعد کسی کو یہ کہنے کی جرأت باقی نہین رہتی، کہ فلان مسئلہ مین فلان امام نے حدیث صحیح کی مخالفت کی ہے، اس کتاب سے تمام فقہا کی عظمت قلوب میں پیدا ہوتی ہے اور باہمی نزاع کا شائبہ بھی باقی نہین رہتا،

حجۃ اللہ البالغہ وہ کتاب ہے، جس کی وجہ سے شاہ ولی اللہ کا درجۂ امامت وتجدید عرب وعجم نے تسلیم کیا، یہ کتاب اپنے طرز مین بالکل جدید اور بے نظیر ہے، اس سے پہلے ایسی کتاب کسی مصنف نے نہین لکھی، اس کتاب کو صحاح ستہ کی شرح، فقہ اسلامی کا خلاصہ، مقاصد و اسرار شریعت کا لب لباب، حکمت و سیاست اسلامیہ کی تصویر کہنا چاہیے، اس کتاب سے ہندوستانی مسلمانون کی علمی تحقیقات کا سکہ تمام عالم اسلامی پر بیٹھ گیا، اور بارھوین صدی مین خدمت حدیث کا سہرا اون کے سر رہا،

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء مین جس وسعت نظر اور تحقیق و تفتیش سے احادیث متعلقۂ خلافت کو جمع کیا گیا، اور جس خوبی سے مسئلۂ خلافت پر بحث کی گئی ہے، اس کی نظیر نہین مل سکتی، علم حدیث مین آپ کی ایک چہل حدیث اور مسلسلات اور نوادر الحدیث، الدر الثمین، شرح تراجم بخاری بے نظیر کتابین ہین،

حدیث نبوی کی تحریری خدمت کے ساتھ شاہ ولی اللہ نے تعلیمی اور درسی خدمت بھی جس خوبی سے انجام

دی ہے، اوس نے اسلامیان ہند میں درس حدیث کا نیا دروازہ کھول دیا، طالبان حدیث جوق جوق شاہ صاحب کے درس میں شریک ہوئے، اور سند حدیث لے کر اطراف عالم میں حدیث نبوی کی اشاعت کرنے لگے، اور اوس کا سلسلہ بحمداللہ اب تک جاری ہے،

سید مرتضی بلگرامی زبیدی ۱۲۰۵ھ شاہ ولی اللہ کے تلامذہ میں بڑی شخصیت کے عالم میں تاج العروس شرح القاموس آپ کے تبحر علمی و ادبی کا ایسا کارنامہ ہے، جس کی نظیر علماے عراق و مصر نے بھی ابتک پیش نہیں کی، علم حدیث میں آپ کی وسعت نظر اور تحریر الجواہر المنیفۃ فی ادلۃ الامام ابی حنیفۃ روشن دلیل ہے،

قاضی ثناء اللہ پانی پتی ۱۲۲۵ھ شاہ ولی اللہ کے تلامذہ میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کو اوس زمانہ کے علما نے بیہقی وقت کا خطاب دیا ہے، حفظ احادیث اور وسعت نظر میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے، جس پر آپ کی تفسیر مظہری شاہد عدل ہے، اس تفسیر میں اس کثرت کے ساتھ احادیث کو جمع کیا گیا ہے کہ دیکھنے والے کو مصنف کی وسعت نظر پر حیرت ہوتی ہے، جملہ احادیث پر محدثانہ اصول سے کلام بھی بڑی خوبی سے کیا گیا ہے، جو ان کی شان تنقید کو واضح کرتا ہے، افسوس ہے کہ یہ کتاب ابھی تک پوری طبع نہیں ہوئی، چند اجزاء طبع ہوئے ہیں، اگر پوری طبع ہو جاتی، تو جس طرح تفسیر روح المعانی نے اس زمانہ میں اہل عراق کا سر افتخار بلند کر دیا ہے، تفسیر مظہری سے اسلامیان ہند کی خدمت حدیث و تفسیر کا جھنڈا بہت ہی بلند ہو جاتا، خدا کرے مسلمانان ہند اس طرف توجہ کریں،

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ۱۲۳۹ھ آپ اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ کے سچے جانشین فخر المحدثین زین المفسرین تھے، چراغ ہند آپ کا لقب تھا، ہندوستان میں علم حدیث کی ریاست آپ پر ختم تھی، طالبین اطراف و اکناف سے حدیث پڑھنے آپکے پاس آتے تھے، اور فیضیاب ہو کر جاتے تھے، جملہ علوم عربیہ ادبیہ، شرعیہ و عقلیہ میں متبحر تھے، بستان المحدثین علم حدیث میں آپ کی وسعت نظر پر شاہد عدل ہے، ملفوظات عزیزیہ سے آپ کی شان تحقیق حدیث واضح ہے، اصول حدیث میں عجالہ نافعہ بھی بہت مفید ہے، تفسیر فتح العزیز بے نظیر تفسیر ہوتی

اگر تمام طبع ہو جاتی، مگر افسوس کہ نا تمام رہ گئی، اس کو دیکھکر تحقیقات کا ایک سمندر جوش مارتا ہوا نظر آتا ہے،
آپ کے تلامذہ بے شمار ہیں، اور حدیث مین تمام اسانید ہند کا مرجع آپ ہی کی ذات ہے،

شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی ۱۲۶۲ھ | آپ شاہ عبد العزیز صاحب کے نواسے اور علم حدیث مین اون کے سچے جانشین ہین، شاہ عبد العزیز کے بعد آپ ہی علم حدیث مین مرجع خلائق اور محدّث اکبر تھے، مشکوٰۃ کا ترجمہ فارسی مین کیا، پھر نواب قطب الدین خان صاحب نے جو آپ کے اجل تلامذہ سے ہین، مظاہر حق کے نام سے اردو مین مشکوٰۃ کا ترجمہ کیا، جو اہلِ علم کی نظر مین بہت بلند پایہ کھا ہے، معانی حدیث کی تحقیقات، متعاضات مین تطبیق بہت خوبی سے کی گئی ہے، شاہ محمد اسحاق صاحب کے تلامذہ نے حواشی صحاح ستہ مین جا بجا شاہ صاحب کی تقریرین شرح حدیث کے متعلق نقل کی ہین، اون سے شاہ صاحب کی شانِ تحقیق اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے۔ اسی طبقہ مین شاہ ابو سعید مجددی دہلوی، مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب شہید دہلوی، حضرت مجدد ملت سید احمد صاحب بریلوی، شاہ عبد القادر صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب کی خدمات بھی سلسلۂ ولی اللہی کی خدمتِ حدیث کے درخشان ستارے ہین، ان سب حضرات نے اپنے درس و عمل سے ترویج حدیث و اشاعتِ سنت مین اتنا شغف ظاہر کیا، جس سے شاہ ولی اللہ کا سلسلۂ حدیث اطرافِ عالم مین پھیل گیا، شاہ عبد الحق محدث دہلوی کو ایسے آدمی مل جاتے، تو ان کا سلسلہ بھی اچھی طرح پھیل جاتا، مگر یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، حضرت سید صاحب بریلوی گو اہلِ علم کی طرح درس دینے والون مین نہین تھے، مگر ان کا عمل اور اتباعِ سنت سراسر درسِ حدیث تھا، ان کے عمل سے لوگون مین درسِ حدیث کی روح زندہ ہوتی تھی، جس پر تاریخ شاہد ہے،

شاہ اسحاق صاحب کے تلامذہ مین دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہین، ایک وہ جو اپنے کو اہلِ حدیث کہتے، اور تقلید ائمہ کا انکار کرتے ہین، اور خود کو حنفی نہین کہتے، ان کا خیال یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی حنفی نہین تھے، مگر یہ ایسی بات ہے جس کو شاہ ولی اللہ کی فیوض تحریرین پر نظر رکھنے والا کبھی تسلیم نہین کر سکتا، اس سے کسی کو انکار نہین کہ شاہ ولی اللہ ہندوستان مین علامہ ابن الہمام کی نظیر تھے، یعنی مقلد محقق تھے، وہ بعض مسائل مین

عام حنفیہ سو اختلاف بھی کرتے ہیں، مگر اس کا نام ترک تقلید نہیں بلکہ تحقیق فی التقلید ہے کہ وہ تحقیق کی ساتھ تقلید کرتے ہیں، نواب صدیق حسن خان صاحب امیر جماعت اہلِ حدیث اپنی کتاب الحطۃ میں فرماتے ہیں،

ان الشاہ ولی اللہ المحدث الدھلوی قد بنی طریقتہ علی عرض المجتھدات علی السنۃ والکتاب وتطبیق الفقھیات بمصاق کل باب، الی قولہ وھذا کلہ مذھب حنفی الخ	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ مسائل اجتہادیہ کو قرآن وحدیث پر پیش کرتے ہیں، اور مسائل فقہیہ کو ہر باب میں قرآن وحدیث سے مطابقت دیتے ہیں، .... اور اُن کا یہ تمام تر طریقہ مذہب حنفی ہی ہے،

مولانا محمد محسن بہاری تیمی نے الیانع الجنی ص ۶ میں شاہ عبد الغنیؒ، شاہ محمد اسحاقؒ، شاہ عبد العزیزؒ، شاہ ولی اللہؒ چاروں کو حنفی المذہب بتایا ہے، شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد شاہ عبد الرحیمؒ ان علماء میں ہیں جو فتاوی عالمگیری کی تدوین پر مامور تھے، شاہ ولی اللہؒ کے اجل تلامذہ میں سے آپ کے جانشین شاہ عبد العزیزؒ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی سید مرتضی بلگرامی زبیدی جو تبحرِ حدیث وغیرہ میں اعلیٰ پایہ رکھتے ہیں، سب حنفی تھے، شاہ عبد العزیزؒ، شاہ محمد اسحاقؒ اور ان کے جانشین شاہ عبد الغنی مجددی سب حنفی ہیں، پس جس کے اصول و فروع سب حنفی ہوں، اس کے متعلق یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ وہ خود حنفی نہ تھا، درمیان کلام میں اس خاص نکتہ پر اشارہ کرکے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاہ محمد اسحاق صاحب کے تلامذہ میں اُن لوگوں نے بھی جو اپنے کو حنفی نہیں کہتے، ہندوستان میں علم حدیث کی خدمت بہت کچھ کی ہے، مولانا نذیر حسین صاحب مرحوم کا درسِ حدیث مشہور و معروف ہے، صدہا علماء آپ سے فیضیاب ہوئے جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، نواب صدیق حسن خان نے مشکوٰۃ پر فصل رابع کا اضافہ فرمایا، بلوغ المرام کی متعدد شرحیں لکھیں، الروضۃ الندیہ کی شرح لکھی، عون الباری کے نام سے ادلۂ بخاری کی بھی شرح لکھی، کتاب الحطۃ علی الصحاح الستۃ اور ابجد العلوم کی بے نظیر تالیفات ہیں، انھوں نے کتب نادرہ علم حدیث کی اشاعت بھی خوب

کی ہے، علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے سنن ابی داؤد کی شرح عون المعبود تصنیف کی، ان کے بڑے بھائی علامہ ابو الطیب نے غایۃ المقصود بہت ضخیم کئی جلدوں میں تصنیف کی، جو افسوس ہے پوری طبع نہیں ہوئی، اعلام العصر بھی بہت تحقیق سے لکھی گئی ہے، قریب زمانہ میں مولانا عبد الرحمن مبارکپوری نے تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی بڑی قابلیت سے لکھی ہے، یہ بھی سب کی سب سلسلۂ ولی اللہی کی خدمتِ حدیث میں داخل ہے، ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ان حضرات کی خدمت حدیث پر اجمالی اشارہ کرکے، میں سلسلۂ ولی اللہی کی دوسری شاخ کی خدماتِ حدیث بیان کرنا چاہتا ہوں جو اپنے کو حنفی کہتے ہیں، میری نظر میں بعض وہ لوگ بھی ہیں جن کو علم حدیث کی روشنی سلسلۂ ولی اللہی سے پہونچی، مگر وہ اپنے کو اس سلسلہ سے الگ ہی رکھنا پسند کرتے ہیں، اس لئے میں نے بھی ان کا تذکرہ پسند نہیں کیا، ومنھم صاحب صحیح البھاری وتسمیتہ بالصحیح مصداق المثل السائر، برعکس نھند نام زنگی کافور فقد جمع فیہ کثیرا من الضعاف بل ومن الموضوعات،

شاہ عبد الغنی محدث مجددی دہلوی م ۱۲۹۶ھ ابو حنیفہ عصر بخاری دہر حجۃ المحدثین شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اپنے والد شاہ ابو سعید سے حدیث و تفسیر پڑھکر شاہ اسحاق صاحب سے حدیث حاصل کی، پھر مہاجر مدنی ہو کر شیخ عابد سندھی رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف پڑھی، اور سند حدیث حاصل کی، سنن ابن ماجہ کی شرح بنام انجاح الحاجۃ آپ کی بہترین تالیف ہے، جو ابن ماجہ کے حاشیہ پر طبع ہو چکی ہے،

مولانا شیخ احمد علی محدث سہارنپوری م ۱۲۹۷ھ آپ شاہ محمد اسحاق صاحب کے اجل تلامذہ سے ہیں، مکہ مکرمہ میں شاہ صاحب سے کتب حدیث پڑھیں، پھر ہندوستان واپس آکر درس حدیث کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی بنیاد ڈالی، جو اب تک قائم اور روز افزوں ترقی پر ہے، صدہا علما اوس سے فیضیاب ہو کر اطراف عالم میں اشاعت حدیث و قرآن کی خدمت بجا لا رہے ہیں، جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب پہونچ چکی ہے، پھر ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کو شمار کیا جائے تو ہزاروں تک نوبت پہونچے گی، مولانا احمد علی نے درس حدیث ہی پر کفایت نہیں کی

بلکہ مطبع احمدی قائم کرکے کتب حدیث کو باحسن وجہ طبع کرکے خدمت حدیث کا حق ادا فرمایا، حق بات کو چھپایا نہیں جا سکتا، مولانا احمد علی نے صحیح بخاری کو جس خوبی اور خوبصورتی اور صحت کاملہ کے ساتھ طبع فرمایا، انصاف یہ ہو کہ آج تک ممالک اسلامیہ مین سے بھی کسی ملک نے اوس کا جواب نہیں دیا، اور یہ بھی ہندوستان کو فخر ہے، کہ صحیح بخاری اور چند کتب حدیث مصر سے پہلے یہاں طبع ہوئی ہین، اور غالباً یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا، کہ جس طرح فتح الباری بخاری شریف کی مفصل شروح مین بے نظیر ہے، جس پر مصر کو جس قدر بھی ناز ہو بجا ہے، اسی طرح مولانا احمد علی کا حاشیہ بخاری شریف مختصر شروح مین بے نظیر ہے، جس نے اسلامیان ہند کے سر افتخار کو بہت بلند کر دیا ہے، آج تک اختصار کے ساتھ ایسا جامع وزن دار پرمغز حاشیہ کسی نے بھی بخاری شریف پر نہیں لکھا، جس کے بعد حل بخاری کے لئے مطولات کی حاجت باقی نہین رہتی،

مسئلۂ قرأت خلف الامام مین آپ کا رسالہ الدلیل القوی بھی مصنف کی وسعت نظر، اور تحقیق علوم حدیث کا آئینہ ہو،

قاری عبد الرحمن صاحب محدث پانی پتی

آپ نے فن تجوید کی ہندوستان مین بڑی خدمت انجام دی ہے، اسی کیساتھ علم حدیث مین بھی آپ کا پایہ بہت بلند تھا، شاہ اسحٰق صاحب سے علم حدیث حاصل کیا، اور بڑے بڑے علماء کو سند حدیث سے سرفراز فرمایا، جن مین حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا حکیم الامۃ تھانوی کا نام لینا کافی ہے، اور بھی بہت علماء آپ سے فیضیاب ہوئے،

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم محدث بانی دار العلوم دیوبند ۱۲۹۷ھ

آپ نے شاہ عبد الغنی صاحب[۱] مجددی دہلوی سے علم حدیث حاصل کیا، پھر قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے سند حدیث حاصل کی، مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے بھی حدیث پڑھی، بخاری شریف کی تصحیح مین زیادہ کام آپ ہی نے کیا، اور مولانا احمد علی صاحب کے حاشیہ بخاری کے پانچ اجزاء کی تکمیل استاد کے ارشاد سے آپ نے ہی کی، بخاری کے یہ آخری پانچ اجزاء بہت مشکل مین

---

[۱] مولوی امام خان نوشہروی نے مولانا محمد قاسم صاحب کو شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی اللہ کا شاگرد حدیث مین لکھا ہو یہ صحیح نہین، شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی اللہ کا انتقال اپنے سب بھائیون سے پہلے ہوا ہے، ان کو مولانا محمد قاسم صاحب کیونکر پا سکتے تھے، جنھون نے شاہ اسحٰق صاحب کو بھی نہین پایا، ۱۲ ظ

کتاب الاعتصام بالسنۃ کے بعض تراجم ابواب کی مناسبت حدیث سے بالکل معلوم نہین ہوتی، اسی طرح کتاب الرد علی الجہمیہ اور کتاب التوحید بھی آسان نہیں ہین، انہی اجزاء مین امام بخاری نے قال بعض الناس کہکر حنفیہ پر اعتراضات بھی زیادہ کئے ہین، یہ مولانا محمد قاسم صاحب ہی کا حصہ تھا، کہ ان دشوار گذار گھاٹیون کو ایسا آسان کر دیا ہے کہ اب کسی راہ رو کے لئے کچھ دشواری باقی نہین رہی،

مولانا نے اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ مین کتب حدیث کے طبقات اور اصول تنقید کو جس خوبی سے بیان فرمایا ہے اس کو دیکھکر یہ ماننا پڑتا ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کے اصول تنقید و قواعد تطبیق کو آپ سے بہتر کسی نے نہین سمجھا، مولانا بڑے دعوی کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، کہ اقوال ابی حنیفہ کو حدیث کے موافق ثابت کرنے کا مین ذمہ لیتا ہون لیکن تخریجات فقہاء کا مین ذمہ دار نہین (سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ) جن لوگون نے مولانا کی تقریر درس حدیث مین سنی ہے، وہ اسکے شاہد ہین، کہ واقعی مولینا اقوال ابی حنیفہ کی تقریر ایسی کرتے تھے جس کے بعد وہ بالکل حدیث کے موافق نظر آتے تھے، حدیث کو قول ابی حنیفہ کے مطابق نہین کرتے تھے کہ اس کا خلاف ادب ہونا ظاہر ہے، بلکہ قول ابی حنیفہ کو حدیث کے مطابق کر دیا کرتے تھے،

چونکہ مولانا کے زمانہ مین بعض لوگ مذہب اسلام پر اعتراض وطعن کے لئے میدان مین اتر آئے تھے، اسلئے مولانا کو اپنا زیادہ وقت ان کی مدافعت مین صرف کرنا پڑا، اور دنیا گواہ ہے کہ مولانا کو اس مین جیسی کامیابی حاصل ہوئی، وہ آپ ہی کا حصہ تھی، جس کو تائید غیبی کہنا اصلاً مبالغہ نہین، مولانا کی کتاب حجۃ الاسلام، مباحثہ شاہجہانپور، قبلہ نما، تقریر دلپذیر وغیرہ اس پر شاہد عدل ہین، اسلئے گو آپ نے خدمت علم حدیث کے لئے تحریری کام زیادہ نہیں کیا، مگر آپ کا بڑا کارنامہ جو تمام سلسلۂ ولی اللہی کے تحریری کارنامون سے زیادہ وزنی ہے یہ ہے کہ آپنے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالدی، جس مین اس وقت سے اب تک ہر سال دورۂ حدیث تمام ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند کا نور برابر چمکتا اور بڑھتا رہا، یہانتک کہ اس کی شعاعین ہندوستان سے گذر کر سماٹرہ، جاوہ اور مشرق اقصی مین چین تک پہونچ گئین، اور جنوبی افریقہ، بلاد افغان و ایران و مصر و شام و عرب تک اوسکی

علمی تحقیقات کا جھنڈا بلند ہو گیا، آج دارالعلوم دیوبند کو بجا طور پر ازہر الہند کا لقب دیدیا گیا ہے، جن علماء نے اس درس گاہ سے صرف دورۂ حدیث کی تعلیم حاصل کی، اون کی تعداد دس ہزار سے اوپر ہے، اور جو تمام علوم شرعیہ عقلیہ و نقلیہ میں اس درس گاہ سے کامیاب ہوئے، ان کا شمار پانچ ہزار تک ہے، اوران مین سے جو صاحب درس و تدریس ہوکر مفتاح العلوم بن گئے، ان کی تعداد ایک ہزار سے کم نہین، دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی تعداد ہر سال ڈیڑھ ہزار سے اوپر ہو جاتی ہے، اگر اسلامیانِ ہند اس درس گاہ پر ویسی ہی توجہ کرتے، جیسی اہلِ مصر نے جامع ازہر پر کی تو یقیناً اس کا پایہ اس سے بھی بہت زیادہ بلند اور عظیم الشان ہوتا، اس درسگاہ کے فارغین نے جن مدارس کی بنیاد اطرافِ ہندوستان مین قائم کی ہے، ان کا شمار ایک ہزار سے زیادہ ہی ہے،

اور یہ تمام ترخدمتِ قرآن وحدیث مولینا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے نامۂ اعمال میں داخل ہے، اللھم ارفع درجاتہ وتقبل حسناتہ ومتعنا بفیوضہ وبرکاتہ آمین، تاسیس دارالعلوم دیوبند مین مولانا محمد قاسم صاحب کے ساتھ حضرت مولینا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولینا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے انفاس قدسیہ کی اعانت بھی شاملِ حال تھی، اور ابتداء میں یہی تین حضرات اُس کے روحِ روان تھے، اگر موسسِ اوّل مولینا محمد قاسم صاحب تھے،

مولانا شیخ محمد محدث تھانوی مولانا شیخ محمد اپنے زمانہ مین محدث کے لقب سے مشہور تھے، شاہ محمد اسحاق صاحب کے ارشد تلامذہ سے ہین، جب آپ نے سلطان عالمگیر رح کے حافظ حدیث ہونے کا واقعہ بیان فرمایا، کہ ان کو بارہ ہزار حدیثین حفظ تھین، تو آپ کے ایک شاگرد نے پوچھا حضرت آپ کو کتنی حدیثین حفظ ہین، فرمایا، اپنی محفوظات پر نظر ثانی کرکے کل جواب دون گا، کیونکہ مین نے اب تک اپنی محفوظات کو شمار نہین کیا، دوسرے دن فرمایا، کہ الحمدللہ مجھے چار ہزار حدیثین حفظ ہین. (سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ نوراللہ مرقدہٗ) سنن نسائی پر آپ کا حاشیہ مطبع مجتبائی مین طبع ہو چکا ہے، جس مین زیادہ تر حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی تحقیقات و تقریرات جمع کی گئی ہیں،

مولانا شیخ عبدالقیوم بھوپالی بڑھانوی ۱۲۹۹ھ

آپ بھی شاہ اسحاق صاحب کے اجلۂ تلامذہ سے ہیں، اور ان کے داماد بھی ہیں، ساری عمر درسِ حدیث میں گذری، بڑے بڑے علما نے آپ سے سندِ حدیث حاصل کی، سلسلات شاہ ولی اللہ کی سند علما کو آپ سے ہی پہونچی، آپ بھوپال سے علیل ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے، تو جماعت طلبہ بھی ساتھ تھی، جو آپ سے بخاری شریف پڑھ رہے تھے، راستہ میں مرض بڑھ گیا، اور کچھ دنوں بنارس میں آپ نے قیام فرمایا، اس حالت میں بھی درسِ حدیث جاری رہا، سرزمین بنارس کو یہ شرف حاصل ہے، کہ ایک قدسی صفات محدث نے اوس میں کچھ دنوں درسِ حدیث دیا ہے، یہاں سے وطن کو روانہ ہوئے تو مرض موت کے آثار راستہ میں شروع ہو گئے، جس وقت آپ اپنے مکان کے دروازہ پر پہونچے ہیں، تو بخاری شریف کی آخری حدیث کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان حبیبتان الی الرحمٰن سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم آپ کی زبان پر تھی کہ نزع روح شروع ہو گیا، فوراً مکان کے اندر لیجایا گیا، اور روح قفس عنصری سے آزاد ہو گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون اس ایک واقعہ سے ہی آپ کا شغفِ حدیث ظاہر ہے،

مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ مدرس اول و محدث مظاہر علوم سہارنپور ۱۳۰۲ھ

علم حدیث مولینا شیخ رشید الدین دہلوی اور مفتی صدر الدین دہلوی اور شاہ اسحٰق صاحب سے حاصل کیا، جملہ علوم شرعیہ نقلیہ وعقلیہ کے ماہر تھے، علم فقہ میں مرجع خلائق تھے، مدرسہ مظاہر علوم کے محدث اعلیٰ تھے، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے بھی آپ سے بعض کتب ابتدائیہ پڑھی ہیں، انتقال کے وقت بوجہ حدیث نبوی المومن یموت بعرق الجبین بار بار اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے تھے جب پسینہ نمودار ہوا تو خوشی سے چہرہ کھل گیا، اور اس خوشی کے عالم میں انتقال فرمایا، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ

نادرۃ الزمان مولانا ابو الحسنات عبدالحی لکھنوی ۱۳۰۴ھ

آپ سلسلۂ ولی اللہی کے مایۂ ناز محدث فقیہ، اصولی، معقولی، مورخ محشی، اور بہترین مصنف تھے، تھوڑی عمر میں اتنا کام کیا ہے، کہ دیکھنے والے کو حیرت ہو جاتی ہے، تمام علوم و فنون عقلیہ ونقلیہ و آلیہ میں آپ کی تالیفات موجود ہیں، کتب درسیہ پر حواشی بھی

سلہ مولوی امام خانصاحب نوشہروی نے آپ کی وفات بھوپال میں لکھی ہے، جو صحیح نہیں، ۱۲ ظ

بکثرت ہیں، تالیفات کے ساتھ شغلِ درس بھی جاری تھا، اور یہ سب خدمات ۳۹ سال کی عمر میں انجام دیکر دار البقا میں پہونچ گئے، آپ نے علم حدیث اپنے والد صاحب سے حاصل کیا، ان کو حدیث کی اجازت شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی اور مولینا حسین علی محدث ملیح آبادی تلمیذ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے حاصل ہے، پھر مولینا عبدالحی صاحب نے شاہ عبدالغنی صاحب سے خود بھی بذریعہ خط کے اجازت حاصل کی، آپ کی تالیفات حدیث میں التعلیق الممجد علی الموطا محمد بہت لاجواب ہے، جس کے مقدمہ میں تاریخ علم حدیث پر سیر حاصل کلام فرمایا ہے علم رجال میں الفوائد البہیۃ فی طبقات الحنفیۃ بے نظیر ہے، امام الکلام فی القرآۃ خلف الامام ظفر الامانی المسمی المشکور تذکرۃ الراشد، تراجم علمائے ہند، سعایہ وغیرہ مصنف کی وسعتِ نظر اور شان تحقیق کی روشن دلیلیں ہیں، رحمہ اللہ رحمۃ من عندہ آمین، سعایہ اگر پوری ہو جاتی تو حدیث و فقہ کا بحر زخار ہوتا،

مولانا محمد حسن صاحب اسرائیلی سنبھلی ۱۳۰۵ھ | آپ مولانا عبدالحی لکھنوی کے قابل تلامذہ میں تھے، علم حدیث سے خاص مناسبت تھی، مسند امام ابو حنیفہ کا حاشیہ تنسیق النظام، اور اس کا مقدمہ آپ کی حدیث دانی اور وسعتِ نظر کا نظر آئینہ ہے، تغمدہ اللہ برحمتہ و رضوانہ شرح معانی الآثار طحاوی کی تصحیح و تحشیہ میں بھی مولانا وصی احمد صاحب کے ساتھ آپ نے کام کیا ہے،

مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ | آپ مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، سنن ابی داؤد پر آپ کا حاشیہ التعلیق المحمود کے نام سے طبع ہو چکا ہے، یہ حاشیہ اسی شان کا ہے جیسا مولانا احمد علی سہارنپوری کا حاشیہ بخاری پر ہے، آج تک ابی داؤد کا ایسا نفیس اور جامع حاشیہ نہیں دیکھا گیا، یہ بھی سلسلۂ ولی اللہی کی خدمتِ حدیث کا بہت بڑا کارنامہ ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ،

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی | آپ نے علم حدیث شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی سے حاصل کیا، دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے مدرس اول اور محدث آپ ہی ہیں، صدہا علماء نے آپ سے سند حدیث حاصل کی، جن میں سے مولانا حکیم الامۃ تھانوی کا نام لینا کافی ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب کی تحقیقات حدیثیہ کا اندازہ حضرت حکیم الامۃ

کی تصانیف سے بخوبی ہو سکتا ہے، آپ کو علمِ حدیث کے علاوہ علمِ تفسیر و ذوقِ عربیت میں بھی بدرجۂ کمال حاصل تھا، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کو باوجود کمالِ ادب دانی و تبحر فی العربیۃ کے اعتراف تھا کہ تفسیرِ بیضاوی جیسی مولانا محمد یعقوب صاحب پڑھاتے ہیں میں نہیں پڑھا سکتا،

قطب زمان مولانا شاہ فضل الرحمن محدث گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۱۵ھ	آپ بھی شاہ محمد اسحاق صاحب کے اجل تلامذہ میں سے ہیں، آپ کی ساری عمر درسِ حدیث میں گذری ہے، بڑے بڑے علما نے آپ سے سندِ حدیث حاصل

کی ہے، جن میں سے مولانا محمد علی صاحب مونگیری اور حضرت حکیم الامۃ مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی کا نام لینا ہی کافی ہے، آپ سے بھی صدہا علما فیضیاب اور علو اسناد کے ساتھ کامیاب ہوئے، آپ کی اسانید حدیث میں مستقل رسالہ طبع ہو چکا ہے،

محدث بہار مولانا ظہیر حسن شوق نیموی رح ۱۳۲۲ھ	آپ مولانا عبد الحیٔ لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں سلسلۂ ولی اللّٰہی کے قابلِ فخر محدث ہیں، آثار السنن کی دو جلدیں مع حاشیۃ التعلیق الحسن آپ کی حدیث دانی تبحر علمی اور وسعتِ نظر

اور شانِ تحقیق پر شاہد ہیں، افسوس یہ کتاب پوری نہ ہوئی، ورنہ اپنے باب میں بے نظیر ہوتی، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

وتغمدہ بغفرانہ، (باقی)

اسلامی معاشیات

کے

چند فقہی اور قانونی ابواب

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ

(۲)

نمک کا مسئلہ گذشتہ بالا عبارتوں سے جہاں اور باتیں ثابت ہو رہی ہیں، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نمک کی کان بھی پبلک کا مشترک سرمایہ ہے، نہ وہ انفرادی ملکیت بن سکتی ہے، اور نہ حکومت اس پر کوئی محصول عائد کر سکتی ہے، اور اسی بنا پر بعض علماء نے ہندوستان میں پچھلے دنوں یہ عام فتوی دیدیا تھا کہ اسلامی حیثیت سے نمک سازی پر محصول لگانا یا حکومت کو نمک بنانے سے لوگوں کو روکنا جائز نہیں ہے، مجھے سیاسی مصالح سے بحث نہیں لیکن علماء کے متعلق یہ ضرور خیال آتا ہے کہ مسئلہ کو ہمیشہ اس کے تفصیلات کے ساتھ پبلک میں پیش کرنا ان کی دیانت کا اقتضا ہونا چاہئے، نمک کی ایسی کانیں جن میں مندرجۂ بالا صفات پائے جاتے ہوں یعنی (۱) لوگوں کی رسائی بلا خرچ نمک تک ہوتی ہو (۲) عام لوگوں کی آمد و رفت اس کان تک لگی ہوئی ہو اور لوگ اوس سے نفع اٹھا رہے ہوں، بلا شبہہ نمک کی ایسی کانوں کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر وہی ہے لیکن اگر بجائے اس کے صورت حال یہ ہو کہ

کان لقرب الساحل موضع اذا سمندر کے کنارے کوئی ایسی جگہ ہو کہ جب

حصل فیہ الماء صار ملحا،

سمندر کا پانی اس میں آکر جمع ہو جائے، تو نمک بن جاتا ہو،

تو اس کے متعلق فقہار کا عام فتویٰ یہ ہے کہ

ملک بالاحیاء وللامام اقطاعہ،

تو اس کا آدمی مالک ہو جاتا ہے احیاء (آبادی) کے ذریعہ سے بھی، اور امام (حکومت) اس کو افراد کی جاگیر میں بھی دے سکتا ہے،

اس قسم کی زمینوں کی "احیاء" یا زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

تھیئتہ لما یصلح لہ من حفر ترابہ وتمھیدہ وفتح قناۃ الیہ تصیب الماء الیہ

جس کام کی اس میں صلاحیت ہو، اس کے لئے اس کو تیار کرنا یعنی اس کی مٹی کھودنی، اس کو کشادہ کرنا، سمندر سے نالی نکال کر اس کو گڑھے تک لانا تاکہ سمندر کا پانی اس میں آکر گرے،

نمک بنانے کے لئے سمندر کی ساحلی زمینوں کو بندوبست کرنے کا حکومت کو اختیار کیوں ہے، اور ان میں انفرادی ملکیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے، اس کی وجہ فقہار نے یہ لکھی ہے کہ

لانہ لا یضیق علی المسلمین باحداثہ بل یحدث نفعہ بفعلہ فلم یمنع منہ کبقیۃ الموات،

کیونکہ سمندر کے کنارے اس قسم کے کارخانے قائم کرنے سے مسلمانوں میں کوئی تنگی نہیں پیدا ہوتی، بلکہ اس زمین کا نفع آباد کرنے والے کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے پس اس کو اس فعل سے نہیں روکا جائیگا، جیسے موات کی دوسری زمینوں کے آباد کرنے سے،

(المغنی ج ۶ ص ۱۵۱)

اور غالباً ہندوستان میں نمک سازی کا جو مسئلہ پیدا ہوا تھا، وہ یہی صورت تھی،

عام معدنیات کا حکم | اور صرف نمک ہی نہیں، بلکہ اس کے سوا بھی جن معدنی امور کا ذکر کیا گیا ہے، کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہو سکتی، اس حکم کو بھی ہر قسم کی کانون کے لئے عام حکم نہ سمجھنا چاہئے بلکہ یہ حکم ان ہی معدنی چیزون تک محدود ہے، جو خود بخود باہر آگئی ہوں اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہوں، ورنہ ایسے معادن جن کو فقہی اصطلاح میں معادن باطنہ کہتے ہین، اور جن کی تعریف شرح کبیر میں یہ کی گئی ہے،

هی التی لا یوصل الیها الا بالعمل والمؤنة، (ص ۱۷۵ جلد ۶)	یہ ان کانون کو کہتے ہین جن کی پیداوار تک رسائی بغیر عمل اور مشقت و محنت کے نہین ہو سکتی،

پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے

لم تکن ظاهرة فحفرها انسان واظهرها،	یعنی ابتداءً قدرتی طور پر وہ معدن ظاہر نہ تھا پھر کسی نے کھود کر اس کو نکالا اور نمایان کیا،

اس قسم کے معادن کی مثال میں حسب ذیل چیزون کا ذکر کیا جاتا ہے،

کمعادن الذهب والفضة و الرصاص والبلور،	جیسا کہ سونے، چاندی، سیسہ، بلور وغیرہ کی کانون کا حال ہے،

بہرحال ایسے معادن جن سے انتفاع بغیر عملی جد وجہد اور مصارف کے نہیں ہو سکتا، خواہ وہ کسی قسم کے ہون، اگرچہ بعض فقہا ان مین بھی انفرادی ملکیت کے قائل نہیں ہیں، ان کا مذہب ہو کہ حکومت کسی انفرادی شخصیت کے ساتھ ان کو بھی بندوبست نہین کر سکتی، لیکن صاحب مغنی نے لکھا ہو کہ

والصحیح جواز ذالک،	درست یہی ہو کہ ان کانون کا بندوبست کرنا جائز ہے،

یعنی انفرادی ملکیت بن سکتی ہے، اور حکومت کو اس کا اختیار ہے کہ کسی واحد شخص کے ساتھ اس کو بندوبست کر دے "جواز" کے ثبوت مین ابوداؤد کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے،

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اقطع البلال بن حارث معادن القبلیۃ جلسیھا وغوریھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو قبلیہ کے معادن خواہ پست علاقوں میں ہوں یا بلند قطعات میں، بطور جاگیر کے عطا فرمایا،

اس سے ثابت ہوا کہ صرف جامد معادن ہی نہیں بلکہ سیال معادن مثلاً پارہ، پٹرول، تارکول وغیرہ ایسے معادن جن کے کھودنے اور نکالنے میں مصارف اور محنت پڑتی ہے، وہ انفرادی ملکیت بن سکتے ہیں، اور حکومت ان کو بندوبست کر سکتی ہے لیکن حکومت کو ان معدنی پیداواروں پر کسی قسم کے محصول عائد کرنے کا بھی حق ہے؟ یا بغیر کسی ڈیوٹی کے ملک کے باشندے اُن سے مستفید ہو سکتے ہیں، اس سوال کا تفصیلی جواب تو آئندہ حکومت کی آمدنی کے ذیل میں دیا جائے گا، لیکن اسلامی معاشیات کی وسعت نظری کا سرسری اندازہ کرنے کے لئے غالباً اس مسئلہ کا ذکر بیجا نہ ہوگا، جو فقہ کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے، ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں :-

اعلم ان مایستخرج من المعدن ثلاثۃ انواع جامد یذوب وینطبع کالنقدین والحدید وجامد لاینطبع کالجص والنورۃ والکحل والزرنیخ وسائر الاحجار کالیاقوت والملح ومالیس بجامد کالماء والقیر والنفط۔

(فتح القدیر ج ۱)

کانوں سے جو چیز نکلتی ہے، وہ تین قسم کی ہوتی ہے، ایسی جامد چیزیں جو پگھل سکتی ہوں، اور چھاپ قبول کر سکتی ہوں مثلاً سونے چاندی لوہے وغیرہ کا جو حال ہے، دوسری قسم وہ ہے جو جامد اور غیر سیال تو ہو لیکن چھاپ قبول نہ کر سکتی ہو، مثلاً گچ، چونے، سرمہ، ہڑتال، بلکہ ان تمام چیزوں کا حال ہے جن کا شمار پتھروں کے ذیل میں کیا جاتا ہے، مثلاً یاقوت، نمک، تیسری قسم وہ ہے جو جامد نہ ہو، بلکہ سیال ہو مثلاً پانی، تارکول، مٹی کا تیل،

ان تین قسموں کو بیان کرنے کے بعد آیندہ جو چیز انھوں نے لکھی ہے، دنیا کی حکومتوں کی شاید اس سے آنکھیں کھل جائیں، اور موجودہ حکومتوں کی رعایا میں کسی حکومت کے اس نقطۂ نظر کو سُن کر معلوم نہیں کس قسم کے جذبات متلاطم ہونے لگیں، ابن ہمام نہایت سادگی کے ساتھ لکھتے ہیں، کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک

لا یجب الخمس الا فی الاول، — خمس (پیداوار کا پانچواں حصہ) صرف پہلی قسم سے حکومت وصول کرسکتی ہے،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قسم اوّل کے سوا اور تمام معدنی پیداوار ہر قسم کے محصول سے آزاد ہیں، اور یہ تو امام ابو حنیفہ کا خیال ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس سے بھی آگے قدم بڑھایا ہے، کہ

وعند الشافعی لا یجب الا فی النقدین، — بجز سونے چاندی کے اور کسی چیز پر خمس واجب نہیں ہے،

اگرچہ اس مسئلہ کے متعلق بعض تفصیلات ہیں، جن پر بحث کا یہاں موقع نہیں، بالفعل اتنا اجمالی بیان کافی ہو سکتا ہے،

حدیث "الناس شرکاء" میں جن جن چیزوں کو پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا گیا ہے، اب تک اس کے پہلے جزء "الماء" اور اس کے متعلقات کی گویا یہ تفصیل تھی، باقی دو جزء اور رہ گئے، یعنی "الکلاء" اور "النار" اب ان کے متعلق مسائل کی تشریح کی جاتی ہے،

الکلاء (گھاس) کے مسائل کی تفصیل

حدیث میں چونکہ "الکلاء" کا لفظ آیا ہے، اس لئے اس کی تحقیق ہونی چاہئے، کہ "الکلاء" کے لغوی معنی کیا ہیں، صاحب مغرب نے اپنی کتاب فقہی لغات میں اس لفظ کو لیا ہے، اور اس پر ایک طویل بحث کی ہے، امام محمد کا قول تو یہ نقل کیا ہے، کہ

الکلاء ما لیس لہ ساق وما قام علی ساق لیس بکلاء — "الکلاء" ایسی نباتی چیز کا نام ہے جو تنہ پر قائم نہ ہو، اور جو تنہ پر قائم ہو وہ کلاء نہیں ہے"

ساق" اور تنہ پر جو نباتات کھڑے ہوتے ہیں، ان کی مثال میں "عوسج" اور "غرقد" وغیرہ جنگلی درختوں کو شریک کیا ہے لیکن مطرزی صاحب مغرب نے خود اپنا فیصلہ یہ لکھا ہے:

والظاهر انه يقع على ذا ساق وغيره — بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کلاء کا اطلاق تنے والے اور بے تنہ دونوں قسم کے نباتات پر ہوتا ہے۔

وجہ یہ بیان کی ہے کہ فقہاء "الکلاء" کی شرح میں عموماً یہ کہتے ہیں کہ

لما ترعاه الدواب رطبا كان او يابسا — جنھیں عموماً چوپایے چرتے ہیں خواہ خشک حالت میں یا تر۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ جانور عموماً بے تنہ والی گھانسوں کو بھی چرتے ہیں، اور بعض تنہ رکھنے والے جنگلی جھاڑ مثلاً ببول "عوسج"، غرقد وغیرہ کی پتیاں بھی چرتے ہیں، اس سے "الکلاء" کو بجائے گھاس کے ہر اس نبات کے لئے عام رکھنا چاہئے جسے جانور چرتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے ابو عبید کی کتاب الاموال سے بھی اپنی تائید میں بعض چیزیں نقل کی ہیں، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، چاہئے کہ اپنے بھائی کو پانی اور شجر (درخت) میں گنجائش دے، اور اس درخت سے مراد وہی چرے جانے والے درخت ہی ہو سکتے ہیں، البتہ "الکلاء" کے بجائے یہاں الشجر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ حکم گھاس اور ان درختوں کو بھی عام ہے جنھیں چوپائے اور مویشی چرتے ہیں، نیز ایک مشہور حدیث "حمی" (رکھت) کے باب میں ہے کہ اُمیّہ بن حمال نے اراک (پیلو) کے متعلق دریافت کیا، کہ اس کو حمی (رکھت) یعنی اپنے اذونوں کے لئے اس کے جنگل کو کوئی مخصوص کر سکتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ما لم تنله اخفاف الابل — ہاں، اگر اونٹوں کے قدم اگر وہاں نہ پہنچتے ہوں، تو جائز ہے۔

ابو عبید نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حکم پیلو کے ان درختوں سے متعلق ہو سکتا ہے جو کسی کی مملوکہ

اراضی مین ہون یعنی مملوکہ زمین کے پیلو کو بھی محض اپنے مویشیون کے لئے کوئی مخصوص نہیں کرسکتا، کیونکہ غیر مملوکہ زمین کے پیلو کو حمی (رکھت) بنانے کا تو کسی کو کیا اختیار ہو خواہ وہ دور کے ہون یا قریب کے ہون، اونٹون کی دسترس سے باہر ہون یا نہ ہون، پس مطلب یہی ہوسکتا ہے، کہ مملوکہ زمین کے پیلو کو بھی رفاہیت عامہ کے خیال سے حمی نہ بنانا چاہئے، اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ "الکلاء" کا لفظ تنہ دار اور غیر تنہ دار ہر قسم کی چری جانے والی روئیدگیون کو عام ہے، اور یہی واقعہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقصود مویشیون کی چرائی میں سہولت پیدا کرنی ہے، شریعت کا مقصد ہے کہ اس قسم کی چیزون کو حتی الوسع پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا جائے، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں چراگاہون کی چند مثالین بیان کی ہین،

(۱) پہلی شکل تو یہ ہے کہ کسی گاؤن یا آبادی کی کوئی چراگاہ اور جنگلی جھاڑ اور گاؤن کا کوئی خاص باشندہ اس زمین کا مالک نہین ہو بلکہ

قد عرفت انها لهم فهي لهم على حالها،	عموماً یہ مشہور و معروف ہو کہ فلان چراگاہ (یا جنگلی جھاڑیان) فلان گاؤن والون کی ہین پس وہ انہی لوگون کی اپنے حال پر رہینگی

اور گاؤن والون کی اس زمین مین اجمالی ملک ثابت ہوگی، اب دیکھا جائے گا کہ اس گاؤن کے باشندون کی مویشیون وغیرہ کے لئے کوئی دوسری چراگاہ یا کچھ، رمنہ وغیرہ ہے، یا نہین اگر ہے تو ایسی صورت مین

لیس لهم ان یمنعوا الکلاء والماء ولاصحاب المواشی ان یرعوا تلک المروج ویستقوا من تلک المیاه،	گاؤن والون کا اس کا حق نہ ہوگا کہ عام مویشی والون کو اس قسم کی چراگاہون اور دمنون مین چرائی سے روکیں، اسی طرح مویشی والون کو اس کا بھی حق ہے، کہ یہان جو پانی ہو، اس سے استفادہ کرین (خود پئیں، جانورون کو پلائین،)

لیکن اگر یہ شکل نہیں ہے بلکہ

لم یکن لاھل ھذہ القریۃ الذین	اس گاؤن والون کے لئے جن کی یہ چراگاہین
لھم ھذہ المروج وفی ملکھم موضع	ہین، ان کیلئے بجز ان کے چرائی کی کوئی دوسری
مسراح ومرعی لدوابھم ومواشیھم	جگہ نہ ہو، اور نہ کوئی دوسری چراگاہ ہو
غیر ھذہ المروج،	جس مین ان کے جانور اور مویشی چر سکتے ہون،

اور اس کے ساتھ صورت حال یہ ہو کہ

متی اذنوا الناس فی رعی تلک		اگر عام لوگون کو ان زمینون اور چراگاہون
المروج والاحتطاب منھا اضر	نقصان رسان ہو	مین چرانے اور ہر شخص کو لکڑی کاٹنے کی
ذالک بھم وبمواشیھم ودوابھم		اجازت دیدین گے، تو یہ بات ان کے لئے
		اور ان کی مویشیون و چوپایون کے لئے

قاضی ابو یوسف کا ایسی حالت مین یہ فتوی ہے کہ

کان لھم ان یمنعوا کل من اراد	اس قسم کے گاؤن کے باشندون کو اس کا حق
ان یرعی فیھا او یحتطب منھا،	ہے کہ عوام کو اپنی چراگاہون مین چرانے سے
	روکین، اور اس سے منع کرین کہ کوئی اسکی
	جھاڑیون سے لکڑی کاٹے،

بہرحال حدیث نے "الکلاء" کو جب پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا ہے، تو ایسی صورت مین انفرادی ملکیت تو اس پر طاری نہیں ہو سکتی، لیکن اشتراک مین کچھ حد بندی اس وقت ہو سکتی ہے جب دوسرے گاؤن والون کی شرکت سے خود اس گاؤن والون کا نقصان ہو جن کی طرف یہ چراگاہ منسوب ہے، اور یہ حال تو ان چراگاہون کا ہے جن کی زمین کسی شخص کی واحد ملکیت نہین ہے، بلکہ یا تو ان کا کوئی مالک ہی نہین ہے یا سارے گاؤن کی ذ

ملکیت مشترکہ ہے لیکن اگر کسی شخص کی انفرادی ملکیت والی زمین میں "الکلاء" ہو تو باوجود زمین کے مالک ہونے کے الکلاء کا وہ قانوناً مالک نہیں ہے، بدائع میں ہے،

اما الکلاء الذی ینبت فی ارض مملوکة فھو مباح غیر مملوکة،	"الکلاء" (گھاس) جو کسی مملوکہ زمین میں ہو، (تو اس سے استفادہ کا حق ہر شخص کو حاصل ہے) یعنی مباح و جائز ہے، اور اس الکلاء کا کوئی مالک نہیں ہے،

اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو پانی کا ہے، کہ اگر اس الکلاء کے سوا لوگوں کو اپنی مویشیوں کے لئے چرائی زمیسر آسکتی ہو، تو مالک کا حق ہے کہ اس کو مجبور کریں کہ ان کے مویشیوں کو اپنی زمین میں آنے دے یا گھاس کٹوا کر لوگوں کے حوالہ کرے، اور دونوں شکلوں پر راضی نہ ہو تو بزور اپنے حق کو اس سے لوگ حاصل کریں،

یہ حکم تو الکلاء کا اس وقت تک ہے جب تک زمین میں لگا ہوا ہے، لیکن زمین سے الگ کر لینے کے بعد جو اس پر قبضہ کرے گا، وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے، ٹھیک جو حال پانی کا تھا کہ برتن میں محفوظ کر لینے کے بعد انفرادی ملکیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے، بدائع میں ہے،

اذا قطعه صاحب الارض و اخرج فیملکه،	جب اس کا مالک الکلاء کو کٹوالے اور نکالے تو پھر اس کا وہ مالک ہو جاتا ہے،

صاحب الارض (مالک زمین) کی قید اتفاقی ہے، بلکہ جو بھی کاٹ کر اس پر قبضہ کرے گا مالک ہو جائے گا اور اب اس کو وہ اسی طرح بیچ سکتا ہے، جیسے برتن اور مشک کے پانی کو فروخت کیا جا سکتا ہے، فقہ کا عام مسئلہ تو یہی ہے لیکن حنفی فقہاء نے بعد کو اس میں کچھ تفصیل بھی کی ہے یعنی دیکھنا چاہئے کہ "الکلاء" قدرتی طور پر پیدا ہوا ہے یا مالک زمین نے مصنوعی تدبیروں سے ان کو اُگایا ہے، دوسری صورت میں ان کا خیال ہے کہ

اذا سقاه قام علیه	اگر زمیندار (صاحب الارض نے) اس الکلاء

ملکہ، (بدائع) | کو پہنچا ہے تو ایسی صورت میں اوس کی ملکیت قائم ہو جائے گی،

حدیث کے ظاہر معنی پر اصرار کرتے ہوئے لکھا ہو کہ

الصحیح جواب ظاہر الروایۃ لان الاصل فیہ ہو الاباحۃ، [illegible] | ظاہر روایت میں اس مسئلہ کا جو جواب دیا گیا ہو وہی درست ہے، کیونکہ "اصل" تو یہی ہو کہ "انکلا"

اس سلسلہ میں فقہار ایک اور مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں، بات یہ ہے کہ عربی میں ایک لفظ "مرج" کا ہے جس کی جمع "مروج" ہے، یہ اردو کے "رمنہ" یا "کنجہ" کے ہم معنی ہے، غالباً فارسی کا "مرغزار" "مرجزار" ہی کی کوئی صورت ہے، لیکن ایک اور لفظ "اجمہ" کا ہے، جس کی جمع آجام ہے، علامہ مطرزی مغرب میں اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں، الاجمۃ الشجر الملتف یعنی گھنے درختوں کو کہتے ہیں، لیکن یہ لغوی معنی ہوئے پھر فقہار جس محاورہ میں اس کو استعمال کرتے ہیں، اس کے متعلق کہتے ہیں،

وقولہم بیع السمک فی الآجام یرید ون البطیحۃ التی منبت القصب والبراع، | مچھلیوں کا آجام میں بیچنا یہ جو فقہا لکھتے ہیں تو آجام سے سنگریزہ والی زمین مراد ہے جو نرسل یا کلک کے اگنے کی جگہ ہے،

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگ ریزوں والی ریتلی زمینوں کے گہرے حصّوں میں برساتی پانی جو جمع ہو جاتا تھا، اور اوس کے ارد گرد یا خود اسی میں نیستان بن جاتا تھا اس کو آجام کہتے ہیں، چونکہ پانی بھی اس میں جمع ہو جاتا تھا، اس لئے اس میں مچھلیاں بھی پیدا ہو جاتی تھیں، خلاصہ یہ ہے کہ آجام دراصل آبی نیستان کو کہتے ہیں، فقہار نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ان کا شمار بھی مروج اور کنجوں کے ذیل میں ہوگا، اور انفرادی ملکیت اس کی درست ہو سکتی ہے، یا نہیں قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اس کا کلیہ یہ لکھا ہے کہ اس زمین کو دیکھنا چاہئے جس میں اجمہ ہے، اگر زمین کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں ہے، تو نیستان (اجمہ) ہی کیا تمام غیر مملوکہ زمینوں کا حکم یہی ہے

فان لم تكن فی تلك لاحد ملك فلا باس ان یحتطب منه جمیع الناس كا ثمار فی الجبال والمروج ولا ودیة والشجر مالم یغرسه الناس ولا باس بان یاكل من ثمارها ویتزود مالم یعلموا ان ذلك فی ملك انسان وكذلك العسل یوجد فی الجبال والغیاض (الخراج)

اگر اس زمین میں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہو تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہر قسم کے لوگ اس سے لکڑی کاٹ کاٹ کر لیجائیں، جیسے پہاڑوں مرغزاروں، ممٹوں، وادیوں، ندیوں وغیرہ کے درختوں اور ان کے پھلوں کا حال ہے کہ جب تک کسی خاص شخص نے ان کو نہ لگایا ہو، ہر شخص کو ان سے استفادہ کا حق ہے، اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اگر اس قسم کے درختوں کے پھلوں کو آدمی کھالے یا توڑ کر گھر لیجائے، عام استفادہ کا یہ حق اسی وقت تک ہے، جب تک ان جنگلی درختوں کے متعلق معلوم نہ ہوا ہو کہ کسی خاص شخص کی ملکیت میں ہیں، پہاڑوں اور جنگلوں میں جو شہد پایا جاتا ہے، اس کا بھی یہی حال ہے،

لیکن اگر زمین کسی کی مملوکہ ہے تو پھر "الکلاء" کے سوا اس کی اور پیداواروں میں تصرف کرنے کا حق مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہ ہوگا، خواہ زمین کے مالک نے اسے بویا ہو یا خودرو ہو، بدائع میں ہے،

لیس لاحد ان یحتطب من اجمة رجل الا باذنه لان الحطب والقصب مملوكان لصاحب الاجمة ینبتان علی ملكه وان

ایسا اجمہ (نیستان) جو کسی خاص شخص کی ملک میں ہو اس کے متعلق کسی کو اس کا حق نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی لکڑی کاٹے، کیونکہ لکڑی اور نلے کے ڈنٹھل یہ دونوں اجمہ

لم یوجد منه الا نبات اصلاً | کی مالک کی ملک ہے، وہ زمین سے پیدا ہی ہوتی ہیں، مالک زمین کی ملک میں اگرچہ ان کے اگانے میں مالک زمین نے کوئی کام نہ کیا ہو، یعنی خودرو ہوں جب بھی اسی کی ملک قرار دی جائیں گی۔

بہرحال اس باب میں کلیہ وہی ہے جو صاحب بدائع نے لکھا ہے کہ

الاصل ان یکون من المملوک مملوکاً الا ان الاباحة فی بعض الاشیاء ثبت علی مخالفة الاصل بالشرع والشرع ورد بھا فی اشیاء مخصوصة فیقتصر علیھا | اصل یہ ہے کہ مملوکہ چیز سے جو چیز پیدا ہو گی وہ بھی مملوک ہی ہو گی، لیکن اس اصل کے خلاف بعض چیزوں میں شریعت نے "اباحت" کا قانون نافذ کیا ہے یعنی استفادہ کا حق ہر شخص کو دیدیا ہے، لیکن اباحت کا یہ قانون چند مخصوص چیزوں کے ساتھ محدود ہے، اس لئے حکم بھی ان ہی تک محدود رہے گا۔

تیسرے اشتراکی سرمایہ آگ کے احکام

اب تیسرا جزء "النار" کا رہ گیا ہے، جو حدیث میں عام پبلک کی مشترک چیز قرار دی گئی ہے، فقہا نے اس کی بھی کچھ تفصیل کی ہے، صاحب بدائع لکھتے ہیں،

النار اسم جوھر مضی دائم محرکة علواً | "آگ ایک تابناک روشن جوہر کا نام ہے جو ہمیشہ اوپر کی طرف متحرک رہتی ہے،"

اور اسی بنا پر فقہاء کا یہ فتوی نقل کیا ہے کہ

فلیس لمن اوقدھا ان یمنع غیرہ من الاصطلاء بھا لان النبی صلی اللہ علیه وسلم اثبت الشرکة فیھا | پس جس نے آگ سلگائی ہو اس کو اس کا حق نہیں ہو کہ دوسروں کو تاپنے سے روکے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ میں "شرکت" ثابت فرمائی ہے۔

اور اصطلاء یعنی تاپنے کا ذکر تو بطور مثال کے کیا گیا ہے، ورنہ مقصد یہ ہے کہ آگ کی حرارت ہو یا روشنی یا اسی قسم کا کوئی کام استفادہ کی ان تمام صورتوں کا حق ہر شخص کو ہے، اور آگ یا لیمپ روشن کرنے والے کو اس کا حق نہیں ہے، کہ وہ استفادہ کے اس حق پر کوئی معاوضہ لے، مگر اس کے بعد سوال آگ سے نہیں، بلکہ اس لکڑی یا تیل یا اس چیز سے ہے جس میں آگ پیدا کیجاتی ہے، کہ کیا اس کا شمار بھی مشترک سرمایہ میں ہو جائے گا، صاحب بدائع لکھتے ہیں،

فاما الجمر فلیس بنار وھو مملوک	لیکن انگارہ تو وہ آگ نہیں ہے پس جس کا
لصاحبہ فلہ حق المنع کسائر	وہ ہے وہ اس کا مالک ہے، اسی لئے دوسروں
املاکہ	کو روکنے کا حق اُسے حاصل ہے، جیسے دوسرے
	مملوکات میں یہی حق اس کو دیا گیا ہے،

اگرچہ جزئیات کا اور طویل سلسلہ موجود ہے، لیکن اس باب میں اسلام کے جو کلی نقاط نظر تھے، ایک حد تک ان کی بحث ختم ہوگئی، اب اس سلسلہ کی صرف ایک چیز رہ جاتی ہے، یعنی شوارعِ عام،

عام شوارع اور راستوں کے احکام جن کی حیثیت اسلام ہی میں نہیں بلکہ تقریباً دنیا کے تمام قوانین اور دستور میں آبادی کے عام باشندوں کے مشترک مفاد کی ہے، اسلامی مقننین نے بھی اس کی اس حیثیت کو باقی رکھا ہے، بغیر کسی اختلاف کے فقہ کا یہ اتفاقی مسئلہ ہو کہ

ما کان من الشوارع والطرقات	راستے کوچے، شہر کے میدان، چوک جو آبادیوں کے
والرحاب بین العمران فلیس	درمیان ہوتے ہیں، ان کے متعلق کسی کے لئے جائز
لاحد احیاءھا،	نہیں ہو کہ ان کو آباد کرے،

یعنی کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے، کہ بطور انفرادی ملکیت کے ان پر قبضہ کرکے ان کو اپنی ملکیت بنالے، مثلاً ان پر مکان بنائے یا اس قسم کا کوئی تملیکی تصرف کرے، مندرجہ بالا عبارت کے الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

یہ حکم صرف سڑکون اور کوچون ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ "الرحاب" یعنی شہرون کے بیچ بیچ مین جو میدان مختلف ضرورتون کے لئے مثلاً کھیلنے کودنے کے لئے یا اس زمانہ مین جو سیرگاہین بنا دی جاتی ہین، یہ بھی پبلک کے مشترک مفاد مین داخل ہو جاتی ہین، اور ان میں بھی کسی شخص واحد کو مالکانہ تصرفات کا حق نہیں ہے، اس قانون کی تفصیل کرتے ہوئے فقہاء نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے، کہ یہ حکم صرف ان ہی سڑکون یا گلیون یا میدانون تک محدود نہین ہے، جن پر تصرف کرنے سے عام مخلوق کو تکلیف ہوتی ہو، بلکہ تکلیف ہو یا نہ ہو، زمین کا ہر وہ حصہ جو عام گزرگاہ کی حیثیت کسی آبادی میں اختیار کر چکا ہے، سب کے لئے یہ حکم عام ہے، ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہین :۔

سواء کان واسعًا او ضیقًا وسواء	خواہ کشادہ ہون یا تنگ، اور خواہ اسمین تصرف
ضیق علی الناس اولم یضیق،	کرنے سے لوگون پر تنگی پیدا ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو"

مسلمانون مین شاہراہون اور شہر کے ان مقامات مین عام باشندون کے مفاد کو کس حد تک اہمیت حاصل ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس حکم کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب مغنی لکھتے ہین :۔

لان ذالک مشترك فیه	کیونکہ عام مسلمانون میں یہ چیزین مشترک ہیں،
المسلمون ومتعلق به مصلحتهم	اور ان کی مصلحتین ان سے متعلق ہیں، تو گویا
فاشبه مساجدهم،	مسلمانون کی مسجدون کی مانند ان کا حال ہے"

عام راستون کا اسلام مین احترام مندرجۂ بالا فقرہ مین "فاشبه مساجدهم" کے الفاظ قابل غور ہین اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہری حقوق کا مسلمانون نے کتنا احترام کیا ہے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اماطة الاذی عن الطریق یعنی راستون سے ان چیزون کا ہٹانا جو راہگیرون کے لئے باعث تکلیف ہون، اس فعل کو من الایمان (یعنی ایمان کا جزء) قرار دیا ہے، اور اس بنا پر مشہور حدیث الطهور شطر الایمان (پاکیزگی اور صفائی ستھرائی ایمان کا ایک بڑا حصہ ہے) میں دوسری چیزون کی تطہیر و ستھرائی کے ساتھ مکانون اور سڑکون کی صفائی کو بھی داخل سمجھنا چاہئے، جب راستون کی صفائی

کی صحیح حدیثوں میں اتنی اہمیت ہے تو فقہانے شوارع وطرق کو مسلمانوں کے حقوق کے اعتبار سے اگر اشبہ بالمساجد قرار دیا ہے، تو اس پر قطعاً تعجب نہ ہونا چاہئے، اور اس خیال کی بھی تغلیط ہوتی ہے، کہ بلدیات اور میونسپلٹی وغیرہ کے اصول وقوانین جدید مغربی تمدن کے نتائج ہیں[1] خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں گفتگو ان فقہی احکام کے متعلق کر رہا تھا، جو شہروں اور آبادیوں کی عام گزرگاہوں وغیرہ کے متعلق ہیں کہ ان میں کسی قسم کی انفرادی ملکیت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، نہ خود ان کو اپنی ملک کوئی بنا سکتا ہے، اور نہ حکومت ایسا کر سکتی ہے، البتہ اس قسم کی سڑکوں اور گزرگاہوں پر بیٹھ کر عام طور سے جو لوگ خرید و فروخت کرتے ہیں، فقہانے اس کے متعلق لکھا ہے،

ان کان مجالس یضیق علی المارۃ	اگر گزرگاہوں کی ان نشست گاہوں کی وجہ
لم یحل له الجلوس فیه ولا	سے آمد و رفت کرنے والوں کی تنگی محسوس ہو تو
یحل للامام تمکینه بعوض ولا غیر	پھر ان میں بیٹھ کر خرید و فروخت جائز نہ ہوگا،
(مغنی)	اور نہ حکومت کے لئے جائز ہے کہ ایسے مقامات پر کسی کو قبضہ معاوضہ لے کر عطا کرے،

لیکن سڑک اگر اتنی کشادہ ہے کہ راہگیروں کو کوئی تنگی نہیں پیدا ہوتی، تو ایسی صورت میں

یجوز الارتفاق بالقعود فی	ان گزرگاہوں میں جو کشادہ اور وسیع
الواسع من ذالك للبیع والشراء	مقامات ہوں تو ان پر بیٹھ کر خرید و فروخت
علی وجه لا یضیق علی احد	کی آسانی حاصل کرنا اس وقت جائز ہے

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ آج جن قوانین کا تعلق محکمۂ صفائی یا آرایش وغیرہ سے ہے، اسلامی فقہاء نے ان کے مختلف پہلوؤں پر اپنی کتابوں میں بحث کی ہے، جاننا چاہئے کہ فقہ کی کتابوں سے ان قوانین کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار کیا جا سکتا ہے،

ولا یضر المارة، جب آنے جانیوالون کی راہ میں تنگی نہ پیدا ہوتی ہو نہ کسی اور کو،

اس قسم کا استفادہ سڑکون سے شہر کے عام باشندے خود بھی کرسکتے ہین، اور حکومت کو بھی ایسی صورت مین (یعنی جن مین ضرر کا اندیشہ نہ ہو) اختیار ہے کہ سڑکون بلکہ مسجدون کے احاطہ وغیرہ میں جسے رحاب المساجد کہتے ہین، اس قسم کے کاروبار کے لئے جگہ دیسکتی ہے،

ابن قدامہ نے الطرق الواسعة اور رحاب المساجد کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ

للامام اقطاعها لمن یجلس فیها — امام (حکومت) ان مقامات کو بیٹھنے والون کے لئے مخصوص کرسکتا ہے،

لیکن اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کردی گئی ہے،

ولا یملکها المقطع بذالک بل یکون احق بالجلوس فیها من غیره، — لیکن حکومت جس کے نام سے اس کو مخصوص کرے، وہ اس کا مالک نہ ہوگا، صرف دوسرون کے اعتبار سے بیٹھنے کا وہ زیادہ حقدار ہوگا،

اسی طرح اگر اس قسم کے مقامات پر حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی خرید و فروخت کے لئے بیٹھ جائے تو

السابق احق به ما دام فیه فان ترک متاعه فیه لم یجز لغیره ازالته لان ید الاول علیه و ان نقل متاعه کان لغیره ان یقعد فیه لان ید ه قد زالت — جس نے آگے بڑھکر اس پر قبضہ کرلیا ہو تو وہی اس کا حقدار ہوگا جب تک اس پر قابض رہیگا اگر اس قسم کے مقامات مین اپنے سامان چھوڑکر چلا جائے تو کسی دوسرے کو اس کا حق نہ ہوگا کہ اس کے سامان کو اس جگہ سے ہٹائے کیونکہ ابھی پہلے آدمی کا اس پر قبضہ باقی ہے اور اگر اپنے سامان کو وہان سے ہٹالے تو پھر اب دوسرے کو یہ حق ہے کہ اس مقام پر بیٹھ جائے

(مغنی ابن قدامہ جلد ۵)

بہرحال مشہور حدیث "منیٰ[1] مناخ من سبق" کی بنا پر ایسی صورت مین جس نے پہلے قبضہ کرلیا، اس کو ترجیح دیجائے گی، اس ضمن مین یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مقامات مین کوئی دوکان کے لئے کیا مکان، یا چبوترہ وغیرہ بنا سکتا ہے ؟

ابن قدامہ لکھتے ہین کہ

ليس له البناء لا دكة ولا غيرها	کسی کو ان مقامات مین کسی قسم کی تعمیر کا حق
لانه يضيق على الناس ويعثر به	نہین ہے، حتی کہ چبوترہ یا چبوترہ کے سوا بھی
المارة بالليل والضرير بالليل	کوئی چیز نہیں بنا سکتا، کیونکہ اس قسم کی
والنهار ويبقى على الدوام فربما	چیزون سے عام لوگ تنگی مین مبتلا ہوجائین گے
ادعى ملكه بسبب ذلك	اور گزرنے والون کے لئے خطرہ ہے کہ رات کے
	وقت اس سے ٹھوکر کھائین، اور پھسل کر گرین،
	اسی طرح شب و روز ضرر کا اس سے اندیشہ ہے،
	اور چونکہ ایسی چیزین دوامی ہوتی ہین، اسی لئے
	اس کا بھی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اس کی ملکیت کا دعویٰ کر بیٹھے

لیکن اس کے ساتھ اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ

له ان يظلل على نفسه بما	ان مقامات پر بیٹھ کر خرید و فروخت کرنے والون
لا ضرر فيه من بارية	کو اس کی اجازت ہے کہ اپنے اوپر کوئی سایہ
وتابوت وكساء ونحوه	کی چیز کھڑی کرین جس مین کسی کو ضرر نہ پہونچے،
لان الحاجة تدعو اليه	مثلاً چٹائی یا ٹاٹ یا کمل یا اسی قسم کی چیزون

[1] منیٰ کے میدان مین جو جہان اپنے اونٹ کو پہلے بٹھا دے گا وہی اس جگہ کا حقدار ہوگا، ۱۲

من غیر مضرۃ فیہ، سے سایہ کریں اور یہ اجازت اس لئے دیجاتی

ہے کہ اس کا وہ حاجت مند ہے، اور دوسرون

کا اس میں ضرر نہیں ہے،

یہان یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ جتنے احکام بیان کئے گئے ہین، ان کا زیادہ تر تعلق شوارع عام یا عام گذر گاہون وغیرہ سے ہے، لیکن خاص راستے اور کوچے جنھین صرف کسی خاص مکان یا چند مکان کے رہنے والے ہی اپنی آمد و رفت کے لئے استعمال کرتے ہون، ان کے احکام عام راستون سے مختلف ہین جن کی تفصیل فقہ کی کتابون مین موجود ہے، (باقی)

آل انڈیا اسلامک ہسٹری کانفرنس

کے

اجلاس پشاور کی رُوداد

از

ڈاکٹر سید عبد اللہ ایم اے، ڈی لٹ قائم مقام سکریٹری آل انڈیا اسلامک ہسٹری کانفرنس

آل انڈیا اسلامک ہسٹری کانفرنس کا دوسرا اجلاس ۷، ۸، ۹ راپریل ۱۹۴۴ء کو صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور مین منعقد ہوا، پشاور شمالی ہندوستان کے چند اہم تاریخی شہرون مین سے ہے، اس کے نواح مین بے شمار آثار مظاہر ایسے ہین جن سے مورّخ کو بہت کچھ مواد مل سکتا ہے، خود پشاور کے اندر عہد اسلام اور عہد قبل از اسلام کی بے شمار یادگارین موجود ہین، جو محققین کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہین،

ان سب خصوصیات کی وجہ سے جن کا یہ شہر حامل ہے، پشاور فی الحقیقت کانفرنس کے انعقاد کے لئے مناسب اور موزون مقام تھا،

کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے پشاور اور سرحد کے باشندگان نے ایک بااثر اور بارسوخ مجلس استقبالیہ کی تشکیل کی تھی، جس کے صدر آنریبل خان بہادر قاضی محمد امیر احمد خان جج جوڈیشل کورٹ پشاور تھے، موصوف نہایت خلیق، متواضع اور علم دوست بزرگ ہین، اور علی گڈھ کے تعلیم یافتہ ہین، نئی تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود صوم و صلوٰۃ کے پابند ہین، مجلس استقبالیہ کے سکریٹری قاضی محمد فرید ایم، اے (کینٹب) پروفیسر تاریخ اسلامیہ کالج پشاور مقرر ہوئے، مگر ان کے بے وقت علیل ہوجانے کی وجہ سے بہت سا

کام مسٹر سکاٹ آئی سی ایس پرنسپل اسلامیہ کالج نے انجام دیا، اس میں اِن کے ساتھ پروفیسر محمد رضا خان ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور اور دوسرے حضرات نے بھی ہاتھ بٹایا،

کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے مرکزی کمیٹی کی مجلسِ عاملہ نے خان بہادر مولوی محمد شفیع ایم اے (کینٹب) سابق پرنسپل اورنٹیل کالج اور ممبر سنڈیکیٹ پنجاب یونیورسٹی کا انتخاب کیا، علوم عربیہ میں موصوف کا جو تبحر اور اسلامی تاریخ اور کلچر کے ساتھ جو شغف ہے وہ اصحابِ علم سے پوشیدہ نہیں، نیز موصوف ان بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب (صدر مرکزی کمیٹی آل انڈیا اسلامک ہسٹری کانفرنس) کے ساتھ مل کر آج سے بیس پچیس سال قبل اسلامی تاریخ کے مضمون کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی میں شروع کی، اور باوجود مشکلات کے سالہا سال تک اُسے جاری رکھا، اپنے دورانِ ملازمت میں عربی فارسی زبانوں کے مرتبے اور حیثیت کو برقرار رکھنے اور ان کی تشویق و ترویج کے لئے جو کام کیا، وہ اظہر من الشمس ہے، انہی کی بدولت پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا عربی فارسی شعبہ اس وقت یہ درجہ حاصل کر چکا ہے کہ شاید (رامپور اور آصفیہ کے بعد) ہندوستان بھر کی کوئی لائبریری قلمیات و مطبوعات کے اعتبار سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، تاریخ سے متعلق موصوف کی ان خدمات و خصوصیات کی بنا پر صدارت کیلئے اُس سے زیادہ موزوں انتخاب مشکل تھا، اگرچہ وقت کی قلت اور سفر کی صعوبت کے پیشِ نظر یہ اندیشہ تھا کہ کانفرنس میں شامل ہونے والے مندوبین دوسرے صوبوں سے زیادہ تعداد میں نہ آسکیں گے، مگر یہ امر بے حد باعثِ اطمینان اور اس مضمون کی آیندہ ترقی کا مبشر ہے کہ کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے پنجاب کے علاوہ حیدرآباد تک کے مندوبین تشریف لائے تھے

کانفرنس مجوزہ پروگرام کے مطابق، ۸ اپریل کو ۳ بجے بعد دوپہر حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج میں شروع ہوئی، معززینِ شہر کثیر تعداد میں موجود تھے، جن میں آنریبل سردار عبدالرب خان نشتر وزیر مالیات، خان بہادر محمد قلی خان او۔بی۔ای، نواب محبوب علی خان ڈپٹی کمشنر کوہاٹ، آنریبل سردار اجیت سنگھ وزیر سرحد، میجر اسکندر مرزا ڈپٹی کمشنر پشاور، خان محمد اسلم خان، انڈر سکریٹری حکومت سرحد، خان بہادر شاہ عالم خان

ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم صوبہ سرحد، ملک خدا بخش ایڈوکیٹ جنرل اور بے شمار دوسرے حضرات شامل ہین،

تلاوت قرآن مجید کے بعد صدر استقبالیہ آنریبل قاضی محمد امیر احمد خان نے اپنا خطبہ پڑھا، اس کے بعد صاحب صدر نے اردو مین اپنا عالمانہ خطبہ سناتے ہوئے سب سے پہلے پشاور کی تاریخی اہمیت کا تذکرہ کیا، پشاور کے عہد جدید کا ذکر کرتے ہوئے کہا، میرے نزدیک پشاور کے اس دور جدید کی سب سے بڑی تاریخی یادگار اسلامیہ کالج ہے جو اس صوبہ اور متصلہ علاقہ مین مشعل ہدایت کا کام دے رہا ہے، اور ان اطراف کی حیات ذہنی اسکے دم جان بخش سے وابستہ ہے

اس کے بعد صاحب صدر نے مسلمانون مین علم تاریخ کی ابتدا اور اس کی عہد بعہد کی ترقیون پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا، کہ مورخین عرب کی مساعی مشکورہ اور عربون کے علم تاریخ کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے علامہ سخاوی (م - ۹۰۲) کی الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ کی فہرست مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنا کافی ہے، سیرت نبویہ، تراجم صحابہ، تاریخ خلفا، تاریخ ملوک و دول مخصوصہ و افراد مخصوصین، تاریخ وزرا، تاریخ امرار، طبقات فقہا، و قرار و ادبا، تاریخ صوفیہ، تاریخ قضاۃ، تواریخ مغنین و اشراف کرمار، و اذکیا، و مغفلین و بخلا و طفیلیین، و عقلار و اطبا، تاریخ متبدعہ، اخبار شجعان و عور و عمش و عمیان و حدبان و معمرین و شبان، اخبار عشاق، اخبار رواۃ حدیث، معاجم بلدان و وفیات، غرض کوئی شاخ تاریخ نویسی کی نہ تھی، جس پر انبار در انبار کتابین نہ لکھی گئی ہون، یہ صحیح ہے، کہ ان مین سے بے حساب کتابین دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکین اور بہت سی ایسی ہین جن کے وجود سے ہم اس وقت آگاہ نہین ہین، مگر بحمد اللہ کہ بہت سی ایسی کتابین ہم تک پہنچی ہین اور بعض ایسی ہین کہ وقتاً فوقتاً معرض خفا سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی رہتی ہین"

اس کے بعد جناب صدر نے عربی کے علاوہ فارسی اور ترکی کی تاریخی کتابون کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سٹوری کی پرشین لٹریچر مین فارسی زبان کے مورخون کا ذکر ۹۰ شمارون مین آیا ہے، .... مگر بقول کاراڈ و وایران نے مورخون کی نسبت شاعر زیادہ پیدا کئے ہین، اور فارسی تاریخین عربی کی تاریخون کی بہ نسبت اہمیت، وسعت نطاق اور ایجاز کے اعتبار سے بہت پیچھے ہین، کم از کم ایران کی تاریخون کی صورت

تو یہی ہے، البتہ ہندوستان کی فارسی تاریخون مین اعلیٰ پایہ کی تاریخین موجود ہین' ترکی مورخین کا ذکر کرتے ہوئے کہاکہ" ترکون کو من حیث القوم تاریخ سے بے حد شغف ہے،استنبول کے کتب خانون مین بہترین کتب تاریخی محفوظ ہین ،....مگر فی الجملہ ترکون سے ہمارے ادبی روابط حد سے زیادہ کمزور ہین ،اور مخطوطات یا ان کی نقول کا تو کیا ذکر ہے، وہان کی مطبوعہ کتابون کا حاصل کرنا بھی دشواریون سے خالی نہین "،

اس کے بعد ہندوستان مین اسلامی تاریخون کی بعض اہم ضروریات پر تبصرہ کرتے ہوے کہا:۔

"مورخین اسلام کے زرین کارنامون اور اسلامی تاریخ کے لٹریچر کی افراط کے اس نہایت اجمالی ذکر سے مقصد یہ ہے کہ اس گران بہا ورثے کی طرف جو ہم کو ماضی سے ملا ہے، قوم کو متوجہ کیا جائے، اور اس کے مطالعہ کی طرف رغبت دلائی جائے، اُن اسباق سے جو مطالعۂ تاریخ سے حاصل ہوتے ہیں فائدہ اٹھانا جب ہی ممکن ہے جب یہ کتابین عام طور پر میسر آجائین ،مفید کتابین جو اب تک طبع نہیں ہوئی ہین ، ان کو طبع کیا جائے ، ہر طبقہ کے لئے صحیح تاریخی روایتون پر مشتمل کتابین سہل الحصول ہون تاریخ اسلام کے جن ابواب پر ابھی تک کافی روشنی نہین پڑی ہے ان کو تحقیق کے بعد روشنی میں لایا جائے، مخطوطات' فرامین او رسکون کی جمع آوری کی جائے، مخطوطات کی فہرستین اور پھر ان فہرستون کی فہرستین Catalogue of Catalogues مرتب ہون ،مستند تاریخی کتابون کو شائع کیا جائے، تاریخ اسلام کی ترتیب اور اس کی مجملات' متوسطات اور مطولات کی تدوین ہو، مگر یہ سب کچھ جب ہی ممکن ہے جبکہ تحقیقاتِ علمی کے لئے سہولتین مہیا کی جائین ، اور تاریخِ اسلامی کے درس کے لئے ملک بھر کی یونیورسٹیون مین معقول انتظام کیا جائے، چونکہ ترکی زبان مین تاریخ اسلام کا بہت سا مواد موجود ہے، اس لیے ضروری ہے، کہ ترکی کی تحصیل و تعلیم کے لئے اولاً علی گڑھ یا لاہور مین کوئی بندوبست کیا جائے ،...."

خطبے کے بعد پہلا اجلاس ختم ہوا،

اس کے بعد ۵ بجے شام سبجکٹس کمیٹی کا جلسہ ہوا جس مین تمام مندوبین اور مجلس ستقبالیہ کے ارکان

شامل ہوئے، بحث و تمحیص کے بعد مجلس عام کے لئے تجاویز منظور ہوئیں،

۸ راپریل کو بوقت ۱۰ بجے صبح کانفرنس کا عام اجلاس شروع ہوا حاضرین میں معززین شہر اسلامیہ کالج کے اساتذہ اور طلبہ سب شامل تھے، ان میں سے میجر اسکندر علی مرزا ڈپٹی کمشنر پشاور، خان بہادر محمد قلی خان، محمد یوسف خان بی اے، (آکسن) خان بہادر سکندر خان، خان بہادر غلام صمدانی خان، پروفیسر شیخ محمد تیمور، پروفیسر تمہ مشن کالج لاہور وغیرہ کے اسمار قابل ذکر ہیں، اس اجلاس میں ذیل کے مقالات پڑھے گئے،

۱۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں قلمی کتابوں کے ذخیرے (انگریزی)	ڈاکٹر سید عبد اللہ لیکچرار اورنٹیل کالج لاہور
۲۔ سیف الدولہ محمود بن ابراہیم بن مسعود ابن محمود غزنوی (اردو)	مسٹر مشتاق احمد بھٹی ایم اے پنجاب یونیورسٹی
۳۔ دکن کی اسلامی تاریخ کی اہمیت (اردو)	سید مبارز الدین ایم اے، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۴۔ کشمیر میں اسلام کی ابتدا اور اشاعت (انگریزی)	ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی، ایم اے، ڈی لٹ سابق انسپکٹر آف سکولز (سی، پی)
۵۔ اکبری دور میں کتابوں کی تذہیب اور نقاشی (انگریزی)	ملک شمس الدین بی اے، (عجائب خانہ لاہور)
۶۔ ابن خلدون (انگریزی)	خان محمد یوسف خان، بی اے (آکسفورڈ)
۷۔ شاہان مغلیہ کے ذہنی اور علمی کارنامے، (انگریزی)	پروفیسر محمد موسیٰ کلیم، ایم اے، (اسلامیہ کالج پشاور)
۸۔ ہندوستان کے چند سلاطین کے مسکوکات (انگریزی)	مسٹر محمد اسمٰعیل ایم اے، (مہتمم عجائب خانہ لاہور)

[illegible]

(۹) جدید سائنس کا اسلامی پس منظر (انگریزی)	خواجہ عبد الوحید سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لاہور،

اس اجلاس مین چند تجاویز بھی منظور ہوئین جس کی تفصیل آیندہ آتی ہے،

اسی شام کو ۸ بجے مجلس استقبالیہ نے بڑے وسیع پیمانے پر دعوت طعام دی، اس دعوت مین شہر کے کم وبیش دو ڈھائی سو مہمان شامل ہوئے،

اس کے بعد ۱۰ بجے شب کو ملک شمس الدین صاحب بی اے (عجائب خانہ لاہور) نے مغلون کے عہد مین فن مصوری کے موضوع پر ایک باتصویر تقریر کی، اس تقریر کو حاضرین نے (جن مین چند وزرا اور دیگر عمائد شہر بھی شامل تھے) بے حد پسند کیا، تقریر کے اختتام پر آنریبل قاضی میر احمد خان صدر مجلس استقبالیہ نے اس تقریر کے لئے مقرر اور کانفرنس کے کارپردازون کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا، کہ اُن کی وجہ سے اہل پشاور کو اس دلچسپ موضوع پر کچھ سننے اور جاننے کا موقع ملا،

۹ر اپریل کو ۱۰ بجے صبح کانفرنس کی مجلس عام کا اجلاس پھر منعقد ہوا، اس اجلاس مین اتوار کی تعطیل کی وجہ سے زیادہ رونق تھی، اس کے علاوہ اس اجلاس مین کانفرنس کی بہت سی اہم اور ضروری تجاویز پیش ہوئین، جن کی تفصیل آیندہ سطور مین آتی ہے، پہلے سکریٹری نے رپورٹ پڑھی، اس کے بعد ذیل کے مقالات پڑھے گئے،

۱- تاریخ الترسل الی الخلافۃ الراشدہ،	(بزبان عربی)	مولانا سید محمد العربی المراکشی، اورنٹیل کالج لاہور
۲- پشاور کا قلعۂ شاہی،	(انگریزی)	مسٹر ایس، ایم جعفر (پشاور)
۳- خوشحال خان خٹک،	"	مسٹر دوست محمد کامل ایم اے، ایل بی (بنون)
۴- قرآن مجید اور مسئلہ نسخ،	"	مولانا فضل الرحمن ایم اے، (پنجاب یونیورسٹی)
۵- عہد مغلیہ مین جاگیرداری نظام،	"	پروفیسر محمد رضا خان ایم اے (اسلامیہ کالج پشاور)

۶- لاہور شاہیون کے عہد مین (انگریزی)	ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی ڈی لٹ (پروفیسر تاریخ دکن کالج پونا)
۷- مسلمانان ہند کے احیائے جدید مین مطالعۂ تاریخ کا حصہ (اردو)	ڈاکٹر سید عبد اللہ لکچرر اورنٹیل کالج لاہور،
۸- عہد شاہجہانی کے پنجابی مورخ، (اردو)	شیخ صادق علی دلاوری، ایم آے اورنٹیل کالج لاہور)
۹- آزاد بلگرامی بحیثیت مورخ کے (انگریزی)	مسٹر سکھ راج الفت لاہور ایم آے (")

یہ اجلاس ۱½ بجے ختم ہوا، اور ۹ بجے شب کو اسٹیشن پر صدر اجلاس خان بہادر مولوی محمد شفیع صاحب اور مندوبین کو رخصت کیا گیا،

کانفرنس کے اس اجلاس کے سلسلہ مین منتظمین نے قلمی کتابون کی نمایش بھی ترتیب دی تھی، افسوس ہے کہ اس نمایش مین باہر کی قلمی کتابین مہیا نہ ہوسکین، صرف اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ مشرقیہ کے نوادر تھے، صدر اجلاس نے متعدد موقعون پر اس امر پر اظہار افسوس کیا، کہ اسلامیہ کالج پشاور مین علوم مشرقیہ کے سلسلہ مین جتنی توجہ ہونی چاہئے، وہ نہین ہوئی، اور اوس کی قلمی کتابون کی مشرح فہرست کی انگریزی زبان مین ضرورت ہے جس کے بغیر ان نوادر کا حال انگریزی دان دنیا کو نہین معلوم ہوسکتا، اردو کی فہرست مرتبہ مولانا عبد الرحیم غنیمت ہے، مگر وہ ضروریات کے لئے مکتفی نہین،

اسلامیہ کالج پشاور کے لائق پرنسپل مسٹر اسکاٹ آئی سی ایس اور دیگر اساتذہ وارکان مجلس استقبالیہ لائق شکریہ ہین جن کے تعاون اور حسن اشتراک عمل کے بغیر کانفرنس کو یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی، کارپردازان کانفرنس خان بہادر محمد قلی خان کے بھی شکر گذار ہین،

تجاویز کانفرنس مین مختلف اصحاب کی طرف سے حسب ذیل تجویزین پیش ہوئین، اور ہندوستان کے تعلیمی ادارون اور حکومت کے مختلف شعبون سے حسب ذیل مطالبات کئے گئے:-

---

سلہ مضامین ۶ و ۹ کے مقالہ نگار حضرات تشریف نہیں لائے مقالے پڑھے گئے، ۷، ۸ و بوجہ تنگی وقت پڑھے نہ جا سکے،

۱۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد اپنے یہان اسلامی تاریخ کا مستقل شعبہ قائم کرین،

۲۔ اور اپنے یہان ترکی زبان کی تعلیم کا انتظام کرین،

۳۔ محکمۂ آثار قدیمہ حکومت ہند وغیرہ اسلامی آثار قدیمہ کی حفاظت کا بیش از بیش انتظام کرین، کتبات شائع کئے جائین، لاہور مین سلطان قطب الدین ایبک بادشاہ ہند اور نواب عبد الصمد خان وغیرہ صوبہ داران لاہور کے مزارات کو آثار محفوظ قرار دیا جائے،

۴۔ ہندوستان کی سب یونیورسٹیان، پنجاب یونیورسٹی، عثمانیہ اور مسلم یونیورسٹیان اپنے یہان کی قلمی کتابون کی مشرح فہرستین مرتب کرین،

۵۔ یونیورسٹیان علم کتبہ شناسی کی تعلیم اور اس کے لئے وظائف کا انتظام کرین،

۶۔ حکومت ہند، صوبجاتی حکومتین اور ریاستین اپنے اپنے دائرۂ اثر مین قلمی کتابون کی جمع آوری کا انتظام کرین،

۷۔ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ اعلیٰ پیمانہ پر تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کی تدوین کا انتظام کرین نیز علیگڈھ مین ایک عجائب خانہ آثار اسلامی کا قائم کیا جائے،

۸۔ فیڈرل سروس کمیشن اور صوبہ جاتی کمیشن اسلامی تاریخ کے مضمون کو مستقل حیثیت دین،

۹۔ پنجاب یونیورسٹی کے حکام سے دوبارہ مطالبہ کہ وہ اپنے یہان اسلامی تاریخ کا مستقل شعبہ قائم کرین،

۱۰۔ تمام یونیورسٹیون کے حکام اور قومی اور ملکی درسگاہین، اور ادارے اپنے زیر اثر عربی اور فارسی زبانون کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرین،

۱۱۔ قرار پایا کہ سنٹرل کمیٹی مین آنربل قاضی میر احمد خان، ملک خدا بخش خان، خان بہادر قلی خان خان بہادر سعد اللہ خان، پروفیسر شیخ تیمور اور مسٹر ایس ایم جعفر کو بطور رکن شامل کیا جائے،

۱۲۔ طے پایا کہ پشاور مین کانفرنس کے ماتحت ایک مقامی سوسائٹی تاریخی تحقیق کے لئے قائم کی جائے

جو علاوہ اور کاموں کے ایک مستند اور محققانہ تاریخ افغانستان مرتب کرے،

۱۳- جامعہ عثمانیہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اپنے زیر اہتمام اسلامی تاریخ کی تعلیم کے لئے اردو اور انگریزی مین موزون نصاب کی کتابین مرتب کرائین، اور اس سلسلہ مین اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ سے امداد کی درخواست کی جائے،

۱۴- حکومت سرحد سے مطالبہ کہ پشاور مین بھی ایک ریکارڈ آفس قائم کیا جائے،

۱۵- تمام اسلامی درسگاہین تاریخ اسلامی کی ترویج و تشویق کے لئے وظائف دین،

۱۶- پنجاب یونیورسٹی مین اسلامی تاریخ کو بی اے مین پورا مضمون بنایا جائے، جو عہد مغلیہ کے ساتھ متبادل نہ ہو، بلکہ پورے ۱۰۰ نمبر کا مستقل مضمون ہو،

۱۷- طے پایا کہ کانفرنس اپنے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کے لئے نیز تحقیقی کام کی اشاعت کے لئے اپنا ایک رسالہ شائع کرے،

استفسار و جواب

لفظ اللہ کے معنی

اور

اسم اعظم کا تخیل

جناب اختر حسین نظامی ایم اے
لکچرار دربار انٹر کالج ریوا

جناب مولانا
السلام علیکم

آٹھ نو سال کا عرصہ ہوا جب علی گڈھ مین یونین کے کسی جلسہ مین زیارت نصیب ہوئی تھی اس وقت مین نے صوفی سلسلون کے متعلق اعظم گڈھ میں کیا ذخیرہ ہے، اس پر جناب سے ایک سوال کیا تھا غالبًا یاد ہوگا، اس مضمون پر تقریبًا چھ سات مہینے تک مین نے مطالعہ کیا لیکن قسمت یہان لے آئی، اور اس کے بعد وہ کام آگے نہین بڑھ سکا، تاہم سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا اب بھی کوئی کام کی بات مل گئی، تو نوٹ کر لیتا ہون، آج کل ادھر کئی برسون سے ریوان کی تکمیل فاندان پر کام کر رہا ہون،

سیرۃ النبی جلد چہارم مین لفظ اللہ کے معنی آپ نے "پیار" لکھے ہین، حالانکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ اللہ اسم ذات ہے اسم صفات نہین ہے چونکہ یہ لفظ اسلام سے پہلے کا ہے یہ نام ہے ایک اعلیٰ ہستی کا جسکی صفات کا تخیل قدیم عربون مین نہین تھا، اس بات کی وضاحت آپنے بھی کر دی ہے لیکن میرا گمان یہ ہے کہ اللہ کے معنی بیان کرنے کی کوشش بعد کے لغت نویسون کی ہے، مین تو اللہ کو یون سمجھتا ہون

جیسے قدیم آریون کا لفظ "اوم" جو رگ وید مین آیا ہے، اللہ کا مشتق تلاش کرنا، اہل لغت کی اپج معلوم ہوتی ہے،

صوفیون کے ہان ایک مسئلہ اسم اعظم کا ہے جس کا چرچا جُہلا مین زیادہ رہتا ہے، ان کا خیال ہے کہ اسم اعظم اسرار خفی میں سے ہے، جو صرف مرشد کی خاص عنایت سے معلوم ہوسکتا ہے، اسے وہ مشکل کشا مانتے ہین، ہندوؤن مین گرومنتر دینے کا جو رواج ہے، غالبًا اسی کی تقلید ہے، صوفیاے متقدمین کے زمانہ مین بھی لوگون کو اسی قسم کے وہم ہوتے تھے لیکن ان بزرگون نے اس کا جواب صاف یہی دیا کہ جس نام سے خدا کو پکارو وہی اسم اعظم ہے اور تعلیمات قرآنی کے عین مطابق ہے حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی سے پوچھا گیا، تو اونھون نے فرمایا کہ "بہر اسمے کہ خداے تعالیٰ را بخوانی آن اسم اعظم است"، (فوائد الفوائد) بعضون نے فرمایا کہ "اسم اعظم اللہ ہی ہے"، (قول حضرت محبوب سبحانی از قلائد الجواہر) متوسطین مین شاہزادہ داراشکوہ فرماتے ہین، "این اسمے است بس بزرگ و شامل کفر و اسلام جامع جمیع اسماء در ہیچ چیز از این اسم بیرون نیست و معنی این اسم اعظم این است کہ ذات صاحب سہ صفت ایجاد و ابقا و افنا، و ہمہ آفرینش و ذرات موجودات از این سہ صفت خارج نیست اما از این معنی و سر این اسم اعظم کسے واقف نیست مگر بعضے از اکمل مشائخ بر سبیل ندرت" (رسالہ حق نما ص ۱، ۹۰ مطبع تیوی کانپور) چنانچہ یہی نام صوفیہ کے اذکار و اشغال مین استعمال ہوتا ہے،

آنجناب اس مسئلہ پر میرے شکوک رفع کرین، تو ممنون ہونگا"

معارف: مکرم دام لطفہ،

السلام علیکم:۔ خوشی ہوئی کہ آپ اب بھی علمی مشاغل مین مصروف ہین،

لفظ اللہ کے اشتقاق کی بحث اہل لغت کے ہان بھی ہے، اور مفسرین و متکلمین و محدثین کے ہان بھی، امام بیہقی نے اپنی کتاب الاسماء والصفات کے ایک باب مین اس پر بحث کی ہے، او منجملہ اور رایون کے ایک راے یہ بھی نقل کی ہے کہ یہ وُلاہ سے مشتق ہوا جس کے معنی اوس محبت کے ہین، جو مان کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے،

مزید تحقیق کے لئے لسان العرب اور نہایۃ ابن اثیر ملاحظہ فرمائیں،

آپ نے میری سیرت جلد چہارم کا حوالہ دیا ہے، وہاں کی عبارت یہ ہے :۔

"اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اوس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو، دوسروں کی تحقیق ہے کہ اوس کے معنی ہیں، وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت و محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں،

آپ کی عبارت سے دھوکا ہوتا ہے کہ میں نے لفظ اللہ کے یہی ایک معنی لکھے ہیں، حالانکہ میں نے متعدد اقوال نقل کر دیئے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سیرۃ کی اسی جلد کے دوسرے موقع (محبت الٰہی) پر خاکسار نے یہ بھی لکھا ہے :۔

"ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے، اور گو اون کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھکر استعمال کئے گئے تھے، ہر قوم نے اس علم اور نام کے لئے اوسی وصف کو پسند کیا جو اوس کے نزدیک اوس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی،

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے، اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ ولاہ سے نکلا اور ولاہ کے اصل معنی عربی میں اوس غم، محبت اور تعلق خاطر کے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد کو مطلق "عشق و محبت" کے معنی پیدا ہو گئے، اور اسی سے ہماری

زبان میں لفظ وَالِہ (شیدا) مستعمل ہے، اس لئے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگردان متحیر اور پریشان ہیں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں "من موہن" یعنی دلوں کا محبوب کیا کرتے تھے"۔ (صفحہ ۵۲۳)

آپ کا یہ کہنا کہ میں تو لفظ اللہ کو یوں سمجھتا ہوں، جیسے قدیم آریوں کا لفظ اوم جو رگ وید میں آیا ہے، آپ کا مقصد گو یہ ہے کہ جس طرح ہندوؤں کے لفظ اوم کا کوئی مشتق منہ سنسکرت میں نہیں، اسی طرح اللہ کا لفظ بھی کوئی مشتق منہ نہیں رکھتا، اور ایک اسم جامد ہے، جو صرف خدا کے علم کے لئے وضع ہوا ہے تاہم اس تشبیہ سے مجھے گرانی ہوئی، آپ کا نفس خیال تو عام ابتدائی فلسفیانہ و منطقیانہ کتابوں میں مذکور ہے، اور بڑی کتابوں میں بھی ہے امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں :-

المختار عندنا ان هذا اللفظ	ہمارے نزدیک پسندیدہ قول یہ ہے کہ لفظ
اسم علم لله تعالیٰ وانه	اللہ اسم علم ہے، اور یہ مشتق نہیں ہے،
ليس بمشتق البتة وهو قول الخليل وسيبويه	یہی قول خلیل سیبویہ اور اکثر اصولیین اور
وقول الاكثر الاصوليين والفقهاء (تفسیر کبیر اول جلد ۱)	فقہاء کا ہے،

پھر امام رازی نے اس مسلک پر چند دلیلیں قائم کی ہیں، اس کے بعد ان لوگوں کی رائے لکھی ہے جو اس کو مشتق مانتے ہیں، ان کے دلائل ذکر کئے ہیں، پھر اختصار کے ساتھ ان کا رد لکھا ہے،

بہر حال یہ دونوں رائیں ہیں، اور دونوں کے کہنے والے اور ماننے والے ہیں، اور دونوں کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں لیکن آج کل کے محققین علم الاشتقاق نے یہ بات واضح کی ہے، کہ کوئی لفظ اپنی اصل وضع میں کسی مناسب معنی کے بغیر نہیں ہے، گو مرور زمانہ اور لفظ کی ابتدائی شکلوں کے فراموش ہو جانے سے

یا مختلف زبانون مین اوس کے الٹ پھیر ہو جانے کی وجہ سے اس کی اصلیت باقی رہی، اور نہ اوس کی مناسبت کا ہم کو پتہ چلتا ہے، چنانچہ یہی لفظ اللہ ہے، جس کی مختلف شکلیں، مختلف سامی زبانون مین ملتی ہین، جیسے ایل بابل بیت ایل اور اسرائیل وغیرہ مین یا لفظ الوہ مین ملتی ہے، توراۃ کے شروع مین الوہیم آیا ہے تفصیل کے لئے ارض القرآن کی دوسری جلد مین "مذاہب عرب قبل اسلام" دیکھئے، (ص ۲۴۴، ۲۴۵) اس سے معلوم ہوگیا کہ ایل اور الوہ کے الفاظ معبود کے معنی مین اکثر سامی زبانون مین بولے گئے ہین، قدیم عربی زبان مین عرب معبود کا نام ہیروڈوٹس یونانی مورخ کے بیان کے مطابق الیلات تھا کیا عجب کہ زمانہ بعثت کے جاہل عربون کے مشہور دیوتا اللات کی اصل ہو، عربی زبان مین اہل لغت نے لکھا ہے، کہ اہل عرب آفتاب دیوی کو الٰاہتہ، "اُلٰھَۃ" کہتے تھے، اور اس کی مختلف شکلیں نقل کی گئی ہین، الالیھہ الاِلٰھہ، الاَلھہُ، اُلٰھہ سب کے معنی آفتاب کے ہیں، جس کی پرستش بعض اہل عرب مین رائج تھی، جیسا کہ قرآن پاک مین ہے،

لاتسجدوا للشمس والقمر واسجدوا — آفتاب و ماہتاب کے سامنے سجدہ نہ کرو

للّٰہ الذی خلقھن، — اس اللہ کا سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا،

قرآنی تعریفون اور قدیم کتبات سے یہ بات ثابت ہے،

قدیم عربی مین لَاھُمَّ اور اَللّٰھُمَّ کے جو لفظ بولے گئے ہین، اور دوسرا لفظ اب بھی بولا جاتا ہے وہ بھی اسی سامی اشتقاق کی صورت ہے،

قرآن پاک مین معبودان باطل کے لئے "اٰلِھَۃ" کا لفظ بصورت جمع جس کا واحد الٰہ ہے بکثرت بولا گیا ہے جیسے اذاً لذھب کل الٰہ بما خلق، ءالٰہ مع اللہ لو کان فیھما اٰلھۃ، اور جیسا کہ کلمۂ اسلام لا الٰہ الا اللہ مین ہے، اس سے تو اثر ثابت ہوگیا، کہ عربی زبان مین سامی زبانون کی طرح "الٰہ" کا لفظ معبود اور قابل پرستش کے معنون مین ہے، اس سے ان لوگون کے خیال کا ابطال ہو جاتا ہے، جو اللہ کو محض اسم جامد غیر مشتق اور اسم علم کے علاوہ دوسرے معنون کیلئے غیر موضوع سمجھتے ہین، اور یہ تفریق معلوم ہوئی کہ الٰہ مطلق معبود کے معنی مین اور

الف لام لگ کر الالٰہ یا اللہ معبود برحق کے معنی مین قدیم زمانہ سے عربون مین رائج ہے، اور بے معنی اسم جامد اور محض اسم علم نہین ہے،

اسم اعظم کے متعلق ہمارے مفسرین نے اسرائیلیات سے لیکر ایک ہی جگہ تذکرہ کیا ہے' اور وہ ملکۂ سبا کے قصہ مین ہے، جہان حضرت سلیمانؑ کے ملکہ سبا کے تخت منگوانے کا ذکر ہے،

اس موقع پر اَلَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتَابِ (نمل) کسی نے توراۃ مراد لیا ہے، اور کسی نے اسم اعظم، لیکن اس کے متعلق ارض القرآن جلد اول ص ۲۰۰ میں، میں نے لکھا تھا،

" اسم اعظم کا تخیل ایک جاہلانہ اور غیر ثابت الشرع تخیل ہے، اسلام کے رو سے یہ کوئی شئے نہین ہے البتہ یہودیون مین یہ خیال اب تک موجود ہے"

مجھے اب تک اس کے خلاف معلوم نہین اور اب تک احادیث سے یہ ثابت ہے اور قرآن پاک سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے، کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کے تمام نامون کا علم نہین بخشا گیا ہے، چنانچہ ابن حبان، حاکم، ابویعلی، ابن ابی شیبہ، طبرانی کے حوالہ سے ایک دعا منقول ہے، جس مین فرمایا

اسئالک بکل اسم ھولک سمیت	تیرے ہر اس نام کے ذریعہ تجھ سے سوال
بہ نفسک او انزلتہ فی کتابک او	کرتا ہون، جس سے تو نے اپنا نام رکھا ہے'
علمتہ احدًا من خلقک او	یا تو نے اپنی کتاب مین نازل فرمایا ہے، یا اپنی
استأثرت بہ فی علم الغیب عندک	مخلوق مین سے کسی کو بتایا ہے، یا اپنے پاس علم غیب مین پوشیدہ رکھا ہے،

الاسماء والصفات بیہقی مین ایک حدیث ہے، جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، جس کے الفاظ یہ ہین،

قالت یا رسول اللہ علمنی اسم اللہ	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ
الذی اذا دعی بہ اجاب قال لھا	یا رسول اللہ مجھکو اللہ تعالیٰ کا وہ نام بتایئے

صلی اللہ علیہ وسلم قومی فتوضئی وادخلی المسجد
فصلی رکعتین ثم ادعی حتی اسمع نفعلت
فلما جلست للدعا قال النبی صلی اللہ
علیہ وسلم اللھم وفقھا فقالت
اللھم انی اسئلک بجمیع اسمائک الحسنی
کلھا ما علمنا منھا وما لم نعلم و
واسئلک باسمک العظیم الاعظم
الکبیر الاکبر الذی من دعاک بہ
اجبتہ ومن سالک بہ اعطیتہ
قال یقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم
اصبتہ اصبتہ
(صہ)

کہ جب اوس کو لے کر دعا مانگی جائے تو قبول
ضرور ہو، حضورؐ نے فرمایا، اٹھو وضو کرو، مسجد
مین جاؤ، اور دو رکعت نماز پڑھو، پھر دعا مانگو،
یہان تک کہ مین سنون حضرت عائشہؓ نے ایسا
ہی کیا، جب دعا کے لئے اٹھین تو حضورؐ نے
فرمایا، کہ خداوندا ان کو توفیق دے، حضرت
عائشہؓ نے دعا مین فرمایا کہ خداوندا مین تیرے
تمام اچھے نامون کے ذریعہ دعا مانگتی ہون،
جو ہم کو معلوم ہین اور جو نہیں معلوم ہین، اور تیرے
اس بڑے نام کے ذریعہ مانگتی ہون، کہ جو بھی
اس کے ذریعہ مانگے تو اسکی دعا ضرور قبول
فرمائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
کہ تم نے ٹھیک کہا،

اس مین بھی اسم اعظم بطور صفت کے ہے علم کی حیثیت نہین معلوم ہوتی، البتہ یہودیون مین یہ خیال پرانا ہے، چنانچہ ان کے یہان خدا کا اصلی نام "یہواہ" ہے، مگر لکھتے یہواہ ہین، اور پڑھتے سیدنا (ادونای) ہین، اور اون کا خیال ہے، کہ حضرت سلیمانؑ کو یہی اسم اعظم معلوم تھا، جس کے ذریعہ سے وہ جن وبشر پر بادشاہی کرتے تھے، لیکن قرآن پاک اور احادیث مین اس کا کوئی بیان نہین ہے،

والسلام

"س"

بوہرے

جناب محمد علی صاحب
بتوسط ایم عبدالحسین اینڈ برادرس پانی منڈی اجمیر

السلام علیکم :- فرقہائے اسلام سے ایک فرقہ قوم بواہر یا بوہرہ کے نام سے مشہور ہے یہ لوگ زیادہ تر ہندوستان کے مغربی سواحل بمبئی سورت وغیرہ مقامات اور مالوہ گجرات کے صوبوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں اسی قوم کے چند افراد راجپوتانہ میں خاصکر کے اودیپور میواڑ میں بہت ہیں یہاں اجمیر میں قریباً سو گھر ہیں، یہ لوگ مذہبی نقطۂ نگاہ سے اپنے عقیدوں میں راسخ واقع ہوئے ہیں، ایک صاحب میرے مکان کے قریب رہتے ہیں، چنانچہ دلچسپی کا سبب بنے ہوئے ہیں، لہذا میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کی پوری تاریخ سے واقفیت حاصل کروں یہ فرقہ کہاں سے عام اسلامی شاخ سے علحدہ ہوا آیا یہ ہندوستان ہی کی پیداوار ہے یا ان کے مبلغ ایران یا عراق وعرب سے یہاں آئے، یہ اپنے کو شیعہ کی ایک شاخ بتاتے ہیں آج سے غالباً آٹھ دس برس پہلے رسالہ معارف میں میری نظروں سے ایک اشتہار چھپا ہوا گذرا تھا جس میں اس قوم کی پوری تاریخ لکھنے کا اعلان تھا، وہ کتابی صورت میں شائع ہونے والی تھی، غرض مجھے کوئی جامع اور صحیح تاریخی کتاب کی ضرورت ہے جو اردو میں چھپی ہوئی ہو، اگر آپ کے مطبع نے شائع کی ہو تو بذریعہ وی پی پارسل ارسال فرمائیں یا کتاب اور جگہ کا پتہ جہاں مل سکتی ہو، تحریر فرما دیں، یہ میں نوازش ہوگی، فقط

معارف :- محترم زاد لطفکم

السلام علیکم آپ کا گرامی نامہ متعلق استفسار فرقہ بوہرہ موصول ہوا، یاد فرمائی کا شکریہ، اون کی مختصر سرگذشت یہ ہے :-

مصر کے فاطمی خلفا مین سے آگے چل کر ایک خلیفہ الحاکم بامر اللہ ہوا، جس کے دو بیٹے ہوئے نزار اور علی الظاہر لاعزاز دین اللہ، اسی طرح فاطمی اسماعیلی، امامت دو حصون مین منقسم ہو گئی، ایک نزاری اور دوسری ظاہری، ظاہر لاعزاز دین اللہ مصر کا خلیفہ ہوا، اور آخر یہ امامت سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھون ختم ہوئی، اس سلسلہ کے لوگ آج ہندوستان مین بوہرے کہلاتے ہین، اور نزاری کی بنا حسن بن صباح نے کوہستان ایران مین ڈالی اور قلعہ الموت مین باطنی حکومت کی بنیاد استوار کی، جس کا خاتمہ ہلاکو خان تاتار کے ہاتھون سے ہوا، اس سلسلہ کے امام ہز ہائنس سر آغا خان ہین، اور اول الذکر سلسلہ کے موجودہ امام ملا طاہر سیف الدین ہین،

"بوہرہ" گجراتی زبان کے لفظ "وہورو" سے نکلا ہے، جس کے معنی تاجر کے ہین، اور بعض محقق اسکو عربی الاصل کہتے ہین، مغربی ہند مین یہ جماعت صرف مسلمانون پر مشتمل نہین، بلکہ ان مین ہندو بوہرے بھی ہین، چونکہ اس جماعت کے بہت سے لوگ اسی فرقہ اسماعیلی میں داخل ہو کر مسلمان ہوئے، اس لئے اس مسلم جماعت کا نام بھی بوہرہ عرف عام میں پڑ گیا، چنانچہ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری مین ۶۶۵۲ ہندو، اور ۲۵ جینیون نے اپنے کو بوہرہ جماعت مین سے قرار دیا ہے، اور اسی سال کی مردم شماری کے رو سے مسلمان بوہرون کی تعداد ۱۲۵۵۰۰ تھی، جن مین سے ۱۱۸۳۰۰ بمبئی پریسیڈنسی مین رہتے ہین، ان مین سے کچھ بوہرے اپنا تعلق عرب و مصر کے مہاجر خاندانون سے بتاتے ہین، ورنہ ان مین کی بڑی جماعت ان ہندو بوہرون پر مشتمل ہے، جو اسماعیلیون کے ہاتھون پر اسلام میں داخل کئے گئے ہین،

ہندوستان سے ان اسماعیلی بوہرون کا تعلق سنہ ۴۶۰ھ، ۱۰۶۷ء سے پیدا ہوا، جب کہ ان مین کا ایک شخص عبد اللہ نامی یمن سے کھنبایت مین آیا، لیکن یہان ان کے مبلغ اول کی حیثیت سے محمد علی کا نام لیا جاتا ہے، جس کا زمانہ سنہ ۵۳۲ھ، ۱۱۳۷ء کے قریب ہے، اور اس کا مقبرہ کھنبائت میں موجود ہے، سنہ ۱۲۵۰ء سے گجرات دلی کے ماتحت آگیا، اور سنہ ۱۲۹۷ء سے سنہ ۱۵۰۲ء تک یہان خود مختار اسلامی سلطنت رہی، اسی اثنا، مین سنہ ۹۴۶ھ یعنی سنہ ۱۵۳۹ء تک ان

بوہرون کا مرکزی تعلق یمن سے وابستہ رہا، یہان تک کہ اسی سال سنہ ۹۴۶ھ میں یوسف بن سلیمان ہندوستان آیا، اور اوس نے سیدھ پور مین جوان دنون ریاست بڑودہ مین ایک شہر ہے، اقامت اختیار کی، پچاس سال کے بعد سنہ ۱۵۹۱ء مین داؤد بن عجب شاہ کی وفات پر بوہرون میں دو فرقے ہوگئے، ایک جماعت نے اوس کے جانشین داود بن قطب شاہ کو منتخب کیا، اور دوسرے نے سلیمان کو جانشین بنایا، سلیمان اس دستاویز کے ساتھ گجرات آیا، جو اُسے داؤد بن عجب شاہ سے ملی تھی، مگر یہان بہت تھوڑے سے لوگ اوس کی امامت قبول کر سکے، اوس نے احمد آباد مین اقامت اختیار کی، اس طرح بوہرون کے دو فرقے قرار پائے، ایک داؤدیہ دوسرا سلیمانیہ، مگر موخر الذکر فرقہ کی بہت تھوڑی تعداد رہ سکی، فرقہ داؤدی کے لوگ تقریبًا ۱۳۰۰۰۰ ہین، اون کا امام جو "ملا" یا "داعی" کہا جاتا ہے سورت مین اقامت گزین ہے،

فرقہ داؤدیہ کے امام کا فیصلہ، مذہبی و معاشرتی جملہ مسائل مین اوس کے پیرؤون کے لئے حکم ناطق ہوتا ہے وہ اُن کو سزائین بھی دیتا ہے، اور ہر پیرو کے لئے اپنی آمدنی کا پانچوان حصہ امام کی نذر کرنا ضروری ہے، نیز دیگر متعین مواقع شادی اور ولادت وغیرہ پر مختلف نذرین پیش کی جاتی ہین، فرقہ داؤدیہ کی تنظیم پورے طور پر مکمل ہے، نائب ملا یا نائب دعاۃ مختلف علاقون مین مامور ہین، جو تحصیل وصول و اصلاح و تنظیم مین شریک رہتے ہین، ۔

سنہ ۱۶۲۴ء اور سنہ ۱۷۸۹ء مین داؤدیون کے اندر بھی چند جماعتین پیدا ہوئین، اور وہ اپنی تاریخ پیدایش کی مختلف تفصیلات سے متعلق اپنے ان عقائد و یقینیات کے ساتھ اب بھی موجود ہین،

نیز بوہرون کی ایک جماعت "جعفری بوہرہ" بھی کہی جاتی ہے، یہ وہ بوہرے ہین، جو مظفر شاہ کے عہد حکومت (سنہ ۱۴۰۷ء - سنہ ۱۴۱۱ء) مین سُنی ہوگئے تھے، یہ لوگ پندرہوین صدی عیسوی کے ایک شیخ طریقت سید احمد جعفر شیرازی کی طرف منسوب ہین، جنھون نے غالبًا انھین شیعیت سے نکال کر مذہب اہل سُنت مین داخل کیا تھا،

داؤدی بوہروں کی مذہبی کتابیں مستور رکھی گئی ہیں، صرف عبادات کی بعض کتابیں مثلاً صحیفۃ الصلوٰۃ چھپ سکی ہے،

دائم الاسلام اور اتحاف ان کی مذہبی کتابیں ہیں جن میں بوہرہ دعاۃ کے اقوال سے "اسلام کو سمجھایا گیا" بوہروں کے موجودہ امام ملا طاہر سیف الدین کی ایک تصنیف "ضوء نور الحق المبین" کے نام سے ۱۳۳۵ھ میں عربی زبان میں چھپ کر شائع ہوئی تھی، اس کتاب پر ہندوستان کے اسلامی پریس میں شدید ہنگامہ اٹھا، اور ان تحریروں کو جناب حاجی عمر حاجی احمد تاجر سورت نے جمع کرا کر ایک مستقل کتاب "سیف بردین" کے نام سے شائع کیا تھا،

سلسلۂ گفتگو کے تتمہ کے طور پر آغا خانی جماعت کے متعلق بھی عرض کر دیا جائے کہ ہندوستان سے اس جماعت کی امامت کا تعلق امام حسن علی شاہ معروف بہ آغا خان اوّل کے ورود ہند سے ہوتا ہے، جو ۱۲۵۰ھ میں فتح علی شاہ ایران کے انتقال کے بعد ہندوستان آئے، اور انگریزی حکومت نے بعض خدمات کے صلہ میں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بمبئی اس کا صدر مقام قرار پایا، موجودہ امام سر آغا خان سوم ہیں، اور اپنے سلسلۂ امامت کے لحاظ سے ۴۸ ویں امام ہیں،

بوہروں کے متعلق ہمارے علم میں اردو میں کوئی مستقل کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی، خوجہ یعنی آغا خانی جماعت کے حالات ہفتہ وار صحیفہ اسماعیلی بمبئی کے گولڈن جوبلی نمبر میں مختصراً دیکھنے میں آئے تھے، خوجہ اور بوہرہ دونوں جماعتوں پر انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں آپ کو کسی قدر حالات مل جائیں گے، تفصیل کے لئے اس کی طرف رجوع کریں،

مولانا سید ابو ظفر ندوی نے بوہروں پر ایک مستقل کتاب اردو میں لکھی ہے، جو ابھی تک شائع نہ ہو سکی ہے، اس کے ایک باب کا ترجمہ اسلامک کلچر حیدرآباد میں ۱۳۵۹ھ میں چھپا تھا، مولانا موصوف سے انگلو ورنا کیولر سوسائٹی گجرات احمدآباد کے پتہ سے مزید معلومات آپ حاصل کر سکتے ہیں، والسلام "ر"

ادبیات

پیامِ اقبال

از

جناب نکہت شاہجہانپوری

خرمنِ عقل و ہوش میں آگ سی اک لگائے جا
کشمکشِ حیات پہ برقِ عمل گرائے جا

سوزِ درون بڑھائے جا قلب و جگر جلائے جا
شمعِ حیاتِ گل نہ کر عشق کی لو لگائے جا

تیرے جہانِ سوز میں طور کی بجلیاں بھی ہیں
ذوقِ تجلیات سے روح کو جگمگائے جا

ساغرِ گل کی مستیاں وجہِ نشاط بن چکیں
بادۂ تلخکام سے تشنہ لبی بجھائے جا

مقصدِ زندگی مگر کشمکشِ حیات ہے
لالہ و گل کے رنگ سے خونِ جگر پلائے جا

قید تعینات میں لیلیٰ آرزو کہاں
دشتِ جنون نواز میں گامِ طلب اٹھائے جا

تابِ نظارہ گر نہ ہو حسرتِ دید ہی سہی
شوقِ تجلیات میں حسنِ نظر بڑھائے جا

تیرے سجود پر مگر عرش بریں کو ناز ہو
غیر خدا کے سامنے سر کو نہ یوں جھکائے جا

اٹھی ہیں سمتِ غرب سے کفر و بلا کی آندھیاں
عشق کا شعلہ زار بن شمعِ خرد بجھائے جا

قید حیات[1] و بند غم، شعبدۂ خیال ہے
تو غمِ زندگی نہ بن موت پہ مسکرائے جا

صاحبِ بالِ جبرئیل اف یہ تری نوازشیں
نکہتِ پُر خمار کو جامِ خودی پلائے جا

---

[1] تلمیح بطرف شعر غالب: قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں الخ

سرشارِ خراب

از جناب روشؔ صدیقی

خوب ہے ذوقِ نظر حسن حجاب اچھا ہے
دل ہو بیدار تو ہر خوابِ شباب اچھا ہے

نہ یقین ہو تو اُسی نرگسِ مخمور سے پوچھ
عشق جتنا بھی ہو سرشارِ خراب اچھا ہے

کچھ بھی ہو حیرتِ نظارہ کہ تمکینِ جمال
حسن ہر رنگ مین مانوسِ حجاب اچھا ہے

سازِ ناہید فلک ہو کہ دلِ بشکستہ
درد مضراب ہو جس کی وہ رباب اچھا ہے

ماورا عالمِ اسباب سے ہے عالمِ عشق
سب سوالون کا یہی ایک جواب اچھا ہے

اک نگاہ غلط انداز ہے جس کا عنوان
لاکھ بیداری عالم سے وہ خواب اچھا ہے

زندگی حرفِ غلط ہے رخِ محبوب بے روشؔ
ورنہ یون مشغلۂ علم و کتاب اچھا ہے

غزل

از جناب شفیقؔ صدیقی جونپوری

چمن سے قفس تک دھوان دیکھتا ہون
نشیمن کی چنگاریان دیکھتا ہون

یہ محدود سی شے اور اتنی رسائی
مقامِ دلِ ناتوان دیکھتا ہون

تری عظمتِ کبریائی کے آگے
خودی کو بھی سجدہ کنان دیکھتا ہون

جہان طائرِ سدرہ اڑ کر نہ پہنچے
قلندر کی منزل وہان دیکھتا ہون

زہے اوجِ آدم کہ نقشِ قدم پر
فرشتون کی پیشانیان دیکھتا ہون

محبت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا
یہ شے حاصلِ دو جہان دیکھتا ہون

جہان حسن کی بے نیازی بھی گم ہو
وہان عشق کو حکمران دیکھتا ہون

شفیقؔ سخنور جو ننگِ وطن تھا
اُسے فخرِ ہندوستان دیکھتا ہون

مطبوعات جدیدہ

تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول، مرتبہ جناب ڈاکٹر محی الدین صاحب زور قادری معتمد اعزازی

ادارۂ ادبیات اردو تقطیع بڑی ضخامت ۳۹۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد:- صر

پتہ:- سب رس کتاب گھر، خیرت آباد حیدر آباد دکن،

ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد اردو زبان کی جو مختلف النوع مفید خدمات انجام دے رہا ہے، وہ باخبر اصحاب سے مخفی نہیں، اس سلسلہ میں اوس نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا ہے، جس کے مخطوطات کی تعداد کئی ہزار تک پہونچ گئی ہے، ان میں بہت سے نادر اور تاریخی مخطوطے بھی ہیں، ادارہ کے لائق کارکنوں نے اب اس کتب خانے میں مخطوطات کی فہرست کی ترتیب کا کام شروع کیا ہے، چنانچہ اس کے فاضل معتمد ڈاکٹر محی الدین صاحب زور نے اردو مخطوطات کی پہلی جلد مرتب کی ہے، اس میں مذہبیات، قرآن وحدیث، فقہ وتصوف، مواعظ و نصائح، ادعیہ ومناجات، سیر ومناقب نبوی، اہل بیت وصحابۂ کرام اور دوسرے بزرگان دین کے سوانح و فضائل اور سلاطین وامراء کے حالات، منظومات، قصص وحکایات، لغت، عروض وانشا، طب اور بعض عقلی علوم کے ۲۷۵ مخطوطات کی مفصل فہرست ہے، جن مصنفین کے حالات معلوم ہو سکے ہیں، ان کے مختصر حالات مخطوطہ کی کیفیت تصنیف وکتابت کے سنین کتاب کے شروع وآخر کی عبارت یا اشعار ہر کتاب کے متعلق ضروری معلومات دیدیئے ہیں لیکن مخطوطات خصوصاً غیر معروف مصنفین اور ان کی تصانیف کی فہرست کی ترتیب کا کام اتنا دشوار ہے، کہ اس سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے، تاہم لائق مرتب نے ہر کتاب کے متعلق حتی الامکان ضروری اور صحیح معلومات جمع کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی یہ کوشش اس حیثیت سے

زیادہ قابلِ قدر ہے کہ اس فہرست کے ذریعہ اردو کے بہت سے نادر مخطوطات کا علم شائقین کو ہو جائے گا، کتاب کے آخر میں اسماء اور اشخاص کے اعلام کا اشاریہ بھی دیدیا ہے، جس سے تصانیف اور مصنفین کی تلاش میں سہولت پیدا ہو گئی ہے، امید ہے کہ دوسری جلد بھی جلد شائع ہو گی،

دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعرا | از جناب عبدالشکور صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت سے ربیۃ :- کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

اردو زبان کی تعمیر و ترقی میں ہندو و مسلمان دونوں کا مساوی حصہ ہے، اور کوئی دور ایسا نہیں گذرا ہے جس میں مسلمانوں کے ساتھ اردو زبان اور شعر و ادب کے ہندو اہلِ کمال موجود نہ رہے ہوں، اور بعض جماعتوں کی جانب سے اردو کی مخالفت کے باوجود آج بھی اردو زبان کے ہر شعبہ میں ایسے ہندو اہلِ کمال موجود ہیں جن کا درجہ کسی طرح مسلمانوں سے کم نہیں ہے اردو شعرا کے تذکرہ نگاروں کی یہ بڑی فروگذاشت ہے، کہ انھوں نے مسلمان اہلِ کمال کے مقابلہ میں ہندو اصحابِ کمال کا تذکرہ کم لکھا ہے، اس لئے اس کی بڑی ضرورت تھی کہ اردو شعر و ادب کی کتابوں میں ان کے خدمات کا پورا اعتراف کیا جائے، اور اس کے مطابق ان کو جگہ دیجائے لائق مؤلف نے مذکورۂ بالا کتاب لکھ کر ایک حد تک یہ فرض انجام دیا ہے، اس میں رتن ناتھ سرشار اور جگن ناتھ برق کے زمانہ سے لیکر موجودہ دور تک متوفی اور بابُیں موجود ممتاز ہندو شعرا کے مختصر حالات لکھے ہیں ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے، اور اس کا نمونہ دیا ہے لیکن اس کتاب میں صرف ممتاز و مشاہیر شعرا کے حالات ہیں، اگر اس کو اور وسعت دیجائے تو یہ تعداد اور زیادہ بڑھ سکتی ہے، لائق مؤلف کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے، انھوں نے یہ کتاب لکھ کر ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا، اور اہلِ قلم کو ایک ضروری موضوع کی طرف متوجہ کر دیا، ممکن ہے آیندہ کوئی صاحبِ قلم اس موضوع پر اس سے زیادہ وسعت و جامعیت کے ساتھ لکھنے کی کوشش کریں،

مشاہیر یونان و روما جلد اول مترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی تقطیع بڑی،

ضخامت ۴۴۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد :- ہے

پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند، دہلی،

حکیم پلوٹارک یونانی کی مشہور کتاب Parallel Lives دنیا کی اہم کتابون مین سے ہے، اس مین یونان و روما کے ایسے مختلف اصناف کمال کے چھیالیس اکابر اور نامور اشخاص کے حالات ہیں، جو اپنے اخلاق و سیرت کی بلندی قوم و ملک کے لئے ایثار و جانبازی اور اپنے زندہ جاوید کارنامون کے لحاظ سے ساری دنیا کے لئے نمونہ عمل تھے، اور جن کی مثال نے یورپ کے بڑے بڑے مصلحین کو متاثر کیا، اور انھون نے جدید یورپ کی تجدید و اصلاح کے سلسلہ مین کارہا ے نمایان انجام دیئے، یہ اہم کتاب اردو مین ترجمہ کے لائق تھی، انجمن ترقی اردو نے آج سے تقریبًا پچیس سال پیشتر مشاہیر یونان و روما کے نام سے اس کی پہلی جلد کا ترجمہ شائع کیا تھا، اب اس نے پوری کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے، اس سلسلہ مین پہلی جلد کے ترجمہ پر نظر ثانی اور ترمیم کرکے اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، اس جلد مین آٹھ مشاہیر کے حالات ہین، کتاب کے شروع مین فاضل مترجم کے قلم سے قدیم یونان و روما کی مختصر تاریخ ہے جس سے کتاب کے اشخاص کے حالات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ترجمہ کی خوبی کے لئے لائق مترجم کا نام کافی ہے، اس کتاب کی مکمل اشاعت کے بعد اردو میں ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوگا،

تعلیم کا مسئلہ، از جناب ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ،

تقطیع چھوٹی، ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت :- عہ، پتہ سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدرآباد دکن،

حکومت نے اپنے مصالح کے اعتبار سے ہندوستان کا نظام تعلیم ایک خاص نہج کا بنایا تھا، جو نہ صرف قومی اور ملکی بلکہ خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی اتنا ناقص اور تعلیم کے اصلی مقاصد سے اتنا دور ہے، کہ وہ ملک کے لئے مفید اور کارآمد تعلیم یافتہ اشخاص پیدا نہیں کرسکتا اور یہ مسئلہ اتنا مسلم ہوچکا ہے کہ ہندوستان کے قومی ماہرین

تعلیم کے لئے بھی لائق غور بنا ہوا ہے، جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اس کتاب مین صحیح تعلیمی اور قومی نقطۂ نظر سے مسئلہ تعلیم پر بحث کرکے مسلمانون کے نظامِ تعلیم کا خاکہ پیش کیا ہے، اور تعلیم و تربیت کی اصلی غرض و غایت ظاہر کرکے موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دکھائے ہین، اور قومی و ملکی ضروریات کے مطابق ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تینون تعلیمی مدارج کا نظام اور نصاب پیش کیا ہے، اور جامعات کے شعبۂ فنون کی موجودہ تقسیم کے متعلق بعض تجویزین پیش کی ہین، اس خاکہ مین مسلمانون کی تعلیم کا کوئی اہم اور ضروری پہلو چھوٹنے نہین پایا ہے، اور ملکی و ملی اور مذہبی ہر نقطۂ نظر سے تعلیم کے تمام اجزاء و عناصر اور تعلیم سے متعلق دوسرے ضروری مسائل پر بڑی سنجیدگی اور اعتدال و توازن کے ساتھ بحث کی گئی ہے، اور نصاب مین ان سب کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، یہ کتاب مسلمانون کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب، اساتذہ، آزادی پسند نوجوان طلبہ اور ان کے غلط بین والدین سب کے مطالعہ کے لائق ہے، اگرچہ یہ کتاب مسلمانون کی تعلیم پر لکھی گئی ہے لیکن بیشتر تعلیمی مسائل ہندو مسلمان دونون کے مشترکہ ہین، اس لئے یہ کتاب دونون قومون کے لئے مفید ہے گو یہ ایک مختصر رسالہ ہے لیکن اپنے مغز کے اعتبار سے طویل کتابون سے بھی بہتر ہے،

روح القرآن، مولفہ جناب فیروز الدین خان تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۱۲؍ پتہ ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور،

اس کتاب کا مقصد مسلمانون مین اسلامی امارت اور حکومت الٰہیہ کے قیام کی تبلیغ ہے، تمہید مین مصنف نے توحید، یوم آخرت، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مقصد، کلام مجید کی اہمیت و ضرورت، اس کے آخرالکتب ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے مسائل پر مختصر روشنی ڈالی ہے، اس کے بعد عقائد، عبادات، اخلاق و معاملات اور انسانی معاشرت کے دوسرے مسائل اور حکومت کے بارہ مین کلام مجید کے احکام و تعلیمات اور اس کے اوامر و نواہی کی آیات کا ترجمہ پیش کیا ہے، اور سیرت نبوی و سیرت خلفائے راشدین اور ان دونون زمانون کے واقعات سے اسلامی تعلیمات کے اثرات و نتائج دکھائے ہین اور اسلامی حکومت

کا نصب العین بتا کر قرآن پاک سے مسلمانوں کی غفلت دکھائی ہے، اور مسلمانوں کی تنظیم اسلامی امارت کی مذہبی اہمیت واضح کرکے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعتِ اسلامیہ مین شامل ہونے کی ترغیب دی ہے، ان مباحث کے ضمن مین اور بھی بہت سے مفید مذہبی معلومات آگئے ہین، اس کتاب میں کلام مجید کی بہت سی تعلیمات یکجا کر دی گئی ہین، اس لئے عام مسلمانون کے لئے مفید ہے، لیکن غالباً مصنف نے کتاب کی ترتیب مین اصل عربی ماخذون کے بجائے زیادہ تر اردو تصانیف سے مدد لی ہے، اس لئے اون کی نگاہ سے بہت سے تاریخی گوشے مخفی رہ گئے ہیں جس کا اندازہ کتاب کے بعض مندرجات سے ہوتا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہین "ابوذر ایک متمول صحابی تھے، (ص ۸۰) "جو صحیح نہین ہے، حضرت ابوذر غفاریؓ تو سرمایہ داری کے سخت خلاف تھے، وہ کل کے لئے کچھ اٹھا رکھنا گناہ سمجھتے تھے، اور عمر بھر اس کی تبلیغ کرتے رہے، اس سلسلہ میں مؤلف نے غلامون کی تحقیر اور ان کو مارنے کا جو واقعہ ان کی جانب منسوب کیا ہو وہ بھی ان کی مساوات پسندی سے بعید ہے، معلوم نہین کہان سے نقل کیا ہے، حضرت ابوذر غفاریؓ تو غلامون کے ساتھ کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہ رکھتے تھے، جو خود کھاتے اور پہنتے تھے، وہی غلامون کو کھلاتے اور پہناتے تھے، یا ایک مقام پر لکھتے ہین سنہ ۹۹ھ میں ایک شخص عمر بن عبد العزیز کو مسلمانون نے خلیفہ منتخب کیا "اس انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کی جلالتِ شان سے ناواقف ہین، اس قسم کی بعض اور فروگذاشتین بھی ہین لیکن ان سے قطع نظر کتاب عام مسلمانون کیلئے مفید ہو اس کا بڑا حصہ دار المصنفین کی سیرۃ النبی اور سیر الصحابہ سے ماخوذ ہے،

الف لیلۃ ولیلۃ حصہ سوم، مترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد صاحب مرحوم سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ؏ غیر مجلد للعہ رپتہ:- انجمن ترقی اردو ہند دہلی،

الف لیلہ عربی کی اتنی مشہور و مقبول کتاب ہے کہ اس کا ترجمہ تقریباً دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانون مین

ہوچکا ہے، اردو میں بھی عرصہ ہوا، اس کا ترجمہ ہوا تھا، لیکن غالباً مکمل نہیں ہے، دوسرے پرانا ہونے کی وجہ سے جدید مذاق کے مطابق نہیں ہے، اس لئے مترجم مرحوم نے دوبارہ اس کا ترجمہ کیا تھا، اس کے دو حصے اس سے پہلے شائع ہوچکے ہیں، یہ تیسرا حصہ ہے، اس میں دوسو بیسویں رات سے چارسو اکسٹھویں رات تک کی حکایات ہیں، ترجمہ کی صحت کا پورا اندازہ تو اصل سے مطابق کے بعد ہی ہوسکتا ہے لیکن مترجم مرحوم عربی کے فاضل تھے، اس لئے امید یہی ہے کہ ترجمہ صحیح ہوگا، ترجمہ کی عبارت سے مترجم کی احتیاط پوری طرح ظاہر ہے، امید ہے کہ یہ ترجمہ مقبول ہوگا،

تذکرہ دارالعلوم از جناب نصیرالدین صاحب ہاشمی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت عہ پتہ حبیب کمپنی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن،

ہندوستان کی سب سے قدیم درسگاہ حیدرآباد کا مدرسہ دارالعلوم تھا، جس نے اب جامعہ عثمانیہ کی شکل اختیار کرلی ہے، یہ دارالعلوم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں قائم ہوا، سنہ ہجری کے حساب سے اس کے قیام کو نوے سال ہوچکے، اس لئے گذشتہ سال اس کی ۹۰ سالہ جوبلی منائی گئی تھی، اس طویل مدت میں دارالعلوم پر مدوجزر، اور ترقی وتنزل کے مختلف دور گذرے، مصنف نے جوبلی کی یادگار میں اس کی ۹۰ سالہ سرگذشت قلمبند کی ہے، حیدرآباد میں یہ دارالعلوم تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تھا، اس لئے اس سرگذشت میں حیدرآباد کی پوری تعلیمی تاریخ آگئی ہے، آخر میں دارالعلوم کے تعلیم یافتہ اشخاص کی علمی ومذہبی خدمات کا ذکر اور ممتاز و نامور اشخاص کے نام دیدیئے ہیں،

چاند سورج کی چوری از جناب حکیم چمن دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے قیمت عہ پتہ: نیا کتاب گھر، دوبازار دہلی

یہ ایک جاسوسی افسانہ ہے جس میں ہیروں کی چوری اور اس کا انکشاف دکھایا گیا ہے، اس قسم کے افسانے عموماً دوسری زبانوں سے ماخوذ ہوتے ہیں، اس کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ مصنف کا طبعزاد ہے، اس کی تصدیق تو افسانہ کے پلاٹ سے بھی ہوتی ہے، اس میں پیچیدہ اور حیرت انگیز واقعات کے بجائے سیدھا سادہ طریقہ سے واقعات کو بیان کر دیا گیا ہے، تاہم افسانہ دلچسپی سے خالی نہیں، "م"

جلد ۵۳ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۴ء عدد ۶

مضامین

شذرات

موجودہ جنگ کے مصائب سے دنیا تنگ آچکی ہے اور بڑے بڑے عقلاء و مفکرین آیندہ لڑائیوں کے انسداد اور مخلوق کو اس کی تباہیوں سے بچانے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں، گو اس سلسلہ میں ابھی کوئی صریح اور متعین تجویز سامنے نہیں آئی ہے لیکن یقین ہے کہ اسی قسم کی کوئی مادی و سیاسی تدبیر ہوگی جیسی تدبیریں اس سے پہلے اختیار کی جا چکی ہیں اور جن کی ناکامی کا تجربہ ہو چکا ہے، ممکن ہے ان تدبیروں سے لڑائیوں کا درمیانی وقفہ کچھ زیادہ طویل ہو جائے لیکن ان سے ان کا انسداد ہونا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ یہ لڑائیاں نتیجہ ہیں مغربی تمدن کی بنیادی خرابی کا، جب تک اس کی اصلاح نہ ہوگی دنیا کو امن و سکون حاصل نہیں ہو سکتا، جو تمدن و نظام حیات خدائے واحد کے یقین اور مذہب و روحانیت کے تصور سے خالی ہو اور جس کی بنیاد تمامتر مادیت پر ہو اس کا لازمی نتیجہ خود غرضی اور فساد فی الارض ہے، صرف زبان سے خدا کا نام لے لینا اور کسی مذہب کی جانب انتساب کافی نہیں ہے، جب تک اعمال میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو، انسانی فطرت خود غرض اور نفس پرست واقع ہوئی ہے، اس کو روکنے والی چند چیزیں ہیں کسی اعلیٰ و برتر اور دانا و بینا ذات اور غالب و عادل قوت کا یقین، اعمال کے دنیوی یا اُخروی محاسبہ و مواخذہ کا خوف، ذاتی اخلاقی احساس یعنی شرافت انسانی کا جذبہ، ان کے علاوہ دنیا کی کوئی اور طاقت انسانوں کو عالمگیر نظام اخلاق اور شرافت انسانی کے ضابطوں کا پابند نہیں بنا سکتی، فطری صالح اشخاص کے وجود اور ان کے انفرادی اخلاقی احساس سے انکار نہیں، ایسے اشخاص ہر قوم میں پائے جاتے ہیں، لیکن من حیث القوم

مغربی قومیں اس احساس سے بالکل بے گانہ ہیں اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنی قوم کے ساتھ جن کی ضابطہ کی پابندی ضرب المثل ہے وہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں سب سے بڑی قانون شکن بنجاتی ہیں،

درحقیقت زندگی کے بارہ میں موجودہ تمدن کے خالص مادی تصور کے ساتھ عالمگیر اخلاقی احساس کا اجتماع ہو ہی نہیں سکتا، اس تصور نے مذہب و روحانیت سے قطع نظر خالص اخلاقی قدروں کو بھی ختم اور محدود قومیت و وطنیت نے عالمگیر انسانی اخوت و ہمدردی کا جذبہ بالکل سرد کردیا ہے، اور اپنی سیاسی سربلندی، اقتصادی برتری، ذاتی منفعت، تعیش کے زیادہ سے زیادہ وسائل کی فراہمی اور ان سے لذت اندوزی ہر قوم کا نصب العین بن گیا ہے، ان مقاصد کا لازمی نتیجہ خود غرضی، رشک و رقابت، اور جنگ و خونریزی ہے، اس لئے کہ ذاتی تفوق و برتری اور غیر محدود تعیش میں اخلاقی احساس، عالمگیر انسانی اخوت اور دوسروں کے حقوق کی گنجایش کہاں، چنانچہ اس تمدن کے پُر فخر کارنامے علم و سائنس کی حیرت انگیز ترقی، مشینی صنعت و حرفت و تجارت کا غیر معمولی فروغ، مصنوعات کا تنوع اور ان کی کثرت اور تعیش کے سامانوں کی فراوانی ہی جنگ و خونریزی کا سبب بن گئے ہیں، جو قوم ان اسباب و وسائل کے لحاظ سے ترقی کے جتنے ہی بلند درجہ پر ہوگی، اتنے ہی وہ اپنی برتری کے قیام اور طلب منفعت کے لئے دوسری قوموں کے حقوق کی پامالی پر مجبور ہوگی جس کا لازمی نتیجہ جنگ و خونریزی ہے، اس لئے جب تک اس بنیادی خرابی کی اصلاح نہ ہوگی، اسوقت تک دنیا کو جنگ و بدامنی سے نجات نہیں مل سکتی،

بہت سی قدیم قومیں جو اپنے دور کی تمدنی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر تھیں، اس مادی تصور حیات اور عیش پرستی کی بدولت تباہ ہو چکی ہیں کیا عجب ہے کہ آج بھی تاریخ اسی عبرت آموز سبق کو دہرا رہی ہو، اس لئے اگر یورپ کو

اپنی بقا منظور ہے تو اس کو اپنا تصور حیات بدلنا پڑے گا اور خدا کے برحق قانون کے سامنے سر خم کرنا پڑے گا، ورنہ گذشتہ قوموں کی طرح اس کی تاریخ بھی فسانۂ عبرت بنجائیگی، یہ محض خوش اعتقادی ہے کہ ایسا عالمگیر اور عظیم الشان تمدن تباہ نہیں ہوسکتا، روما کے دورِ عروج میں کون اس کے زوال کا یقین کرسکتا تھا، قوموں کی بقا و فنا ان کے اعمال پر موقوف ہے اور اس کا فیصلہ مستقبل کرتا ہے، تباہی کے معنی محض بے نام و نشان ہی ہوجانے کے نہیں ہیں، انسانی فلاح و سعادت کے بارہ میں کسی تمدن کی ناکامی بھی درحقیقت اس کی تباہی ہے، اس تمدن کی ناکامی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ جو دنیا کو جنت ارضی بنا دینے کا مدعی تھا وہ آج اس کو جہنم بنا رہا ہے، خود یورپ کے مذہبی اور روحانی حلقوں سے اس مادہ پرستی کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی ہیں لیکن سیاست کے نقار خانے میں چرچ کے طوطیوں کی آواز کون سنتا ہے۔

—— ·ـ·‹(·)›·ـ· ——

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے اپنی چھوٹی عمر میں اردو زبان کی جو گوناگوں اور متنوع خدمات انجام دی ہیں اسکی مثال دوسرے اداروں میں مشکل سے ملیگی، اب اس کے نوجوان اور بلند ہمت کارکنوں نے سارے ہندوستان میں اردو کی خدمت کیلئے ایک وسیع نظام کی ترتیب و قیام کی جانب قدم بڑھایا ہے، اور اس سلسلہ میں ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴ جولائی ۱۹۴۳ء کو حیدرآباد میں ایک آل انڈیا اردو کانگریس منعقد کی ہے اور اردو کے تمام بہی خواہوں، خدمتگذاروں اور ہندوستان کے ممتاز اہل علم اور اصحاب قلم کو اس میں شرکت کی دعوت دی ہے، ادارۂ ادبیات اردو یک علمی اور کارکن ادارہ ہے اسلئے یقین ہے کہ یہ کانگریس علمی نتائج کے اعتبار سے بھی نتیجہ خیز ہوگی، اردو کے بہی خواہوں کو اپنی شرکت اور مفید مشوروں سے اس کو کامیاب بنانا چاہئے، شمالی ہند میں اس مقصد کے لئے انجمن ترقی اردو موجود ہے اور اس کے کہن سال لیکن جوان ہمت بزرگ جس ہمت و استقلال کے ساتھ اس کام میں منہمک ہیں وہ نوجوانوں کے لئے باعث رشک ہے، اس قطب شمالی کے ساتھ قطب جنوبی کی حرکت بھی مفید ہوگی اور امید ہے کہ ان دونوں کے اتحاد و اشتراکِ عمل سے کرۂ اردو کی رفتار میں اور تیزی پیدا ہوگی،

—— ·ـ·‹⁘›·ـ· ——

مقالات

سلسلۂ شاہ ولی اللہ کی خدمت حدیث

از مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی

(۲)

قطب الارشاد مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ (ف ۱۳۲۳ھ)

امام وقت ابو حنیفۂ عصر امیر المومنین فی الحدیث تھے، شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی سے حدیث پڑھی، اور درس حدیث نبوی کے لئے اپنی زندگی کو وقف کردیا، ہزاروں علماء نے آپ سے سند حدیث حاصل کی، جبتک بینائی قائم رہی، ہر سال دورۂ حدیث پورا کرتے تھے، جملہ صحاح ستہ پر آپ کی تقریریں ضبط کی گئی ہیں جن میں سے الکوکب الدری ترمذی پر دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے جو آپ کے اجل تلامذہ مولانا شیخ محمد یحییٰؒ کاندھلوی کی ضبط کردہ اور ان کے صاحبزادہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا استاذ حدیث مظاہر علوم سہارنپور کے تحشیہ کے ساتھ مزین ہے، ایک اور تقریر اردو میں النفع الشذی کے نام سے شائع ہوئی ہے، آپ کی تقریریں تمام صحاح پر عربی، فارسی، اردو میں مولانا امان اللہ خان صاحب، اور مولانا سعد الدین خان صاحب کے پاس محفوظ ہیں، خدا کرے اون کی اشاعت کا انتظام ہو جائے،

حضرت محدث گنگوہی کی تقاریر حدیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کو شرح معانی حدیث اور تطبیق متعارضات کا خداداد ملکہ عطا ہوا تھا، عدد رکعات تراویح اور قرأت خلف الامام کے متعلق آپ نے مستقل رسالے بھی تالیف فرمائے، لطائف رشیدیہ میں بعض مشکل احادیث کا عجیب و غریب حل فرمایا ہے جنکو دیکھکر یہ ماننا پڑتا ہے کہ فیوض ولی اللّٰہی سے اللہ تعالیٰ نے بہت اعلیٰ حصہ آپ کو عطا فرمایا تھا،

کتبِ حدیث کی تلاش کا آپ کو بہت اہتمام تھا، سنن بیہقی کا نسخہ بڑی کوشش سے نقل کرا کے حاصل کیا" (جواب حیدرآباد میں مکمل طبع ہو گئی ہے)

مولانا کی اوّلیات میں سے یہ ہے کہ دورۂ حدیث میں ترمذی شریف کو مقدم کرتے تھے، کیونکہ موطا امام مالک اگرچہ اوّلیت اور تفضیلت کے اعتبار سے سب پر مقدم ہے، مگر صناعتِ حدیث میں ترمذی کا مقام بہت بلند ہے، امام ترمذی ہر حدیث پر جرحًا و تعدیلًا کلام کرتے ہیں، وجوہ علل سے خوب بحث کرتے ہیں جن کو سمجھ لینے کے بعد طالبِ علم کو فنِ حدیث سے پوری مناسبت ہو جاتی ہے، وہ ہر باب میں ایک دو حدیث روایت کر کے اسی باب کی دوسری احادیث کی جانب اشارہ بھی کر دیتے ہیں، جس پر تحقیق کے ساتھ کام کرنے سے طالب علم کو وسعتِ نظر حاصل ہو جاتی ہے، ابواب الاحکام کے ہر باب میں اقوال فقہاء و مذاہبِ صحابہؓ و تابعین بھی بیان کر جاتے ہیں جس کا جاننا مقلد اور مجتہد دونوں کو ضروری ہے، ترمذی کو سمجھ کر پڑھ لینے کے بعد ہی طالب علم کو بخاری کے لطائفِ اسناد اور تراجم ابواب کی خوبیاں نظر آ سکتی ہیں، اس لئے بخاری کا درس ترمذی کے بعد ہوتا تھا، مگر ترمذی کی تقدیم کا یہ مطلب نہ تھا کہ موطا امام مالک سے بے اعتنائی کی جائے، جیسا آج کل عمومًا ہمارے مدارس میں مشاہدہ ہے، مقامِ شکر ہے کہ اب ہمارے نوجوان شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے موطا امام مالک کی ضخیم شرح بنام اوجز المسالک تصنیف کر کے سنت ولی اللہی کو پھر زندہ کر دیا ہے، اب علماء و طلبہ کو موطائے امام مالک پر وہی توجہ ہونے لگی ہے جو سلسلۂ ولی اللہی کو ہونا چاہئے،

مولانا احمد حسن محدث امروہی متوفی ۱۳۳۰ھ

مولانا محمد قاسم صاحب کے تلامذہ میں بہت زیادہ ذکی اور استاذ کے نورِ نظر تھے، درسِ حدیث کے لئے زندگی وقف کر دی تھی، استاد کی تقریریں آپ کو بہت محفوظ تھیں، اسی لئے آپ کا درسِ حدیث بہت مشہور تھا، آپ کے تلامذہ کے پاس وہ تقریریں محفوظ ہیں

مولانا محمد یحییٰ صاحب محدث کاندھلوی (ف ۱۳۳۴ھ)

مولانا گنگوہی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، آخری دورۂ حدیث حضرت نے آپ ہی کی وجہ سے پڑھایا، آپ نے مولانا گنگوہی کی تمام صحاح پر تقاریر درس

کو بڑی قابلیت وضبط واتقان سے محفوظ فرمایا ہے، مدرسۂ مظاہر علوم سہارنپور میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی جگہ سالہا سال درس حدیث دیتے رہے، بہت علما آپ سے فیضیاب ہوئے، اس ناچیز کو بھی شرف تلمذ حاصل ہے، فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ نے مجھے چار نعمتیں عطا فرمائی ہیں جن سے مجھے اپنی مغفرت اور کامیابی کی قوی امید ہے، (۱) محبت شیخ وخدمت شیخ (۲) محبت قرآن وسجود (۳) محبت رسول (۴) شغف حدیث مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی حیات ہی میں آپ کا سہارنپور میں انتقال ہو گیا، تغمدہ اللہ برحمتہ ورضوانہ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے مولوی محمد زکریا صاحب سلمہ جو الولد سر لابیہ کے پورے مصداق ہیں تالیف بذل المجہود میں مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے قوت بازو بنے، اور اب اپنے والد اور شیخ کی جگہ مدرسہ مظاہر علوم میں شیخ الحدیث ہیں اطال اللہ بقاءہ آمین۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ محدث دیوبند (ف ۱۳۳۹ھ)

آپ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے اجل تلامذہ میں سے ہیں، مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم کے بعد آپ کو صدر مدرس دارالعلوم بنایا گیا، آپ سے بیشمار علما نے حدیث پڑھی، اور سند حاصل کی، ترمذی پر آپ کی تقریر طبع ہو چکی ہے، ابوداؤد شریف پر بھی آپ کا حاشیہ ہے، دارالعلوم دیوبند کے فارغین کے پاس آپ کی وہ تقریریں محفوظ ہیں، جو صحاح ستہ کے درس میں آپ نے بیان فرمائیں جن سے آپ کی شان تحقیق ظاہر و باہر ہے، رسالہ عظمت وحی جو حدیث بدء الوحی کی شرح ہے، اور شرح تراجم ابواب بخاری آپ کی حدیث دانی کی کافی دلیل ہے، آپ کا علم بڑا عمیق تھا جس پر الادلہ وایضاح الادلہ واحسن القریٰ شاہد عدل ہے، آپ کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کو بہت زیادہ ترقی ہوئی جس کو عظیم الشان جلسۂ دستار بندی ۱۳۲۸ھ نے دنیا کے سامنے آفتاب کی طرح روشن کر دیا تھا،

شیخ وقت حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری المہاجر مدنی (ف ۱۳۴۶ھ)

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لئے

حضرت مولانا اپنے وقت میں محدث عالی الاسناد فقیہ الوقت قطب الارشاد رئیس الاذکیا راس المناظرین تھے،

روحانی قوت بھی بہت زبردست تھی، آپ نے علم حدیث حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی سے حاصل کیا تھا جو مولینا احمد علی صاحب محدث سہارنپور کے بعد مدرسۂ مظاہر علوم کے صدر مدرس تھے، مولانا محمد مظہر صاحب نے استاذ الکل مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی اور صدر الصدور مولانا صدر الدین دہلوی اور مولانا رشید الدین دہلوی سے جملہ علوم حاصل کئے، اور بخاری شریف شاہ اسحاق صاحب سے پڑھی، پھر مولانا خلیل احمد صاحب نے قیام بھوپال مین حضرت مولانا عبد القیوم بھوپالی سے بھی دوبارہ بخاری شریف، شمائل ترمذی اور کچھ حصہ مسلم شریف کا اور مسلسلات شاہ ولی اللہ اور نوادر و درثمین پڑھکر جملہ کتب حدیث کی اجازت حاصل کی، آخر کی ان تین کتابون کی سند متصل اس زمانہ مین بجز مولانا کے کسی کے پاس نہ تھی، اس لئے علماء جوق جوق مولانا کے پاس آتے، اور ان کتابون کی سند حاصل کرتے تھے، پھر اسی سال ۱۲۹۳ھ مین حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور مکہ مکرمہ مین مولانا الشیخ احمد دحلان مفتی شافعیہ سے روایت واجازت حدیث حاصل کی، اور مدینہ منورہ مین محدث دار الہجرت مولانا شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی کو جملہ کتب حدیث کے اوائل سنا کر اجازت حاصل کی اور مسلسل باجابۃ الدعا رفی الملتزم کی اجازت بالتفصیل حاصل کی، پھر ۱۳۲۳ھ مین جب تیسری بار زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوے تو مولانا السید احمد برزنجی مفتی الشافعیہ سے سند حدیث حاصل کی، اس وقت یہ ناکارہ بھی حضرت مولانا کے ہمراہ تھا، پھر ۱۳۲۹ھ میں مولانا السید بدر الدین محدث شام سے جو امام نووی کے مشہور دار الحدیث کے صدر نشین اور نہایت متبع سنت مرجع العلماء بزرگ تھے، بذریعہ خط کے سند حدیث حاصل کی، اس سے حضرت مولانا کا شغف بالحدیث بخوبی واضح ہے، آپ اپنے استاذ مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کے بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے صدر مدرس مقرر ہوئے، اور ساری عمر درس حدیث وتفسیر وفقہ مین گذری، آخر عمر مین بذل المجہود سنن ابی داؤد کی شرح پانچ ضخیم جلدون مین تصنیف فرمائی، اس کی تالیف ۱۳۳۵ھ مین شروع ہوئی، اور شعبان ۱۳۴۵ھ مین مدینہ منورہ مین تمام ہوئی، اور اس خوشی مین مدینہ منورہ کے اعیان وعلما کو دعوت دیگئی جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ختم فتح الباری کے وقت مصر مین

شاندار ولیمہ کیا تھا، اس کتاب کے ختم کے بعد ہی آخر رمضان میں حضرت مولانا پر فالج کا اثر شروع ہوگیا، اور ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو بقیع الغرقد میں قبور اہلِ بیت کے قریب دفن ہوئے، جو آپ کی دیرینہ تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ موت مدینہ اور جوارِ رسول عطا فرمائے، چنانچہ عطا کیا گیا،

تو چنین خواہی خدا خواہد چنین

می دہد یزدان مرادِ متقین"

بذل المجہود میں کیا ہے، اوس کو علماء خود سمجھ سکتے ہیں، مگر نمونہ کے طور پر چند باتیں عرض کر دیتا ہوں (۱) کوئی بات اوس وقت تک نہیں لکھی گئی جب تک متقدمین کے کلام میں اس کی تائید نہ مل گئی (۲) مذہب حنفی کی پوری تحقیق اور کافی دلائل بیان کیے گئے، دوسرے مذاہب کے دلائل کا جواب بھی نہایت تحقیق سے دیا گیا (۳) ہر راوی کے متعلق پوری جرح و تعدیل صناعتِ حدیث کے موافق کی گئی (۴) جو روایات ابو داؤد میں معلق تھیں، ان کا دوسری کتابوں سے متصل ہونا ظاہر کیا گیا (۵) جو روایات ابو داؤد میں مختصر تھیں، ان کو دوسری کتابوں سے جہاں مفصل ہیں، مکمل طور سے بیان کیا گیا یا حوالہ دیدیا گیا، (۶) حدیث رسول کا منشا ظاہر کرکے وہ محاسن و حقائق بیان کئے گئے جن کا حافظ و ان محدث ہی اٹھا سکتا ہے (۷) بعض مقامات کو حضرت نے اول اپنی فہم کے مطابق املا کرایا، پھر خواب میں تنبیہ ہوئی کہ فلاں مضمون کو اس طرح نہیں بلکہ اس طرح لکھنا چاہئے، بیدار ہو کر کتابوں سے مراجعت کی گئی تو معلوم ہوا کہ خواب صحیح تھا، پھر اس مقام کو صحیح طور سے لکھا گیا، غرض اس کتاب کی تالیف میں تائیدِ غیبی مولانا کی شاملِ حال تھی، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ ورفعہ فی اعلیٰ علیین درجتہ وکرامتہ آمین،

حضرت مولانا کو حدیث کی نادر قلمی کتابیں جمع کرنے کا بہت شغف تھا، ابو داؤد کی شرح ابن رسلان جو بہترین شرح ہے، مکہ معظمہ میں دستیاب ہوئی تو اوس کی نقل کراکر تالیف بذل المجہود میں اوس سے مدد لی، مصنف عبد الرزاق کی ایک جلد مدینہ منورہ میں ملی، اوس کی نقل کرائی، پھر کتب خانہ سندھ میں دوسری

جلد کا پتہ لگا، تو اوس کو نقل کرایا، جمع الفوائد مجموعۂ جامع الاصول و مجمع الزوائد کا نسخہ مولانا عاشق الٰہی صاحب کو دستیاب ہوا، تو حضرت نے اس کے طبع کا حکم فرمایا، چنانچہ طبع ہو کر علماء کے ہاتھوں میں پہنچ گئی،

حافظ حدیث بحر العلوم مولانا سید انور شاہ کشمیری (ف ۱۳۵۲ھ) آپ حضرت شیخ الہند کے جانشین اور مسند حدیث دار العلوم دیوبند کی زینت تھے اخیر عمر میں چند سال جامعہ ڈابھیل ضلع سورت کے بھی شیخ الحدیث رہے، آپکی قوت حافظہ کو دیکھ کر اسلاف محدثین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، درس کے وقت روایات و تحقیقات کا سمندر جوش مارتا ہوا نظر آتا تھا، ایک دفعہ اس ناکارہ نے مولانا کی بیاض پر ایک نظر ڈالی جس میں بطور یادداشت کے مولانا کچھ نوٹ کر لیا کرتے تھے، میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا، کہ ایک ایک مسئلہ کے لئے مختلف کتابوں کے متعدد صفحات کا حوالہ درج تھا، جو مولانا کے کثرت مطالعہ اور وسعت نظر کی روشن دلیل تھی، کمال یہ کہ وہ یادداشتیں صرف کتاب ہی میں نہ تھیں، بلکہ دماغ میں بھی محفوظ تھیں، اور درس کے وقت ان کے حوالہ سے عجیب و غریب تحقیقات بیان ہوتی تھیں، آپ کی امالی میں سے فیض الباری چار ضخیم جلدوں میں مصر میں طبع ہوئی ہے، یہ بخاری شریف کے درس کی تقریر ہے، جو آپ کے بعض تلامذہ نے ضبط کی تھی، جامع ترمذی کی تقریر العرف الشذی دو جلدوں میں ہے، ابوداؤد کی تقریر بھی دو جلدوں میں ہے، سنن ابن ماجہ پر بھی آپ کا حاشیہ ہے، قراۃ فاتحہ خلف الامام، اور صلوٰۃ الوتر اور رفع الیدین پر الگ الگ مستقل رسالے تصنیف فرمائے ہیں جن کو دیکھکر آپکے تبحر علمی اور حفظ حدیث اور وسعت نظر کی داد دینی پڑتی ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کتب نادرۂ علم حدیث و فقہ کے حاصل کرنے کا مولانا کو بڑا اہتمام تھا، معانی الآثار طحاوی کے رجال میں کتاب کشف الاستار بڑی محنت سے نقل کرائی، جو طبع ہو گئی ہے، کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں بہت کتابیں آپ کی محنت و طلب سے داخل ہوئیں،

محدث بنگال مولانا محمد اسحق صاحب بردوانی (ف ۱۳۵۷ھ) آپ مولانا حکیم الامت تھانوی کے اجل تلامذہ سے تھے، حضرت حکیم الامۃ کی جگہ مدرسہ جامع العلوم کانپور میں ۲۵ سال تک درس حدیث و فقہ

وتفسیر دیا، آپ کا حافظہ بڑا عجیب تھا، تلاوتِ قرآن کی طرح بخاری شریف کا ایک پارہ تلاوت کرنے کا روزانہ معمول تھا، گویا اس زمانہ مین بخاری شریف کے حافظ تھے، ایک نجدی عالم نے مکہ معظمہ مین بعض مسائل مین آپ سے گفتگو کی، اثنائے کلام مین ایک حدیث کی بابت مولانا سے دریافت کیا، کہ یہ حدیث بخاری مین کتنی جگہ آئی ہے، مولانا نے برجستہ جواب دیا، کہ چھ جگہ آئی ہے، نجدی عالم اس جواب سے متحیر ہو کر کہنے لگا، مجھے خبر نہ تھی کہ ہندوستان مین بھی حدیث کے حافظ موجود ہین، مولانا نے موطا امام مالک کی شرح عربی مین لکھنی شروع کی تھی، دو چار صفحہ کی شرح ۱۲۵ صفحات مین لکھی گئی، مگر افسوس ہے پوری نہ ہوئی ورنہ عجائب روزگار سے ہوتی رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً،

حکیم الامت مجدد ملت مولانا محمد اشرف علی صاحب محدث تھانوی نور اللہ مرقدہ (ف ۱۳۶۲ھ)	وہ حکیم امتِ مصطفٰے وہ مجددِ طرقِ ہدیٰ / وہ جو بانٹتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے اشرف علی مدار تقا شمس المعارف والتقی / جو عمل سرا پہ نمونہ عمل صحابہ دکھا گئے

اسلامیانِ ہند کی یہ بزرگ ہستی ابھی چار مہینے پہلے ہماری نظرون کے سامنے تھی، اور ہمین فخر تھا کہ اگر کوئی ہم سے یہ پوچھتا کہ اس وقت مسلمانون مین سلف کا نمونہ کون ہے؟ تو ہم یہ کہہ سکتے تھے، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا نے ایک قدم بھی خلافِ شریعت نہین اوٹھایا، آپنے صرف اللہ پر نظر رکھکر کام کیا، کسی والیٔ ریاست یا سلطان ولایت پر کسی وقت نظر نہین کی، آپ کی آٹھ سو کتابون اور ہزارہا خطوط مین جو مردون کے نام بھی ہین اور عورتون کے بھی، کوئی بات ایسی نہین پیش کی جا سکتی جس کو پڑھتے ہوئے تہذیب کے چہرہ پہ جھینپ کے آثار نمودار ہون[1]،

مولانا ابتدا سے عمر ہی سے جب کہ اٹھارہ سال کی عمر تھی، مصنف تھے، اور آخر عمر تک مصنف رہے، ایسا مصنف جس نے تقریباً ہر علم مین تصنیف کی ہو، اور اتنی کثیر مقدار مین کتابین لکھی ہون، امام سیوطی کے بعد

---

[1] مسائل مخصوصۂ زنان اور مسائلِ طبیہ کو رہنے دیجئے کہ وہ عورتون کے مطالعہ کے لئے ہین، درس و تدریس کے لئے نہین ہین، اور انکی ضرورت سے کسی طرح انکار نہین ہو سکتا، پھر وہ مولانا کی تصنیف نہین ہین، بلکہ ان کے شاگردون کے قلم سے نکلے ہوئے ہین،

مولانا کے سوا نہین دیکھا گیا، وعظ اور خوش بیانی مین تو بے نظیر تھے ہی، کہ جس جلسہ مین تقریر کو کھڑے ہوئے پھر کسی کی تقریر سامعین کو پسند نہ آتی تھی" مولانا نے اپنی تصانیف سے دنیوی نفع کبھی حاصل نہین کیا، نہ کسی کتاب کا حق تصنیف کسی سے لیا، تمام کتابین اللہ کے لئے اور اصلاحِ امت کے لئے لکھین، اور ہر شخص کو چھاپنے کی اجازت دیدی،

مین اس وقت صرف آپ کی خدمتِ حدیث پر روشنی ڈالنا چاہتا ہون، کیونکہ عام طور پر مسلمان آپ کو ایک صوفی، عالم، مفسر، فقیہ، واعظ کی حیثیت ہی سے پہچانتے مین، حالانکہ خدمتِ حدیث بھی اس زمانہ مین آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے، جو آپکے تاجِ مجددیت کا درخشان گوہر ہے، آپنے علم حدیث کی باقاعدہ سند ملا محمود دیوبندی اور مولینا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، اور مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند سے حاصل کی، ملا محمود صاحب اور مولینا محمد یعقوب صاحب نے شاہ عبد الغنی صاحب سے حدیث پڑھی، اور مولانا محمود حسن صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحب سے،

حضرت حکیم الامۃ کو قاری عبد الرحمن صاحب محدث پانی پتی سے بھی سند حدیث حاصل ہے، اور مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب سے بھی بعض کتب حدیث پڑھکر سند حاصل کی ہے، پندرہ برس تک مدرسہ جامع العلوم کانپور مین باقاعدہ حدیث کا درس دیا، اور آپکے شاگردون مین بکثرت محدث پیدا ہوئے، جن مین مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سب سے زیادہ روشن ہے،

حضرت مولانا حکیم الامت نے ۱۳۱۵ھ مین توکلاً علی اللہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون مین قیام فرمایا، اس وقت سے باقاعدہ درس حدیث کا سلسلہ ملتوی ہوگیا، اور ہمہ تن تزکیہ و تربیتِ قلوب و اصلاحِ امت مین مشغول ہوگئے، مگر علماء اس مدت مین بھی آپ سے حدیث کی سند حاصل کرتے رہے، علامہ محقق محمد زاہد کوثری مصری نے جو مصر کے اجلۂ علماء محققین و مصنفین سے ہین، بذریعہ خط کے حضرت سے حدیث کی سند حاصل کی، اسانید حدیث مین مولانا کا رسالہ السبعۃ السیارہ طبع ہوچکا ہے، ترمذی پر آپ کا حاشیہ الثواب الجلی بھی طبع

ہو چکا ہے، دوسرا حاشیہ المسک الذکی بصورت مسودہ مکمل ہے، ایک چہل حدیث بھی طبع ہو چکی ہے، جس مین مسلم شریف سے چالیس حدیثین نسخہ ہمام کی جمع کی گئی ہین، جن کو معمر ہمام بن منبہ سے وہ ابو ہریرہ سے اور ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہین، سب حدیثون کی سند ایک ہی ہے، مولانا کے مواعظ ورسائل مین میرے اندازمین پانچ ہزار حدیثون سے کم نہین جن کی شرح کرکے امت کو تبلیغ کی گئی ہے،

سنہ ۱۳۳۰ھ مین آپ کو دلائل حدیثیہ للحنفیہ کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا، تو جامع الآثار اور تابع الآثار دو رسالے تصنیف فرمائے، جن مین ابواب الصلوٰۃ تک وہ حدیثین جمع کی گئین جو حنفیہ کی دلیل ہین، پھر تمام ابواب کے دلائل کا استیعاب کرنا چاہا، اور احیاء السنن کے نام سے ضخیم کتاب ابواب الحج تک تالیف فرمائی مگر جس عالم کو اس پر نظر ثانی کے لئے متعین کیا گیا تھا، اوس نے اپنی رائے سے اس مین اس قدر ترمیم و تنسیخ کر دی، کہ مولانا کی تصنیف باقی نہ رہی، بلکہ مستقل کتاب ہو گئی، اس لئے اوس کی اشاعت ملتوی کر دی گئی، اور حضرت کے منشاء کے موافق دوبارہ اس مہم کام کو انجام دیا گیا[۱]، پندرہ سال سے کچھ زیادہ مدت مین ابواب الصلوٰۃ سے ابواب المیراث تک جملہ ابواب فقہیہ کے دلائل احکام حدیث سے جمع کر دیئے گئے،

یہ کتاب جس کا نام اعلاء السنن ہے، بیس جلدون مین تمام ہوئی ہے، ابتداء کی آٹھ جلدین حرفاً حرفاً حضرت حکیم الامۃ کی نظر سے گذر چکی ہین، بقیہ جلدون مین مشکل اور مہم مقامات حضرت کے سامنے پیش کئے گئے ہین، حضرت حکیم الامۃ کو اس کتاب کی تکمیل سے جسقدر مسرت ہوئی ہے، اوس کو لفظون سے بیان نہین کیا جا سکتا، فرماتے تھے، کہ اگر خانقاہ امدادیہ مین اعلاء السنن کے سوا اور کوئی کتاب بھی تصنیف نہ ہوتی، تو یہی کارنامہ اوس کا اتنا عظیم الشان ہے، کہ اسکی نظیر نہین مل سکتی، اس مین صرف حنفیہ ہی کے دلائل حدیثیہ نہین بلکہ متن کتاب مین

---

[۱] قدر اللہ اتمامہ واکمالہ علی ید ھذا العبد الغریق فی الآثام اقل الانام ظفر احمد العثمانی التھانوی ولیس لی فیہ غیر الرسم والاسم والشیخ نور اللہ مرقدہ ھو الروح فی ھذا الجسم،

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت ہمان می گویم

احادیث مویدۂ حنفیہ ہین، اور حواشی مین بڑی تحقیق اور تفتیش سے جملہ احادیث احکام کے استیعاب کی کوشش کی گئی ہے، پھر غایت انصاف کے ساتھ محدثانہ و فقیہانہ اصول سے جملہ احادیث پر کلام کیا گیا ہے، کوشش کی گئی کہ ہر مسئلہ مختلف فیہا مین حنفیہ کے سب اقوال کو تلاش کیا جائے، پھر جو قول حدیث کے موافق ہوا، اوسی کو مذہب حنفی قرار دیا گیا، تحقیق کامل کے بعد پورے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ جس مسئلہ مین حنفیہ کا ایک قول حدیث کے خلاف ہوگا، تو دوسرا قول حدیث کے موافق ضرور ہوگا، یا کوئی حدیث یا آثار صحابہ اون کے قول کی تائید مین ہون گے، آپ کو حیرت ہو گی کہ مسئلہ مصراۃ مین بھی امام ابوحنیفہ کا ایک قول حدیث صحیح کے بالکل موافق ہے جس کو علامہ ابن حزم نے محلی مین روایت کیا ہے، اعلاء السنن مین تقلید جامد سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ تحقیق فی التقلید سے کام لیا گیا ہے، جس مسئلہ مین حنفیہ کی دلیل کمزور تھی، وہان صاف طور سے ضعف دلیل کا اعتراف کیا گیا، اور دوسرے مذاہب کی قوت کو تسلیم کیا گیا ہے،

جن حضرات کو مذہب حنفی پر مخالفت حدیث کا اعتراض ہے، وہ انصاف سے کام نہین لیتے، جس مذہب مین مرسل و منقطع بھی حجت ہے، اور راوی مستور الحال کو قبول کیا گیا ہے، قول صحابی کو بھی قیاس سے مقدم مانا گیا ہے اوس سے زیادہ حدیث پر عمل کرنے والا کون ہو سکتا ہے، ؟ بات یہ ہے کہ خبر واحد کی تصحیح و تضعیف مین جس طرح باہم محدثین مین اصولی اختلاف ہے، اسی طرح حنفیہ کو بھی بعض مقامات مین محدثین سے اصولی اختلاف ہے، مثلاً حنفیہ کے نزدیک صحت خبر واحد کے لئے یہ بھی ضروری شرط ہے، کہ وہ اصول مشہورہ کے خلاف نہ ہو، اور یہ اصول قیاسی نہین، بلکہ نصوص قرآنی اور احادیث مشہورہ سے ماخوذ ہین بعض علماے عصر نے حنفیہ کے کلام مین موافقت اصول کی شرط دیکھکر جو یہ دعوی کیا ہے، کہ حنفیہ روایت پر درایت کو مقدم کرتے ہین، یہ صحیح نہین ہے، حنفیہ کے نزدیک تو حدیث ضعیف اور مرسل بھی قیاس سے مقدم ہے، وہ درایت کو روایت پر مقدم کیسے کر سکتے ہین ؟ حنفیہ کی مراد موافقت اصول سے اُن اصول کی موافقت ہے جو نصوص قرآنیہ اور سنت مشہورہ سے ماخوذ اور امت کے نزدیک مسلّم ہین، یہ اور بات ہے کہ یہ اصول درایۃ

قیاس کے موافق بھی ہیں، مگر قیاس سے ماخوذ نہیں، (ملاحظہ ہو ملفوظات عزیزیہ ص ۱۱۵ و ۱۱۶ طبع مجتبائی میرٹھ)
اس قاعدہ کی بنا پر حنفیہ بعض بعض دفعہ ضعیف حدیث کو صحیح حدیث پر مقدم کر دیتے ہیں، کیونکہ ضعیف موافق اصول ہے، اور صحیح خلاف اصول، مگر وہ کسی حدیث کو رد نہیں کرتے، بلکہ حدیث مرجوح کا بھی اچھا محمل بیان کر دیتے ہیں، جس کی تائید حدیث کے تمام طرق کو جمع کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے، اسی طرح حنفیہ کے نزدیک آثار و اقوال صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سمجھنے میں بڑا دخل ہے، وہ ہر خبر واحد کو آثار صحابہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ ایک اجمالی اشارہ ہے جس کی تفصیل کے لئے اعلاء السنن کا مطالعہ کرلینا چاہئے،

اس کتاب کا مقدمہ بھی مستقل کتاب کی صورت میں الگ چھپ چکا ہے، جس میں حنفیہ کے اصول حدیث جمع کئے گئے ہیں، اور ثابت کیا گیا ہے، کہ جن اصول میں حنفیہ عام محدثین سے متفرد ہیں، ان میں بھی بعض محدثین ان کے موافق ہیں، پھر مقدمہ فتح الباری کی ایک طویل فصل کا خلاصہ لکھ کر ثابت کیا گیا ہے، کہ امام بخاری جیسا محدث بھی بعض دفعہ حنفیہ کے اصول پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے، پس جب تک حنفیہ کے اصول حدیث سے پوری واقفیت حاصل نہ ہو جائے، اس وقت تک ان کی کسی دلیل کو کسی محدث کے ضعیف کہنے سے ضعیف نہیں کہا جا سکتا،

الحمد للہ اس کتاب کی تکمیل سے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی وہ بات پوری ہو گئی، جس کو انھوں نے فیوض الحرمین میں کبریت احمر و اکسیر اعظم تبلایا ہے،

قال عرفنی رسول اللہ صلی اللہ	فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
علیہ وسلم ان فی المذھب الحنفی	نے تبلایا ہے کہ مذہب حنفی میں ایک طریقہ بڑا
طریقۃ انیقۃ ھی اوفق الطرق	عمدہ ہے، جو اس طریق سنت کے بہت زیادہ
بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت	موافق ہے، جو بخاری اور ان کے اصحاب کے
ونقحت فی زمان البخاری واصحابہ	زمانہ میں مدون اور منقح ہو چکا ہے وہ یہ کہ

وذلك ان يوخذ من اقوال الثلاثة قول اقربهم بها فى المسئلة ثم بعد ذلك يتبع اختيارات الفقهاء الحنفيين الذين كانوا من اهل الحديث فرب شئ سكت عنه الثلاثة فى الاصول وما تعرضوا لنفيه ودلت الاحاديث عليه فليس بد من اثباته والكل مذهب حنفى، اھ

(ائمہ) ثلاثہ (ابو حنیفہ و ابو یوسف و محمد رحمہم اللہ) کے اقوال میں سے اوس قول کو لیا جائے، جو اس مسئلہ میں سب سے زیادہ حدیث کے قریب ہو پھر ان فقہاے حنفیہ کے جو محدثین میں سے تھے اختیارات کا تتبع کیا جائے، کیونکہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن سے ائمۂ ثلاثہ نے ظاہر روایت میں سکوت کیا ہے، اور ان کی نفی سے تعرض نہیں کیا، اور احادیث اون پر دلالت کر رہی ہیں، تو ان کو ثابت ماننا ضروری ہے، اور یہ سب مذہب حنفی ہوگا، (مذہب سے خارج نہ ہوگا)

آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں، :-

وهذه الطريقة ان اتمها الله تعالى و اكملها فهى الكبريت الاحمر والاكسير الاعظم

(شاہ صاحب فرماتے ہیں) کہ اگر اللہ تعالی اس طریقہ کو پورا کر دیں تو وہ کبریت احمر اور اکسیر اعظم ہوگا،

الحمدللہ یہ طریقہ، کبریت احمر و اکسیر اعظم شاہ ولی اللہ صاحب ہی کے سلسلہ میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے دورِ تجدید میں پورا ہو گیا، کیونکہ اعلاء السنن میں یہی کیا گیا ہے، کہ ائمۂ ثلاثہ اور علماء حنفیہ کے اقوال کا پورا تتبع کر کے جو قول حدیث کے زیادہ موافق ملا، اوسی کو مذہب قرار دیا گیا،

اس وقت تک اس کتاب کی گیارہ جلدیں طبع ہو چکی ہیں، نو جلدیں بصورت مسودہ رکھی ہوئی ہیں جن میں سے تین کی کاپی ہو چکی ہے، کاغذ کی گرانی کی وجہ سے طباعت میں تاخیر ہو رہی ہے، حضرت حکیم الامۃ کی جماعت کا خصوصًا اور تمام مسلمانوں کا عمومًا فرض ہے کہ اس کتاب کی تکمیل طباعت میں پوری کوشش کریں

علامہ محمد زاہد کوثری مصری نے اس کی دس جلدوں پر نظر فرما کر اپنی طرف سے مفصل تقریظ جریدۃ الاسلام مصر میں شائع فرمائی ہے، جس کو دیکھکر اندازہ ہو سکتا ہو کہ بیرون ہند کے علماء نے اس کتاب کو کس وقعت کی نظر سے دیکھا ہے، ان کی تقریظ کے آخری چند جملے یہ ہیں، فرماتے ہیں، :-

والحق یقال انی دہشت من ھذا	حق بات کہنا پڑتی ہے میں تو اس طرح حدیثوں
الجمع وھذا الاستقصاء ومن ھذا	کے جمع کرنے تلاش کرنے اور پوری طرح ہر حدیث کے
الاستیفاء البالغ فی الکلام علی کل	متن وسند پر فن حدیث کے موافق مفصل کلام
حدیث بما تقضی بہ الصناعۃ متنا	کرنے سے حیرت میں رہ گیا، پھر خوبی یہ ہو کہ اپنے مذہب
وسندا من غیر ان یبدو علیہ آثار	کی تائید میں تکلف کے آثار کا نام ونشان نہیں، بلکہ
التکلف فی تائید مذھبہ بل الانصاف	جملہ اہل مذاہب کی رایوں پر انصاف کو امام بنا کر
رائدہ عند الکلام علی آراء اہل المذاہب	کلام کیا گیا ہے، مجھے اس کتاب سے بے انتہا خوشی ہوئی،
فاغتبطت بہ غایۃ الاغتباط وھذا تکون ھمۃ	ہمت مردانہ ایسی ہی کہتے ہیں اور بہادروں کا
الرجال وصبر الابطال اطال اللہ بقاء ہ فی خیر و	استقلال ایسا ہی ہوتا ہو، اللہ تعالیٰ مولف
عافیۃ ووفقہ لتالیف امثالہ من المولفات النافعۃ	کو خیر و عافیت کے ساتھ تا دیر سلامت رکھے اور اس

([illegible])

حضرت حکیم الامۃ نے ایک طرف مذہب حنفی کو احادیث کی روشنی میں منقح فرمایا، اور دوسری طرف مسائل سلوک وتصوف کو قرآن کی آیات کثیرہ سے مجتہدانہ شان کے ساتھ مدون فرمایا، جس کا نام مسائل السلوک ہے، پھر احادیث تصوف کو کتاب التعرف باحادیث التصوف میں جمع فرمایا اور دنیا کو بتلا دیا کہ صحیح اسلامی تصوف صرف قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے، اوس کا کوئی مسئلہ بھی کسی غیر اسلامی ماخذ سے لیا ہوا نہیں، التعرف سے پہلے احادیث تصوف میں مستقل کتاب سننے میں نہیں آئی، الحمد للہ اس کتاب نے صحیح اسلامی تصوف سے مسلمانوں کو روشناس کر دیا ہے، ضرورت ہو کہ حکیم الامۃ رح کی جماعت میں کوئی صاحب ہمت اس موضوع کی تکمیل کے لئے

م آگے بڑھائین، کیونکہ التعرف مین ہنوز جملہ احادیث تصوف کا استیعاب نہین ہوا،

اب مین سلسلۂ ولی اللٰہی کی چند عظیم الشان شروح حدیث کا تذکرہ کرنا چاہتا ہون جن کے مصنف بحمد اللہ ں وقت بقید حیات ہین،

ح الملہم فی ح صحیح مسلم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی شیخ الحدیث جامعۂ ڈابھیل کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے جس مین مسلم شریف کی شرح محدثانہ فقیہانہ و متکلمانہ انداز سے کی گئی ہے، جن احادیث اج کل عقلی اشکالات کئے جاتے ہین، ان کے جوابات متکلمانہ طرز استدلال کے ساتھ بہت خوبی سے دیئے ئے ہین، جابجا نکات تصوف بھی بیان کئے گئے ہین، اس طرح یہ کتاب سلسلۂ ولی اللٰہی کی حدیث دانی، قہ اور علم کلام و تصوف کی آئینہ دار بن گئی ہے، پانچ ضخیم جلدون مین تمام ہونے کی امید ہے، اس وقت تک ا جلدین طبع ہو چکی ہین، سرکار نظام والی دکن خلد اللہ ملکہ کی امداد مالی مولف کے شامل حال ہے، امید ہے بقیہ جلدین بھی جلد طبع ہو جائین گی، جلد اول کے شروع مین مقدمہ علم حدیث قابل دید اور بہت مفید ہے،

اوجز المسالک فی ح الموطا المالک یہ ہمارے نوجوان شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی بہترین تالیف ہے، اس سے پہلے آپنے شمائل ترمذی کی شرح بھی اردو مین بہت عمدہ لکھی ہے، جو بیحد مقبول ئی، اوجز المسالک موطا مالک کی بے نظیر شرح ہے، ہر مسئلہ مین فقہاء اربعہ کے مذاہب نہایت بسط و احت سے بیان کئے گئے ہین، جملہ مذاہب کے دلائل بھی اجمالاً بیان کئے گئے ہین، اگرچونکہ اس کا موضوع رح موطا ہے، اس لئے جملہ مسائل و احکام سے تعرض نہیں کیا گیا، صرف انہی مسائل سے بحث کی گئی ہے، سے موطا مین تعرض ہے، اس مین بلاغات و مراسیل و مقاطیع کو موصول کرنے کی بھی پوری کوشش ئی ہے، جو شارح کی وسعت نظر کی بڑی دلیل ہے، پہلی جلد کے ساتھ ضخیم مقدمہ ملحق ہے، جو بہت ہی امد اور مفید ہے، تین جلدین طبع ہو چکی ہین، بقیہ زیر تالیف و زیر طبع ہین، گرانی کاغذ سد راہ بن رہی ہے، طال اللہ بقاء مولفہ و وفقہ لامثالہ (آمین) آپکے چچازاد بھائی مولوی محمد یوسف سلمہ بھی ماشاء اللہ

نوعمری ہی میں مصنف ہیں، شرح معانی الآثار طحاوی پر بڑی محنت سے کام کر رہے ہیں، امید ہے کہ طحاوی کا یہ حاشیہ بے نظیر ہوگا، علماے حنفیہ کا فرض ہے کہ شرح معانی الآثار طحاوی کی پوری طرح خدمت کریں ابھی تک اس کتاب کے شایان شان کام نہیں ہوا، امید ہے کہ مولوی محمد یوسف سلمہ اس فرض کو بخوبی انجام دیں گے، وفقہ اللہ واعانہ (آمین)

التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح | یہ ہمارے نوجوان محدث مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی تالیف ہے، عربی زبان میں مشکوٰۃ شریف کی بہترین شرح ہے، دمشق میں طبع ہوئی ہے، میری نظر سے چار جلدیں گذری ہیں، خود مؤلف سے بھی بعض مقامات کو سنا ہے، مؤلف کی محنت، وسعت نظر، سلیس طرز بیان قابلِ داد ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے نوجوان علما کو اس قسم کی محنت و تحقیق کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائیں، آمین (کثر اللہ امثالھم وتقبل اعمالھم) قصبہ کاندھلہ کے لئے یہ فخر حاصل ہے، کہ اوس میں بیک وقت تین چار محدث موجود ہیں، اور ہر ایک صاحبِ تصنیف ہے،

بغیۃ الالمعی حاشیۃ نصب الرایۃ للزیلعی | یہ علمائے مجلس علمی جامعہ ڈابھیل کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس وقت تک ہندوستان میں نصب الرایۃ کا ایک ہی نسخہ مطبوعہ نولکشور علما کے سامنے تھا، جو بہت زیادہ محتاج تصحیح تھا، مجلس علمی جامعہ ڈابھیل نے بڑی محنت سے اوس کی تصحیح کی پھر اوس پر بہت نفیس حاشیہ لکھوایا، اور عمدہ کاغذ پر خوبصورت جلی حروف میں مصری ٹائپ سے طبع کرا کر شائع کیا، یہ بہت بڑی خدمتِ حدیث ہے، جو مجلس علمی کے علما نے انجام دی ہے جزاھم اللہ احسن الجزاء وفقھم لامثالہ،

سیرۃ النبی و سیر الصحابہ و سیر الصحابیات و سیر التابعین و اسوۂ صحابہ | یہ دار المصنفین شبلی منزل اعظم گڈھ کا اردو زبان میں بڑا بلند اور مفید کارنامہ ہے جس میں حدیث نبوی کا بڑا ذخیرہ اور قرن اول کے رجال حدیث کی مفصل تاریخ منضبط کی گئی ہے، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے حدیث پڑھی ہے، علامہ شبلی کے حنفی ہونے میں کسی شک و شبہہ کی اصلاً گنجایش نہیں، انکی اسکات المعتدی

فی قرأۃ المقتدی اور سیرۃ النعمان اور نعمانی لقب اس پر شاہد ہے، علمائے دار المصنفین علامہ شبلی ہی کے جانشین ہیں، ان کے حنفی ہونے میں بھی کسی طرح کلام نہیں ہو سکتا، پس ان کی یہ تمام تر خدمت حدیث سلسلۂ[1] ولی اللّٰہی کی اوسی شارح کا رنامہ ہے، جو اپنے کو حنفی کہتے ہیں، ان کو حنفیہ سے الگ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے،

سیرۃ النبی کی چھ جلدیں، اور سیر الصحابہ کی دس جلدیں اور تابعین کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے، ہر جلد کافی ضخیم ہے، اور یہ بہت بڑی خدمت حدیث ہے، جو دار المصنفین کے علما رنے انجام دی ہے، حق کو چھپایا نہیں جا سکتا، ہم کو سیرۃ النبی کے بعض مقامات پر اعتراض بھی ہے، اور مقام شکر ہے کہ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی ان کی اصلاح پر توجہ فرما رہے ہیں،

یہ مختصر تذکرہ ہے سلسلۂ ولی اللّٰہی حنفی کی خدمتِ حدیث کا جس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ آج اس سلسلہ کی برکت سے ہندوستان میں علم حدیث کا مینارہ اتنا بلند ہے، کہ ممالک اسلامیہ میں کوئی ملک اوسکی ہمسری نہیں کر سکتا، جامع ازہر مصر کے مشہور ناقد و بصیر عالم سید رشید رضا مرحوم نے مفتاح کنوز السنۃ کے مقدمہ میں اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ سے کیا ہے:

ولو عنایۃ اخواننا علماء الھند بعلوم الحدیث — اگر ہمارے برادران علمائے ہندوستان نے اس زمانہ میں علوم حدیث

فی ھذا العصر لقضی علیھا بالزوال — پر توجہ نہ کی ہوتی تو اس علم کے زوال و فنا کا فیصلہ ہو چکا ہوتا

اور اگر خدمتِ درس و تالیف کے ساتھ ان خدمات کو بھی ملا لیا جائے جو کتب نادرۂ علم حدیث کی اشاعت و طبع میں اس سلسلہ نے بالخصوص دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے انجام دی ہیں، تو بلا مبالغہ اس وقت سرزمین ہند نے آفتاب علم حدیث کی روشنی کو بہت دور دور تک پہنچا دیا ہے، ذٰلک من فضل اللہ علینا و علی الناس ولکن اکثر الناس لا یعلمون،

---

[1] معارف: مصنفین دار المصنفین کا سلسلۂ حدیث شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بواسطہ حضرت مولینا ابو الحسنات عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ جن کا ذکر اوس سلسلہ اوپر مذکور ہے، سلسلۂ ولی اللّٰہی سے بھی بحمد اللہ متصل و مسلسل ہے "س"

[2] یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہو کہ مصححین و ناشرین و ناقلین دائرۃ المعارف کا تقریباً نصف حصہ علمائے ندوۃ العلماء سے معمور ہے، اور یہ سب بھی اسی سلسلۂ ناب سے مربوط ہیں، (س)

اسلامی معاشیات

کے

چند فقہی اور قانونی ابواب

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ

(۳)

ایسی غیر مملوکہ چیزیں جن میں قبضہ کے بعد بھی انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہوتی، ان کی ممکنہ حد تک تفصیل کو اس نقطہ پر ختم کرکے اب ان غیر مملوکہ امور کے بھی کچھ احکام سننے چاہئیں جن میں قبضہ کے بعد انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے،

بنجر غیر آباد زمینوں کی ملکیت کے قوانین

اسلامی قانون میں ممالک محروسہ کی ایسی غیر آباد زمینیں اور علاقے جن کا کوئی مالک نہ ہو، خواہ وہ کبھی آباد نہ ہوئی ہوں یا آباد ہونے کے بعد اس طرح ویران ہوگئی ہوں کہ ان کا کوئی مالک باقی نہ رہا ہو، ان کا اسلامی نام (موات) یا مردہ بنجر زمین ہے، بظاہر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی زمینوں کی مالک حکومت ہے، اور اس نے حکومت کی اجازت کے بغیر عام طور سے دنیا میں بھی دستور مروج ہے، کہ حکومت یا بادشاہ وقت کی اجازت کے بغیر ایسی زمینوں پہاڑوں جنگلات وغیرہ پر کوئی تصرف نہیں کر سکتا، اور نہ کوئی ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے، لیکن اسلام کا نقطۂ نظر اس باب میں بالکل مختلف ہے، وہ اس قسم کی تمام زمینوں کو بھی ملک کے عام باشندوں کا مشترکہ سرمایہ قرار دیتا ہے، اور بجز

ان چند مستثنیٰ زمینوں اور معادن کے سوا جن کا ذکر گذشتہ فصل میں بہ تفصیل ہو چکا ہے، رعیت کے ہر فرد کا یہ قانونی حق ہے، کہ ان کو بغیر کسی معاوضہ (رائلٹی) ادا کئے، قبضہ کرکے اپنی ملک بنالے، اس باب میں مسلمانوں کے پاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مشہور فرمان ایک ابدی وثیقہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے راوی تقریباً تمام محدثین ہیں، مثلاً امام مالک، امام ترمذی، ابوداؤد وغیرہ سب کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے، کہ

من احیا ارضاً میتۃ فھی لہ، ترجمہ کسی مردہ غیر آباد زمین کو جو آباد کرے گا یہ زمین اسی کی

اسی بناپر علامہ مقدسی نے مغنی میں تمام ائمۂ اسلام کا یہ اجماع نقل کیا ہے کہ

عامۃ فقھاء الامصار علی ان الموات یملك بالاحیاء،	فقہاے امصار کا عامۃً اس پر اتفاق ہے، کہ احیار (آباد کرنے) کی وجہ سے وہ آباد کرنیوالے کی ملک بن جاتی ہے، (ج ۶، ۱۴۷)

خواہ یہ ارض موات ایسی زمین ہو جو کبھی کسی کی مملوک نہ ہوئی ہو، اور اس کے آباد ہونے کی نوبت نہ آئی ہو، جیسا کہ وہی لکھتے ہیں، ایسی زمین کہ

مالم یجر علیہ ملك احد ولم یوجد فیہ اثر عمارۃ فھذا یملك بالاحیاء بغیر خلاف بین القائلین بالاحیاء	کسی کی ملک اس میں قائم نہ ہوئی ہو اور اس میں کسی آبادی کی علامت نہ پائی جاتی ہو تو بالاتفاق آباد کرنے کی وجہ سے آدمی اس کا مالک ہو جاتا ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، جو آباد کرنے کو ملک کا سبب کہتے ہیں،

اسی طرح ایسی اراضی،

مایوجد فیہ آثار ملك قدیم	جس میں کسی قدیم جاہلی ملک کی علامتیں

جاهلی کآثار الروم و مساکن ثمود ونحوهم فهذ ایملک بالاحیاء؛ پائی جاتی ہوں مثلاً روم کے آثار اور قوم ثمود کے مسکن کا حال ہے، یا جو ایسے مقامات ہوں تو آباد کرنے سے ان کا بھی آدمی مالک ہو جاتا ہے؛

چونکہ اس قسم کی زمین اسلامی عہد سے قبل ہی سہی لیکن بنی آدم کی مملوکہ چیزوں میں ہو چکی تھی، اس لئے شبہہ ہو سکتا تھا کہ دوسرے کی مملوکہ چیز پر قبضہ کرنے یا اوس کو ملک بنانے کا کسی دوسرے کو کیا حق ہے، اس شبہہ کے ازالہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے فرمان میں اس کی بھی تصریح فرما دی ہو کہ

عادی الارض للّٰہ ورسولہ ثم هو بعد لکم، عادی اراضی (یعنی اقوام قدیمہ کے کھنڈریا ان کے آباد کئے ہوئے بنجر علاقے) تو اللہ اور اسکے رسول کی ملک ہیں، پھر اس کے بعد اے مسلمانو! یہ تمھاری ملکیت ہے،

یعنی اس قسم کی زمینیں جب کہ اُن کے مالک چھوڑ کر لاپتہ ہو چکے ہوں اور اسلامی حکومت کی زیر نگرانی آگئیں، تو اب وہ اپنے پرانے مالکوں کی ملک سے نکل کر اللہ ورسول کی ملک میں داخل ہو گئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی طرف سے پھر ان کو عام مسلمانوں کے حوالہ فرما دیا، البتہ ارض موات کی ایک قسم اور رہ جاتی ہے، جو اسلامی عہد میں کسی خاص شخص کی ملکیت تھی، لیکن ان کا مالک ان کو غیر آباد کر کے لاپتہ ہو گیا ایسی زمینوں کے متعلق اگرچہ بعض ائمۂ اسلام کی رائے مختلف ہے، مگر امام ابو حنیفہ، امام مالک وغیرہ کا ان اراضی کے متعلق بھی یہی فتویٰ ہے، کہ

انها تملك بالاحياء وهو مذهب ابی حنیفة ومالك (مغنی) آباد کرنے سے وہ بھی مملوکہ بن جاتی ہیں، یہی ابو حنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے،

بہرحال اس قسم کی تمام اراضی جن کا فقہ کی اصطلاح میں "موات" نام ہے، در اصل یہ ملک کے باشندوں

کی مشترکہ جائداد ہے، اور ملک کا ہر باشندہ اس کو اپنی انفرادی ملکیت بنا سکتا ہے جس کی اسلامی قانون کی رو سے دو صورتین ہین،

<u>اقطاع یا جاگیرون کا حکم</u> | ایک کو اقطاع کہتے ہین یعنی خود حکومت اس علاقہ کو کسی شخص کے ساتھ بندوبست کردے، اور یہ امام کے صوابدید پر ہے، کہ جس کو چاہے جتنی زمین کا اقطاع کردے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایت ہی، جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج مین نقل کیا ہے، کہ

اقطع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لبلال بن الحارث المزنی مابین البحر والصخر،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مزنی کو دریا سے پہاڑ تک جاگیر مین دیدیا تھا، (یہ اصطلاح تھی ساحل سمندر سے کسی خاص سلسلہ کوہ تک کی درمیانی اراضی کیلئے ہندوستان مین جیسے از گنگ تا سنگ کا لفظ بعض علاقون مین بولتے ہین)

ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الاموال" مین اس قسم کے قطائع (جاگیرات) کا جو بارگاہ رسالت اور سریر خلافت سے مختلف لوگون کو عطا ہوتے رہے ہین، ذکر کیا ہے، مین نے خاص کر بلال بن حارث کی جاگیر کا ذکر قصداً اس لئے کیا تاکہ معلوم ہو کہ بڑی سے بڑا علاقہ بھی حکومت اپنے صوابدید سے جاگیر مین عطا کر سکتی ہے، لیکن حکومت کے صرف اقطاع سے اس علاقہ کا وہ شخص مالک نہیں ہو جاتا ہو جب تک کہ "احیاء" کرکے اس پر قبضہ نہ کرے، علامہ مقدسی لکھتے ہین،

فان اقطعہ الامام شیئًا من الموات لم یملکہ لکن یصیر احق بہ (مغنی)

اگر "موات" زمین کو امام (حکومت) کسی کی جاگیر مین دیدی تو محض اس سے وہ اس زمین کا مالک نہیں ہوجاتا البتہ بہ نسبت دوسرونکے وہ اسکا زیادہ حقدار ہوگا،

اپنے اس دعوی کی انھون نے دلیل بھی پیش کی، کہ "عقیق" مین جو جاگیر انھی بلال کے نام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقطاع کی تھی، چونکہ احیا، پر قادر نہ ہوسکے، حضرت عمرؓ نے اُن سے واپس لے لی، علامہ مقدسی لکھتے ہین :-

لو ملکہ لم یجز استرجاعہ	اگر صرف اقطاع سے بلال مالک ہوجاتے تو حضرت عمرؓ کو اس کی واپسی جائز نہ ہوسکتی تھی،

اسلامی جاگیرون کا مطلب یہان جاگیر کا یہ مطلب نہین ہے کہ جیسا ہندوستان مین سمجھا جاتا ہے، کہ وہ لاخراج کردی جاتی ہے، بلکہ موات کی اراضی کے عطا کرنے کے بعد اس پر "عشر" یا "خراج" بھی لگایا جاسکتا ہے، اور اس معاملہ مین مختلف زمینون کا حکم مختلف ہے، جس کی تفصیل فقہ کی کتابون مین موجود ہے، خراج کے باب مین صرف امام (بادشاہ وقت) کو اتنا اختیار دیا گیا ہے، کہ ملک و رعایا کے مصالح کی بنا پر مثلاً وقت پر فوجی امداد جاگیردار سے حاصل کیجائے گی، یا ازین قبیل کوئی اور مصلحت ہو تو جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے،

یکون الامام قد رای الصلاح	اگر امام اسی مین مصلحت دیکھے کہ زمین
فی تفویض خراج ارض صاحب	کا خراج جاگیردار کو عطا کردے تو
الارض فیجوز لہ ویسعہ ان	امام ایسا کرسکتا ہے، اور جاگیردار کو بھی
یقبلہ	اجازت ہوکہ وہ اس عطیہ کو قبول کرے،

لیکن امام کے سوا حکومت کے کسی عہدہ دار کو خواہ اس کا درجہ کتنا ہی بلند کیون نہ ہو خراج کی معافی بلکہ تخفیف تک کا اختیار نہین ہے،

بہرحال یہ ایک ذیلی بات تھی، جاگیرون کے متعلق بعض غلط فہمیون کا ازالہ مقصود تھا ورنہ اس کے تفصیلی مسائل تو بہت زیادہ ہین، جن کے ذکر کا یہان موقع نہین، اصل بات یہ کہی جارہی تھی

کہ اراضی موات مین انفرادی ملکیت ایک تو اس احیاء (آباد کرنے) سے حاصل ہوتی ہے جو اقطاع کے ذریعہ سے کسی کو ملی ہو، اور عام طور سے غیر آباد زمینون کے بند و بست کرنے کا دنیا مین یہی طریقہ مروج ہے اگرچہ مختلف حکومتون کا طرز عمل بند و بست کے شرائط اور نتائج مین مختلف ہے لیکن اراضی موات کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ جو اسلام مین ہے، دوسری حکومتون کی رعایا کے لئے شاید وہ عجیب ہو،

ملک کی غیر آباد زمینون کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ

میرا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے مذکورۂ بالا فرمان یعنی

مَنْ احییٰ ارض موات فھی لہ،

موات اراضی کو جو آباد کرے گا اُسی کی وہ ہو جاتی ہے،

کی بنا پر فقہائے امت کی اکثریت کا یہ فتویٰ ہے، کہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ غیر آباد زمینون اور علاقون (اراضی موات) سے جتنا حصّہ بغیر کسی معاوضہ اور رائلٹی کے چاہے، احیاء کرکے اُسے اپنی ملک اور جاگیر بنالے، صرف امام ابوحنیفہ اس مسئلہ مین متفرد ہین، کہ حکومت سے بھی اجازت احیاء کے لئے ضروری قرار دیتے ہین لیکن عام فقہائے اسلام حکومت کی اجازت کو غیر ضروری سمجھتے ہین حتیٰ کہ امام صاحب کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسف نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے مذکورۂ بالا نبوی وثیقہ کی بنا پر لکھا ہے،

ان اذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جائز الی یوم القیمۃ،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت قیام قیامت تک نافذ رہے گی،

یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان فھی لہ (وہ آباد کرنے والے کی ملک ہے) موجود ہے تو اس مین اب کسی دوسرے شخص سے پوچھنے اور اجازت حاصل کرنے کی قطعاً ضرورت نہین، البتہ حکومت کو صرف اس کی نگرانی کرنی چاہیئے کہ اس سے مفاد عامہ کو کوئی ضرر تو نہین پہونچتا، قاضی ابو یوسف نے

لکھا ہے کہ اس حدیث کی بعض روایتوں مین

لیس لعرق ظالم حق (ص ۳۶)

کے الفاظ سے اسی ضرر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ کسی غیر آباد زمین مین (یعنی موات) مین اگر کوئی درخت نصب کرے جس سے دوسرے کو نقصان پہونچے، تو پھر اس ظلم کا حق اس کو نہ دیا جائے گا،

عام فقہائے اسلام سے امام صاحبؒ کے اس اختلاف کے متعلق قاضی ابو یوسفؒ سے پوچھا گیا تھا، کہ اس صحیح و صریح نبوی وثیقہ کے ہوتے ہوئے حکومت کی اجازت کی قید امام صاحبؒ نے کیون بڑھائی کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کافی نہین ہے، اگرچہ اس کا جواب امام صاحبؒ کی طرف سے نقل کیا جاتا ہے کہ آخر بیت المال کے متعلق بھی تو عام قانون یہی ہے کہ

ھو بیت مال المسلمین، یعنی اس کے مالک مسلمان ہین،

لیکن باوجود اس کے کہ امام بیت المال کا مالک نہین ہے لیکن اس پر اتفاق ہے کہ

للامام تعین مصارفہ و ترتیبہ امام کو بیت المال کے رقوم مصارف کی تعین و ترتیب کا حق ہے، (مقدسی)

اسی طرح "زمین" کے متعلق بھی امام کو نظم و ترتیب مین بھی دخل دینا چاہئے، ورنہ رعایا مین باہمی کشمکش کا اندیشہ ہے، حکومت کی توثیق کے بعد جھگڑے کا خطرہ نہ رہے گا، لیکن لوگون نے امام صاحبؒ کی اس توجیہ کو تسلیم نہین کیا ہے، پوچھا گیا ہے کہ کیا ہوا کے ہر پرندے پر قبضہ کرنے کے لئے بھی حکومت کی اجازت درکار ہے، آخر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی موات کو تمام مسلمانون کے لئے مباح قرار دیا سند دیدی، کہ جو اس کو آباد کرے گا، اسی کی وہ زمین ہوجائے گی، اس کے بعد حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے،

بہرحال یہان یہ یاد رکھنا چاہئے کہ موات کی اراضی کو احیار کے ذریعہ سے اپنی مملوکہ جاگیر بنا لینے کا اختیار صرف مسلمانون ہی کو نہین بلکہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو ہے، مسلم ہو یا غیر مسلم، اور یہ میرا صرف قیاسی نتیجہ نہین ہے، بلکہ فقہ کی کتابون مین ہمیشہ اس کی تصریح کر دیجاتی ہے، مقدسی لکھتے ہین،

لا فرق بین المسلم والذمی	موات زمین کو آباد کرکے اپنی ملک بنا لینے
فی الاحیاء وبه قال ابوحنیفة	مین مسلم اور ذمی (غیر مسلم رعایا) مین کوئی
	فرق نہین ہے، امام ابوحنیفہ کا بھی یہی
	مذہب ہے،

خلاصہ یہ ہے کہ میدانی علاقہ ہو یا کوہستانی، جزیرہ ہو یا خشکی کا خطہ، جنگل ہو، بیابان، ملک کا ہر باشندہ جتنی زمین چاہے، موات اراضی مین سے آباد کرکے اس کو اپنی مملوکہ جاگیر مفت بنا سکتا ہے،

قاضی ابو یوسف کے الفاظ یہ ہین :-

کل ما عالج فی اجمته او من بحر	اجمہ (ریگستان) ہو یا تری کا علاقہ ہو، یا
او من بر بعد ان لا یکون فیه	خشکی کا اگر کسی خاص انسان کی ملک وہ
ملك لانسان فاستخرجه رجل	نہیں ہے، اور محنت مشقت کرکے جس نے
وعمرہ فهو له بمنزلة الموات	اوس کو نکالا اور آباد کیا، تو اس کا وہی مالک
	ہو جائے گا، جیسے موات اراضی کا حال ہے،

مثلاً دجلہ و فرات جیسے دریاؤن مین عموماً بڑی بڑی زمینین باہر نکل آتی ہین، اگران کے آباد کرنے مین کسی کا ضرر نہ ہو، تو ان کا حکم بھی مثل ارض الموات ہے،

یعنی اس جزیرہ کا آباد کرنے والا قانوناً مالک ہوجائے گا، یہان یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ احیار یا آباد کرنے کا جو لفظ برابر استعمال ہو رہا ہے، اوس کا کیا مطلب ہے، محض کھیتی کرنا یا باغ لگانا ہی مقصد

نہین ہو، بلکہ جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے :۔

احیاء کل واحدة من ذالك	ان میں ہر چیز کے احیار کا مطلب یہ ہے، کہ
بتھیتھا للانتفاع الذی اریۃ	جو نفع اس سے مقصود ہو، اوس کے لئے
بہ ،	اس کو تیار کیا جائے ،۔

یعنی آبادی صرف زراعت یا باغبانی پر منحصر نہین ہے، مکان بنا کر یا دوا لگا ہ (مویشی رکھنے کی جگہ) یا لکڑی وغیرہ جیسی چیزون کے رکھنے کی جگہ بنانی، یہ سب احیار مین داخل ہی، علامہ مقدسی نے بطور تمثیل کے چند چیزون کا ذکر کیا ہے، مقصد کے سمجھانے کے لئے ہم بجنسہ نقل کرتے ہین ،

فاما الدار فان یبنی حیطانہا	گھر کے احیار کا مطلب یہ ہے کہ اس کی دیوارین
مما جرت بہ العادة وتسقیفہا	کھڑی کی جائین، یعنی جس طرح اس ملک مین
لانہا لا تکون سکنی الا بذالك	دیوارون کے بنانے کا طریقہ ہو، ویسی دیوا
واما الحظیرة فاحیاءھا الحائط	کھڑی کر دی گئی ہو، اور اس کی چھت پاٹ
جرت بہ عادة مثلہا لیس من	دی گئی ہو، کیونکہ رہنے کے قابل بغیر اس
شرطہا التسقیف لان العادة	کے نہین ہوسکتا، اسی طرح حظیرہ (احاطہ)
ذلك من غیر تسقیف سواء	کے احیار کا مطلب یہ ہے کہ جس قسم کی دیوار
ارادحظیرة السواشی او للخشب	گھیر کر احاطہ بندی کا طریقہ اس ملک مین
	جاری ہو یعنی چھت پاٹنے کی ضرورت اس
	کی احیار مین نہین ہے، کیونکہ عام طریقہ یہی
	ہے، کہ ان احاطون کے لئے چھت نہین پاٹتے،
	خواہ مویشی کے لئے احاطہ بنایا جائے، یا لکڑی

الغرض آباد کرنے کی جو غرض ہے، اس کا سامان مہیا کرنا یہی اس کا احیار ہے، مثلاً کھیتی ہے تو اس کا جو تنا، سیرابی کا انتظام کرنا یہی اوس کا احیار ہے، مقدسی لکھتے ہین کہ زراعت کی احیار کی صورت یہ ہے کہ

ان یسوق الیها ماء من نهر او بیر وان کانت مما لا یمکن زرعها لکثرة احجارها کارض الحجاز فبان یقلع احجارها وینتقیها حتی یصلح للزرع وان کانت غیاضا او اشجارا کارض الشعری فبان یقلع اشجارها ویزیل عروقها اللتی تمنع الزرع،

آدمی اس کی طرف کسی نہر سے یا کنوین سے پانی لیجائین، اور اگر زمین ایسی ہو، جس مین کھیتی نہ ہوسکتی ہو، مثلاً کثرت سے اس مین پتھر ہون، جیسا کہ حجاز کی زمینون کا حال ہے، تو اوس کے احیار کے معنی یہ ہون گے، کہ پتھرون کو زمین سے باہر نکالا جائے، اور زمین صاف کیجائے حتی کہ کھیتی کے قابل ہوجائے، اور اگر بنجر (موات) زمین مین جنگل جھاڑ ہو، درخت ہون، جیسا کہ الشعری کی زمین کا حال ہے تو اوس کی احیار کے معنی یہ ہین، کہ درخت اکھاڑے جائین، اور ان جڑون کو کھود کر نکال دیا جائے،

[illegible]

بہرحال ہر چیز اور ہر ضرورت کا احیار خود اس ضرورت کے حسب حال ہوتا ہے، اور جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے کہ اس باب مین اعتبار زیادہ عرف عام اور رواج کا ہے، آباد کرنے کا اطلاق جس کاروبار پر کیا جاتا ہو وہی اس کا احیار ہے،

رعایا کی اسلام مین تملیکی قوت

اس کے بعد خواہ اقطاعی (حکومت کی بندوبست کی ہوئی) جاگیر ہو، یا خود کسی نے ارض موات پر قبضہ کرکے احیار کرلیا ہو، یہ آباد کرنے والے کی انفرادی ملک بن جاتی ہے، اقطاعی جاگیرات کا حکم احیار کے بعد جو ہوجاتا ہے، قاضی ابو یوسف لکھتے ہین :-

فلا یحل لمن یاتی من بعد ھو من الخلفاء ان یرد ذالک ولا یخرجہ من یدی من ھو فی یدہ وارثا او مشتریا، (ص ۳۴)	بعد کو جو خلفاء ہوں ان کے لئے جائز نہ ہوگا کہ (کسی امام کی عطاء کی ہوئی جاگیر کو) اس شخص سے واپس لیں جس کے قبضہ میں وہ جاگیر خواہ بطور وراثت کے ہو، یا خریداری کے ذریعہ سے اس تک پہنچی ہو،

جس سے معلوم ہوا کہ جس نے آباد کی ہو، خود اس کے یا اس آباد کرنے والے سے کسی کو وراثۃً ملی ہو یا آباد کرنے والے سے کسی نے خریدی ہو کسی سے بھی حکومت اس کی یہ مملوکہ زمین چھین نہیں سکتی، انھوں نے اسکی تصریح کر دی ہے کہ

فاما ما اخذ الولاۃ من ید واحد ارضا واقطعھا آخر فھذا بمنزلۃ الغاصب غصب واحد اً و اعطی آخر، (کتاب الخراج ۳۴)	اور حکومت کے ولاۃ (صوبہ داروں گورنروں) وغیرہ کا جو یہ طریقہ ہے کہ جاگیر کو ایک شخص کے قبضہ سے نکال کر دوسرے کو جاگیر میں دیدیتے ہیں، تو اس کی صورت وہی ہے جو غاصب اور زبردستی چھیننے والوں کی ہوتی ہے یعنی ایک شخص سے اوس کی مملوکہ چیز زبردستی چھین کر دوسرے کو دیدے،

دوسری جگہ مزید صراحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

فامامن اخذ من واحد و اقطع آخر فھذا بمنزلۃ مال غصبہ واحد من واحد واعطی واحداً (ص ۳۶)	اور وہ جو ایک شخص سے جاگیر چھین کر دوسری کی جاگیر میں دی جاتی ہے، تو اوس کی حیثیت اس مال کی ہے، جو ایک شخص سے چھین کر

اسی طرح اراضی موات کو احیاء کرکے جس نے اپنی مملوکہ جاگیر بنا لی ہو، اس کے متعلق بھی لکھتے ہیں،

ولیس للامام ان یخرج شیئاً من ید احد، (ص ۳۵)	امام (حکومت) کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ کسی کے قبضہ اور ملک سے زمین کو چھین لے،

اسی دفعہ کی تعبیر دوسرے الفاظ میں دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں،

فلا یحل للامام ولا یسعہ ان یقطع من الناس حق مسلم ولا معاہد ولا یخرج من ید لا من ذالک شیئاً،	امام حکومت کے لئے جائز نہیں ہے، اور نہ قانوناً اس کے لئے اس کی گنجایش ہے، کہ کسی مسلمان یا جس سے اسلامی حکومت نے معاہدہ کیا ہو، کہ اس کے حق کو اس سے منقطع کرے، اور نہ یہ کر سکتا ہے، کہ اس کے قبضہ سے کوئی چیز نکالے

دوامی بندوبست یعنی یہ حکم حکومت کی مسلم غیر مسلم ہر قوم کی رعایا کے لئے عام ہے، گویا ان زمینوں کی حیثیت بندوبست دوام کی ہوجاتی ہے، اور جاگیردار کو اختیار ہے کہ خواہ خود اس کو آباد کرے یا کسی اور ذریعہ سے آباد کرائے قاضی صاحب لکھتے ہیں،

فمن احیاها وهی کذالك فهی له ویزرعها ویزارعها ویواجرها ویکری منها الانهار ویعمرها بما فیه مصلحتها، (ص ۳۷)	جس نے اس زمین کو آباد کیا ہو، اور وہ اس حال میں ہو تو اس زمین کا مالک اس کا آباد کرنے والا ہوگا، اسے حق ہے کہ اس میں خود کاشت کرے یا کسی سے کاشت کرائے، یا کسی کو کرایہ پر دے، اسے اس کا بھی حق ہے، کہ اپنی زمین میں نہر کھودے، اور اس کا بھی کہ جس قسم کی عمارت اور آبادی جس میں مصلحت ہو، بنائے

البتہ اس پر حکومت کی جو مالگذاری عائد کی گئی ہو، صرف اس کا ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے،

فان کانت فی ارض العشر ادی	اگر اوس کی یہ زمین عشر کی زمین ہو، تو
عنھا العشر و ان کانت فی ارض	اس سے عشر ادا کرے گا، اور اگر خراجی
الخراج ادی عنھا الخراج،	زمین ہو تو اوس سے خراج ادا کرے گا،

تحجیر کا مطلب اور حکم | عشر و خراج کی عدم ادائیگی کی صورت مین حکومت اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے، اس کی تفصیل مناسب موقع پر آگے آتی ہے، یہان یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ کسی غیر آباد زمین کے حدود مین صرف پتھر نصب کرکے یا کانٹون وغیرہ سے گھیر کر اس کو اپنی مملوکہ زمین قرار دینا صحیح نہین ہے، فقہاء مین اس عمل کا نام تحجیر ہے، چونکہ یہ زمین کا احیار نہین ہے، اس لئے ملکیت تو پیدا نہ ہوگی، البتہ بہ نسبت دوسرون کے اس کے حق کو گونہ ترجیح ہوگی، مگر وہ بھی ایک خاص مدت تک جس کی تفصیل فقہ کی کتابون مین موجود ہے، مندرجۂ بالا بیانات سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے، کہ اسلام نے اپنی حکومت کی رعایا کی معاشی سہولتون کے کتنے ذرائع پیدا کر دیئے ہین، آج جب کہ دنیا مین کوئی ایک انچ زمین پر بھی بلامعاوضہ مفت قبضہ نہیں کرسکتا، اس سے اس وقت کا اندازہ لگانا چاہئے، اور اس لئے مین نے اس سلسلہ مین تھوڑی تفصیل سے کام لیا، کیونکہ اسلامی حکومت کا نظام جب سے ناپید ہوگیا ہے، لوگ ان واقعات کو بھول گئے ہین، ورنہ سچ یہ ہے کہ ہندوستان تک مین حکومتِ مغلیہ کے آخری دور تک زیادہ تر اس قسم کی معاشی سہولتین آبادکارون کو حاصل تھین،

بہرحال یہ احکام تو غیر مملوکہ امور کے متعلق تھے، اب بحث ان چیزون پر کرنی چاہئے جو کسی کی ملک مین داخل ہین، مین نے کہا تھا کہ اس کی بھی دو صورتین ہین، مالک کی مرضی کے بغیر ان پر قبضہ کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے یا نہین، پھر ایسی مملوکہ چیزین جن پر مالک کی مرضی کے بغیر بھی قبضہ کرکے ان کو اپنا مملوک بنایا جاسکتا ہو اس کی بھی اسلام مین دو شکلین ہین،

مالک کی مرضی کے بغیر کسی چیز پر قبضہ کرنا

(۱) اسلامی حکومت کی رعایا کا اگر مال ہو تو مالک کی مرضی کے بغیر صرف دو شکلون مین ان پر قبضہ کرنے کی اجازت ہے، ایک کی فقہی تعبیر لقطہ ہے،

لقطہ کا مطلب یعنی گرا پڑا ہوا مال اگر کسی کا مل جائے بعض صورتون مین یہ جائز ہے، کہ آدمی اوس پر قبضہ کرے، اور خاص شروط وحالات مین اس کو اپنے تصرف مین بھی لا سکتا ہے، لیکن جب کبھی اصل مالک کا پتہ مل جائے اور وہ اوس کا مطالبہ کرے تو معاوضہ ادا کرنا پڑے گا، چونکہ اس باب کا تعلق معاشیات سے نہین ہے، کہ یہ آمدنی کی نہایت نادر شکل ہے، اس لئے اس کے تفصیلات کی یہان ضرورت نہین،

قانون شفعہ دوسری شکل شفعہ کی ہے، یعنی مالکانہ شرکت یا پڑوس کی وجہ سے اسلام نے ملک کے ہر باشندے کو یہ قانونی حق دیا ہے، کہ آدمی دوسرے کی خریدی ہوئی چیز کو زبردستی دام ادا کرکے اپنی ملک بنالے، مثلاً کسی مکان یا زمین مین دو آدمی یعنی زید وعمرو شریک ہین، اگر عمرو کے حصہ کو خالد خریدے تو زید کا یہ قانونی حق ہے، کہ جس دام مین خالد نے اس کے شریک کے حصہ کو خریدا ہے، ادا کرکے خالد کی رضامندی ہو یا نہ ہو، خریدلے، قانون اس جبری خریداری کو نافذ کرائے گا، معلوم نہین اس باب مین دنیا کے اور قوانین کا کیا حال ہے، لیکن اس قانون کی وجہ سے اسلامی حکومت کی رعایا کو دکانون، کھیتون، باغون وغیرہ کے متعلق کتنی آسانیان بہم پہنچتی ہین، اور پہنچ سکتی ہین، اس کا اندازہ تجربہ سے ہو سکتا ہے، خصوصاً حنفی مذہب مین اس قانون کو ملکی شرکت سے آگے بڑھا کر مرافق (مثلاً راستہ ذرائع آبپاشی وغیرہ) کی شرکت اور جوار (پڑوس) کی شرکت تک وسیع کردیا گیا ہے، فقہ کا یہ ایک طویل باب ہے، میرے لئے اس سلسلہ مین صرف اتنا بیان ہی کافی ہو سکتا ہے،

غیر اسلامی حکومتون کی رعایا کیساتھ مسلمانون کے معاشی تعلقات

(۲) غیر اسلامی حکومتون کے باشندون کے مملوکات پر مالکون کی رضامندی کے بغیر قبضہ کرکے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے ہین، اسی طرح غیر اسلامی حکومتون کے باشندون کے بھی اس حق کو اسلام نے قانونی حق قرار دیا ہے، یعنی اسلامی حکومت کے باشندون

کے اموال پر العیاذ باللہ[1] اگر ان کا قبضہ ہو جائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہو جاتے ہین، دراصل اس دفعہ کا تعلق قانون جنگ سے ہے، اس سلسلہ مین غنیمت، فئی، متعلقات فئی وغیرہ کی آمدنیان ہین علاوہ ان عطایا و وظائف وغیرہ کے جو اسلامی فوجون کو حکومت سے ملتے تھے، چونکہ لڑنے والے ہر سپاہی کو غنیمت سے بھی حصہ ملتا تھا، اس لئے مسلمانون مین آمدنی پیدا کرنے کا یہ بھی ایک بڑا آسان، اور قیمتی ذریعہ تھا، اور ان کی معاشی فراغبالیون پر اس قانون کا کافی اثر مرتب ہوتا تھا، چونکہ اس آمدنی کا تعلق معمولی کاروبار سے نہین ہے، بلکہ اوسکی اکثر شکلون کا تعلق حکومت سے ہے، اس لئے اس باب کی بھی تفصیل کی یہان حاجت نہیں، البتہ اسی بین الاقوامی قانون کی بنا پر کہ شریعت میں چونکہ یہ طے کر دیا گیا ہے، کہ اسلامی حکومت کی رعایا کا مال غیر اسلامی حکومتون کے باشندون کے لئے مباح اور جائز ہے، یعنی قبضہ کرنے کے بعد ان کی ملک مین داخل ہو جاتا ہے، اور ان سے اگر کوئی مسلمان اس مال کو خریدے، تو یہ قانونی مالک سے مال کا خریدنا ہو گا، اسی لئے اس کا لینا جائز ہوگا،

غنیمت وفے کی حلت کی وجہ پھر جس طرح مسلمانون کا مال غیر اسلامی حکومتون کے باشندون کی ملکت میں صرف قبضہ سے داخل ہو جاتا ہے، اسی طرح اسلامی حکومتون کے باشندون کے لئے غیر اسلامی حکومتون کے باشندون کا بھی مال مباح وجائز ہے، یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے قانونی مالک ہو جاتے ہین، غنیمت (یعنی غیر اسلامی حکومت کے لوگون سے جو مال بزور حاصل کیا جائے) اور فئی (جو مال غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندون کا بغیر کسی جنگ و جدال کے مسلمانون کے قبضہ مین آجائے) ان دونون قسم کے اموال کے قانونی مالک مسلمان اسی بنا پر ہو جاتے ہین، کہ ان لوگون کے اموال کو اسلام نے مسلمانون کے لئے مباح

---

[1] العیاذ باللہ کا لفظ مین نے اپنے فقہار کی تقلید مین لکھا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ مسلمانون پر ایک وہ وقت بھی گذرا ہے، جب غیر اسلامی اقوام کے تسلط کو اپنے اوپر ناقابل برداشت تصور کرتے تھے، پھر آسمان نے رُخ بدلا، اور جس کا سوچنا بھی ناگوار تھا، اسے دیکھنا پڑا اور کیسا دیکھنا؟

اور جائز قرار دیا ہے،

غیر اسلامی ممالک میں سود، قمار وغیرہ کا حکم اسی مسئلہ کی بنیاد پر ایک اور معاشی سوال یہاں پیدا ہو گیا، یعنی غیر اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم باشندہ کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رو سے لین دین کا قانونی اور شرعی ذریعہ نہیں ہے، مثلاً ربوا (سود) یا قمار یا ازین قبیل کسی اور غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ میں آجائے، تو کیا قانوناً یہ مسلمان اس کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں،

چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے، اور مباح و جائز مال کے مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے، مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کر کے قبضہ کر لینا اس پرندے کے مالک ہونے کے لئے کافی ہے، اس لئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس قسم کے اموال کا مسلمان قانونی طور پر مالک ہو جاتا ہے، اور یہی ان کا وہ مشہور نقطۂ نظر ہے، جس کی وجہ سے حنفی فقہ کی عام کتابوں میں

لا ربوا بین الحربی والمسلم الحربی (غیر اسلامی حکومت کا باشندہ) اور المسلم (اسلامی حکومت کا باشندہ) میں ربوا (سود) نہیں ہے،

کا ذکر پایا جاتا ہے، گویا یہ بین الاقوامی قانون کی ایک دفعہ ہے، عوام چونکہ اس کے اصل منشار سے واقف نہیں ہیں، اس لئے ان کو حیرت ہوتی ہے، کہ ربوا (سود) جب اسلام میں حرام ہے، تو ہر جگہ ہر شخص سے لینا حرام ہو جانا چاہئے، حربی یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کے جائز ہونے کے کیا معنی؟ مگر سچی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ ربوا کا معاملہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایک مباح مال کو قبضہ کر کے اُسے اپنی ملک بنانا ہے، اس قانون سے پہلے ایک اور قانون کا ذکر کتابوں میں عموماً کیا جاتا ہے کہ

لا ربوا بین العبد والمولی، یعنی درمیان غلام اور اس کے آقا کے ربوا (سود) کا معاملہ نہیں ہے،

یعنی شرعی غلام اور آقا کے درمیان بھی اگر ربوا کا معاملہ کیا جائے گا، تو وہ ربوا نہ ہوگا، یہ بھی امام ابوحنیفہ کا

مذہب ہو ظاہر ہے کہ اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے، کہ باوجود ربوا اور سود ہونے کے امام نے اس کو حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے، بھلا اس کا حق ایک مجتہد کو کیا ہے، بلکہ بات وہی ہے کہ قانوناً غلام کا مال آقا ہی کا ہے پس آقا نے غلام سے جو کچھ لیا وہ اس کا مال نہیں اپنا مال لیا، اور اپنا مال کسی پر کیون حرام ہو سکتا ہو اس کی مثال ایسی ہو کہ آدمی اپنی آمدنی کی مختلف مدون کو مختلف مصارف کے لئے معین کر دیتا ہے، لیکن بسا اوقات کسی ایک ضرورت کے لئے دوسری مد کی آمدنی سے قرض کے نام سے لے لیتا ہے، فرض کیجئے کہ اگر اس قرض مین وہ کچھ سود بھی لگا کر اس مدین جمع کر دیا کرے جس سے اوس نے قرض لیا تھا، تو کیا واقعی لفظ سود سے وہ سود ہو جائے گا، اس نے تو اپنے ہی روپے کو اپنے مال مین ملایا، ہو خواہ کسی نام سے ملائے، قانوناً شرعاً کوئی اس کو سود نہیں کہہ سکتا، اور یہی وجہ ہو کہ ہندوستان میں جہاں اس وقت اسلامی حکومت قائم نہیں ہے، یہان کے

ہندوستان مین مسئلہ ربوا (سود) کا حکم | غیر مسلم باشندون سے بعض حنفی علما[1] سودی کاروبار کے جواز کا فتوی دیتے ہین، بعض غیر قانونی دماغون کو یہ شبہہ ہوتا ہے، کہ اگر اس جواز کی بنا اس پر ہے، کہ غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کا مال مسلمانون کے لئے مباح ہے، تو پھر اس ملک میں فریب چوری ڈاکہ وغیرہ جو شرعاً لین دین کے ناجائز ذرائع ہین، کیا ان ذرائع سے بھی مسلمانون کو غیر مسلمون کا مال لینا جائز ہوگا، ؟ حالانکہ جہان یہ مسئلہ فقہ حنفی مین لکھا گیا ہے، وہین دوسرا فقرہ "من غیر غدر" (یعنی خلاف معاہدہ) لین دین نہ ہو، کی قید بھی بڑھی ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوستان مین جو حکومت قائم ہے، اس کے قانون مین فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ کے ذریعہ سے لین دین کو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے، اور اس ملک مین جو

---

[1] جس مین سب سے نمایان شخصیت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، شاہ صاحب کے فتاوی عزیزیہ مین یہ فتوی ایک سے زیادہ مقام مین موجود ہو، یہان یہ بھی غور کرنے کا مقام ہو کہ شاہ صاحب نے یہ فتوے اس وقت صادر کئے تھے، جب لال قلعہ مین تیموری سلاطین نام نہاد شاہ ہند کے نام سے موجود تھے، لیکن عملاً چونکہ ان کی حکومت ختم ہو چکی تھی، اس لئے شاہ صاحب نے حنفی فقہ کے اس معاشی مسئلہ کا عام اعلان سرزمین ہند مین کر دیا تھا،

مسلمان آباد ہین، وہ اس معاہدہ کے ساتھ ہی آباد ہین، کہ حکومتِ وقت کے قانون کی خلاف ورزی نہ کرینگے، اب اگر چوری ڈاکہ یا فریب وغیرہ ذرائع سے ملک کے کسی باشندے کا روپیہ کوئی لے گا، تو غدر (عہد شکنی) کے اسلامی جرم کا وہ مرتکب ہی، بخلاف ربوا (سود) کے کہ موجودہ حکومت نے اس ذریعہ سے لین دین کو ناجائز نہین قرار دیا ہے، پس یہ حکومت وقت کے ساتھ غدر (عہد شکنی) نہین ہے، اور بغیر کسی عہد شکنی کے مسلمان کے قبضہ مین جب اس ملک کے غیر مسلم باشندہ کا روپیہ آئے تو معًا قبضہ کے ساتھ ہی وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے، امام ابو حنیفہ کا یہ اتنا مستحکم قانونی نقطۂ نظر ہے کہ اس قسم کے اموال کی حرمت کی کوئی دلیل شرعی پیش کرنا مشکل ہے، میرا مطلب یہ ہی کہ ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے اموال کے عدم اباحت کی دلیل پیش کرنا آسان نہین ہے، چہ جائیکہ ان کی حرمت کا دعویٰ[1]؟ اور یہی اس معاشی مسئلہ کی بنیاد ہے، افسوس کہ علمائے اسلام نے اسلام کے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہین کیا، ورنہ ادھر سو ڈیڑھ سو سال مین مسلمان جن معاشی دقتون مین مبتلا ہوگئے، غالبًا صورتِ حال یہ نہ ہوتی، ملک کے باشندون کا ایک طبقہ صرف لیتا رہا، اور دوسرا طبقہ صرف دیتا رہا، اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک مین پیدا ہو گیا ہے، اس کی ذمہ داری اسلام پر نہین، بلکہ زیادہ تر علماء پر اس لئے ہی کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورتِ حال کا علاج موجود تھا، لیکن اونھون نے ایک جزو پر عمل کیا، اور دوسرے کو ترک کر دیا، اور اب تو شاید مرض لا علاج ہو چکا ہی،

اس مسئلہ کا ذکر چاہئے تو یہ تھا کہ مین سود کے باب مین کرتا، جیسا کہ عمومًا فقہ کی کتابون میں کیا گیا ہی، لیکن سچی بات یہ ہی کہ اس کا تعلق ربوا کے باب سے نہین ہی، بلکہ بین الاقوامی معاشی تعلقات کا یہ ایک قدرتی نتیجہ ہے، اسی لئے بات بآسانی سمجھ مین آجاتی ہے، بخلاف اس باب کے جہان خود مسلمانون کے باہمی مالی و معاشی معاملات سے بحث کیجاتی ہی، غیر موزون مقام پر درج ہونے کی وجہ سے امام صاحب کا صحیح نقطۂ نظر لوگون کے

---

[1] اسی لئے ان لوگون سے جو اس مسئلہ مین امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کا انکار کرنا چاہتے ہین، میرا مطالبہ ہی کہ قرآن وحدیث، اجماع، قیاس الغرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کے عدم اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہون تو پیش کرین۔

سامنے نہین آتا، بہرکیف مذکورۂ بالا چند استثنائی صورتون کے سوا باہمی لین دین کو قرآن نے

عن تراض منکم — باہمی رضامندی سے لین دین ہو،

پر مبنی کیا ہے یعنی کوئی کسی کے مال کو اس کی مرضی کے بغیر اپنی ملک نہین بنا سکتا، اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فقہاے اسلام نے تمام معاشی ابواب کے آئین کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، ظاہر ہے کہ لین دین مین باہمی "مراضاۃ" کی شرط تقریبًا تمام متمدن اقوام کے قوانین مین مسلّم ہے، چوری، ڈاکہ، فریب، دھوکا، غصب وغیرہ کو جرم اسی بنا پر قرار دیا گیا ہے، کہ ان تمام شکلون میں مالک کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے،

لیکن اسلام نے اس عام قانون کے سوا "مالی معاملات" (مال کے لین دین) کے متعلق چند اور امور کا اضافہ بھی کیا ہے، جن مین پہلی اصل تو وہ ہے جس کا ذکر قرآن مین

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل، — باطل طریقہ سے باہم ایک دوسرے کا مال نہ کھایا کرو۔

کے الفاظ مین کیا گیا ہے، اور دوسری اصل قرآن ہی مین

لا تظلمون ولا تظلمون — نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے،

کے دو مختصر لفظون مین مذکور ہی، ہم اس وقت ان ہی دو اصول اور ان کے نتائج پر بحث کرنا چاہتے ہین کہ "اسلامی معاشیات" کی تصحیح وارتقا مین ان دو قاعدون کو میرے خیال مین بہت زیادہ دخل ہی،

اکل بالباطل کا مطلب پہلی بات یعنی باہم ایک دوسرے کا مال بالباطل نہ کھایا جائے، پہلے اس کے مفہوم کو سمجھ لینا چاہئے، مثال سے اس کو یون ذہن نشین کیا جا سکتا ہے، مثلاً ایک شخص آپ کا کوئی کام کرکے یا آپ کو اپنی کوئی چیز دے کر یا اپنی چیز سے آپ کو نفع اٹھانے کا موقع دے کر اگر آپ سے آپ کا مال لیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ آپ پر اپنا ایک حق قائم کرنے کے بعد اس کے معاوضہ مین آپ کا مال لے رہا ہے لیکن اس کے مقابلہ مین کوئی حق قائم کئے بغیر اگر آپ کا مال لینا چاہتا ہے، تو یہی اکل بالباطل ہے یعنی بغیر کسی حق کے

آپ کا مال لے رہا ہے، یہ تو الفاظ کا مطلب ہوا، اب ظاہر ہے کہ دنیا مین کاروبار کی ساری سرگرمیان اسی مبنی ہین کہ ہر شخص ایک دوسرے کی ضرورت کو پوری کر رہا ہے، اگر اسی شکل کو یک طرفہ کر دیا جائے یعنی دینے والون کو لینے والون سے کچھ نہ ملے، تو نہ زراعت چل سکتی ہے، نہ تجارت، نہ حرفت، نہ صنعت جب معاوضہ ادا کئے بغیر لوگون کو زندگی کی ضروریات ملنے لگین گی تو پھر خواہ مخواہ معاوضہ کے مہیا کرنے کی فکر مین کوئی کیون مشغول ہوگا، نتیجہ یہ ہوگا، کہ ملک کے باشندون کی توانائیون کا ایک بڑا حصہ دنیا مین آکر اپنی قیمت حاصل کئے بغیر قبر مین دفن ہوتا چلا جائے گا، نیز ان کے دل و دماغ اور عملی جد و جہد سے ملک کو اپنے معاشی ارتقار مین جو مدد مل سکتی تھی، اس سے وہ محروم ہو جائے گا،

گداگری کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر

یہی وہ بنیاد ہے کہ گو دنیا کے اکثر حصون مین گداگرون اور سائلون کو صرف یہی نہین کہ مجرم نہین سمجھا دیا جاتا تھا، بلکہ بعض علاقون مثلاً ہندوستان مین عظمت و احترام کی آخری بلندیون پر یہی لوگ قابض تھے، اور اب تک ہین، جن کا گذارہ بھکشا اور دان پُن پر ہے، سمجھا جاتا ہے کہ یہ بڑی نیکی اور پُن کی بات ہے، لیکن معاشی نقطۂ نظر سے یہ کتنا بڑا خسارہ ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، اسلام نے صرف یہی نہیں کہ کھاتے پیتون کے لئے سوال کو جرم قرار دیا ہو، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ

من سال الناس عن ظھر غنی فانما	باوجود غنی ہونے کے جو لوگون سے بھیک مانگتا
یستکثر من جمر جھنم (صحاح)	ہو وہ جہنم کے انگارے جمع کر رہا ہے،

یعنی باوجود غنا و استطاعت کے جو بھیک مانگتا ہے، وہ جہنم کے انگارون کو اکٹھا کر رہا ہے، اور غنا سے بھی مراد یہ نہین ہے کہ کافی دولت و ثروت رکھتا ہو، بلکہ اسی حدیث مین ہے کہ پوچھنے والے نے دریافت کیا

یارسول اللہ ما ظھر غنی	غنی کا یارسول اللہ کیا مطلب ہو،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے جواب مین جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانون کے لئے باعث عبرت ہے، ارشاد ہوا،

ان یعلم ان عند اهله ما یغدیهم وما یعشیهم،	جو یہ جانتا ہے کہ اس کے گھر مین اتنا سرمایہ ہو کہ جس کے ذریعہ سے صبح و شام کی غذا مہیا ہو سکتی ہے،

خواہ وہ کسی شکل مین مہیا ہو سکتی ہو، مثلاً جو یا جواری، یا جرہ کی روٹی ہی کیون نہ ہو، بہرحال اتنے معمولی سرمایہ رکھنے والے کے لئے بھی اسلام نے سوال کو قطعاً حرام کر دیا ہے، اور اگر کسی کے پاس مالی سرمایہ نہ ہو، لیکن ہاتھ پاؤن کا سرمایہ اور اتنی قوت رکھتا ہو کہ کما کر کھا سکے، اس کے متعلق بھی ارشاد ہے

لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی،	صدقہ حلال نہین ہو صاحب غنا کے لئے اور نہ مضبوط توانا کے لئے،
لا حق فیها لغنی ولا لقوی مکتسب	صدقہ مین حق نہ کسی غنی کا ہے، اور نہ کمانیوالے توانا آدمی کے لئے اس مین (صدقہ مین) حصہ ہے

بہرحال بجز چند مخصوص صورتون کے جن کی فقہانے تشریح کر دی ہے، ملک کے ہر باشندے پر جس مین کسی قسم کی بھی مالی یا بدنی صلاحیت ہو، عموماً اسلام نے سوال کو حرام کر دیا ہے، اور اس سے یہی غرض ہے کہ اس قسم کی تمام قوتین ملک کے معاشی ارتقاء مین اپنی اپنی وسعت کی حد تک ہاتھ بٹائین، ان نتائج مین مسلمانون کو کون کہہ سکتا ہے،

تندرست و توانا آدمی کو بھیک دینا بھی ناجائز ہے

ان کو شاید معلوم نہین کہ اسلام مین لینے والون ہی پر عموماً بھیک حرام نہین ہے، بلکہ فقہاء کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ مذکورہ بالا صفات یعنی کم از کم مالی یا بدنی صلاحیت رکھنے والون کو بھیک دینا بھی ناجائز ہے، علامہ ابن نجیم حنفی نے الاشباہ والنظائر مین مذکورہ بالا صورتون کے متعلق لکھا ہے،

ان السائل والمعطی آثمان،	بھیک مانگنے والے اور بھیک دینے والے دونون مجرم ہین،

سائل اور گداگر کے مجرم ہونے کی وجہ تو ظاہر ہی ہے لیکن دینے والون کو مجرم کیون قرار دیا جاتا ہی؟ اسکی وجہ اونھون نے لکھی ہے،

فلکونه معیناً علی الحرام،	اس نے حرام مین مجرم کی مدد کی،

اگرچہ بعض علماء کو اوس سے اختلاف ہے، مولانا انور شاہ صاحب کشمیری نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ

لو علم المعطی ان السائل	اگر دینے والا یہ جانتا ہو کہ سوال کرنے والا
لا یتخذه کسباً فلا اثم علیه	اس کو اپنا پیشہ نہ بنائے گا، تو ایسے دینے والے
ولو علم انه یتخذه کسباً	کو گناہ نہ ہوگا، اور اگر یہ جانتا ہو، کہ
ویتعاد السوال فهو آثم ایضاً	وہ بھیک کو اپنا پیشہ بنالے گا، تو دینے والا
(العرف الشذی ص ۲۹۱)	بھی گنہگار ہوگا،

(باقی)

---

۵ گداگری کے متعلقہ مسائل کی تھوڑی اور تفصیل آیندہ بھی اپنے مقام پر آنے والی ہے "فلینتظر"

موفق الدین عبداللطیف بغدادی

از

مولانا عبدالسلام ندوی

کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کی ایک روایت کا ماخذ عبداللطیف بغدادی کی ایک تاریخی کتاب "کتاب الافادہ والاعتبار فی الامور المشاہدۃ والحوادث المعاینۃ بارض مصر" بھی ہے، اور اس لحاظ سے اس مسئلہ کی تحقیق میں ان کا نام ردًّا و قبولاً بار بار آیا ہے، لیکن بہت کم لوگ ہیں، جو ان کے مفصل حالات سے واقف ہیں، حالانکہ ایک اہم اور مختلف فیہ واقعہ کے راوی ہونے کی حیثیت سے ان کے حالات خاص طور پر دلچسپ ہو سکتے تھے، لیکن اس خاص واقعہ کو چھوڑ کر بھی ان کے حالات دوسری مختلف حیثیتوں سے بھی دلچسپ ہیں،

فلسفہ، اسلام کی تاریخ میں پانچویں اور چھٹی صدی کا زمانہ نہایت اہمیت رکھتا ہے، اس زمانہ میں شیخ بو علی سینا کی عام شہرت نے دوسرے فلاسفہ کو تقریبًا گمنام کر دیا تھا، کچھ لوگ شیخ الاشراق کے بھی معتقد تھے لیکن ابو نصر فارابی کو لوگوں نے بالکل بھلا دیا تھا، اور قدماء کی کتابوں کو تو کوئی شخص آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا لیکن بعض اشخاص ایسے بھی تھے، جو ابو نصر فارابی اور قدماء کی کتابوں سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے، اور شیخ بو علی سینا کے مخالف تھے، ابتداءً میں موفق الدین عبداللطیف بغدادی بھی شیخ بو علی سینا کے سخت معتقد تھے، لیکن بعد کو اسی قسم کے ایک بزرگ سے اُن کی ملاقات ہوئی، تو بحث و مباحثہ کے بعد ان کے قدیم خیالات بالکل بدل گئے، اور معلوم ہوا کہ تمام دنیا کو شیخ بو علی سینا اور شیخ الاشراق نے گمراہ کر رکھا ہے، اصلی فلسفہ قدماء کی کتابوں میں ہے، اس لحاظ

سے فلسفۂ اسلام کی تاریخ پر چونکہ ان کے حالات سے روشنی پڑتی ہے، اس لئے وہ خاص طور پر دلچسپی کا موجب ہو سکتے ہین،

وہ ۵۵۷ھ مین بغداد مین پیدا ہوئے، اور شیخ ابو النجیب کے دامن مین تربیت پائی، خوش قسمتی سے ان کا خاندان علوم عقلیہ ونقلیہ دونون کا جامع تھا، ان کے والد یوسف علوم شرعیہ یعنی قرآن، حدیث، اصول فقہ اور علم کلام کے ساتھ کسی قدر علوم عقلیہ سے بھی واقف تھے، اور ان کے چچا سلیمان بھی بہت بڑے فقیہ تھے لیکن چونکہ اس خاندان مین غلبہ علوم شرعیہ کا تھا، اس لئے بچپن مین شیخ موفق الدین کی ابتدائی تعلیم حدیث سے شروع ہوئی، لیکن اسی زمانہ مین وہ لکھنا بھی سیکھتے تھے، قرآن مجید، فصیح، مقامات، اور دیوان متنبی بھی حفظ کرتے تھے اور ایک مختصر کتاب فقہ کی اور ایک مختصر کتاب نحو کی بھی پڑھتے تھے، جب بڑے ہوئے تو ان کے والد ان کو شیخ کمال الدین عبد الرحمن الانباری کی خدمت مین لے گئے، جو اس وقت بغداد کے شیخ اور ان کے پرانے دوست تھے، اونھون نے اُن سے فصیح کا خطبہ پڑھنا شروع کیا، لیکن ان کی طویل تقریر کا ایک حرف بھی نہ سمجھے، البتہ اون کے اور تلامذہ ان کی تقریر کو نہایت پسند کرتے تھے لیکن شیخ کمال الدین انباری نے خود کہا کہ مین بچون کو تعلیم نہین دیتا، بلکہ ان کو اپنے شاگرد وجیہ الواسطی کے سپرد کر دیتا ہون، جب ان کی تعلیم سے وہ متوسط درجہ کی قابلیت حاصل کر لیتے ہین، تو خود تعلیم دیتا ہون،

وجیہ واسطی ایک نابینا اور دولت مند شخص تھے، اور بعض رئیسون کے بچون کو تعلیم دیتے تھے، انھون نے نہایت خوشی سے ان کو ہاتھون ہاتھ لیا، اور صبح سے شام تک نہایت لطف ومحبت کے ساتھ تعلیم دیتے رہے، وہ مسجد ظفریہ مین اُن کے حلقۂ درس مین شریک ہوتے تھے، اور وہ ان کو تمام کتابون کے درس مین شرکت کا موقع دیتے تھے، پھر خاص طور پر ان کی درسی کتابین پڑھاتے تھے، مسجد سے نکلنے کے بعد راستے مین بھی بحث ومذاکرہ جاری رکھتے تھے، پھر جب ان کے گھر پہونچتے تھے، تو وہ خود اپنی درسی کتابین نکالتے تھے، اور عبد اللطیف بغدادی بھی اون کے ساتھ ان کو یاد کرتے تھے، پھر وہ شیخ کمال الدین کے پاس جاکر اپنی درسی کتابین پڑھتے تھے

توعبداللطیف بغدادی بھی ان کو سنتے تھے، یہان تک کہ حفظ وفہم مین ان سے بھی بڑھ گئے، اب جس قدر ان کی علمی قابلیت بڑھتی جاتی تھی، وہ ایک اوستاد کو چھوڑ کر دوسرے استاد کی خدمت مین جاتے تھے، اور ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے، اس طرح اونھون نے جو کتابین پڑھین یا ان کو حفظ کیا، یا ان کے مطالعہ مین رہین ان کے نام یہ ہین، اللمع، شرح التنوائین، شرح الشریف عمر بن حمزہ، شرح ابن برہان، ادب الکاتب، تقویم اللسان، مشکل القرآن، غریب القرآن، ایضاح ابو علی فارسی اور اوسکی شرحین، تکملہ، مقتضب للمبرد، کتاب ابن درستویہ، نحو، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، زہد اور تصوف مین شیخ کمال الدین کی ۱۳۰ کتابین، کتاب سیبویہ، کتاب الاصول لابن السراج، فرائض، عروض للخطیب التبریزی، معانی زجاج، علم حدیث مین ان کے شیخ ابو الفتح محمد بن عبد الباقی المعروف بابن البطی، ابو زرعہ طاہر بن محمد المقدسی، ابو القاسم یحیی بن ثابت الوکیل وغیرہ تھے، اور اُن سے اونھون نے بچپن مین علم حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی، اس کے بعد اونھون نے شیخ ابن فضلان سے حدیث اور فقہ پڑھی، اور شیوخ بغداد، شیوخ خراسان، شیوخ شام، اور شیوخ مصر سے علم حدیث کی سند حاصل کی،

منطق وفلسفہ مین ان کے اساتذہ کا نام نہین معلوم ہوتا، اونھون نے اپنے اساتذہ مین امین الدولہ ابن التلمیذ کے ایک لڑکے کا نام لیا ہے، اور چونکہ وہ عیسائی تھا، اس لئے لازمی طور پر اوس سے علم طب یا دوسرے علوم حکمیہ کی تعلیم حاصل کی ہوگی، لیکن عقلی علوم کی طرف جس طرح ان کا میلان پیدا ہوا، اوسکی تاریخ اونھون نے خود یہ بیان کی ہے، کہ بغداد مین ایک مغربی شخص صوفیانہ وضع مین آیا، جو ابن ناتلی کے نام سے مشہور تھا، اور اپنے آپ کو لمتین کی اولاد مین شمار کرتا تھا، اور مغرب پر عبد المومن کے تسلط واقتدار کے بعد وہان سے نکل بھاگا تھا، جب اوس نے بغداد مین قیام کیا، تو اوس کے حسن تقریر، اوسکی وجاہت، اور مذہبی حالت نے لوگون کو گرویدہ کرلیا، اور اکابر واعیان کی ایک جماعت اوس سے ملنے کے لئے آئی، مین بھی اوسکی خدمت مین حاضر ہوا، اور اس سے مقدمۂ حساب اور نحو مین مقدمہ ابن بابشاذ پڑھا، اوس کا طریقہ تعلیم

ایسا عجیب تھا کہ لوگ اوس کو بڑا ماہر فن سمجھتے تھے لیکن درحقیقت وہ سطحی معلومات رکھتا تھا، البتہ کیمیا اور طلسمات وغیرہ کی کتابون کا خوب مطالعہ کیا تھا، اور ابن وحشیہ اور جابر کی تمام کتابین چھان ڈالی تھین اور اپنی شکل وصورت اور گفتگو سے لوگون کے دلون کو اپنی طرف مائل کرلیتا تھا، اس نے میرے دل کو تمام علوم کے شوق سے لبریز کردیا، اس کے بعد وہ تو خود چلا گیا، لیکن مین ہمہ تن تحصیل علوم مین مشغول ہوگیا، اور امام غزالی کی کتابون یعنی مقاصد الفلاسفہ، معیار، میزان اور محک النظر کا مطالعہ کرنا شروع کیا، پھر شیخ بوعلی سینا کی تمام چھوٹی بڑی کتابون کی طرف متوجہ ہوا، اور کتاب النجاۃ حفظ کرڈالی، اور شفا کو اپنے ہاتھ سے لکھا، شیخ بوعلی سینا کے شاگرد بہمن یار کی کتاب التحصیل پڑھی، اور جابر بن حیان صوفی اور ابن وحشیہ کی کتابین بھی پڑھین، اور کیمیا سازی کرنے لگا، اس گمراہی مین مجھکو سب سے زیادہ شیخ بوعلی سینا کی اوس کتاب نے مبتلا کیا جو اوس نے فن کیمیا میں لکھی ہے، اور اس سے اپنے فلسفہ کی تکمیل کی ہے،

۵۸۵ھ تک اون کی تحصیل علمی کی یہ سرگذشت ہے، اوس کے بعد بغداد مین ان کو کوئی قابل اعتماد اوستاد نظر نہین آیا، اس لئے وہ موصل مین چلے آئے، اور یہان بھی ان کی تمنا پوری نہین ہوئی، یہان صرف کمال بن یونس ایک شخص تھے، جو فقہ اور ریاضیات کے تو ایک جید عالم تھے، باقی حکمت کی اور شاخون سے معمولی واقفیت رکھتے تھے، لیکن وہ اپنا دماغ اور وقت صرف کیمیا سازی مین صرف کرتے تھے، اور اس کے علاوہ ہر چیز کو ہیچ سمجھتے تھے، یہان ایک بہت بڑی جماعت نے شیخ عبداللطیف بغدادی سے ملاقات کی، اور ان کے سامنے بہت سے مناصب پیش کئے، لیکن ان مین اونھون نے مدرسہ ابن المہاجر المعلقہ اور اس کے ماتحت دارالحدیث کی خدمت کو اختیار کیا، اور ایک سال تک شب وروز اس مین مصروف رہے، اور اہل موصل پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا، یہان اونھون نے شیخ شہاب الدین سہروردی کی فلسفہ دانی کا غیر معمولی شہرہ سُنا، تو ان سے ملنے کا قصد کیا، لیکن ان کے یہان جانے سے پہلے اونھون نے کمال بن یونس سے جو ان کے معتقدین مین تھے، ان کی چند کتابین لین اور تلویحات، لمحہ اور معارج

مطالعہ کیا، لیکن ان کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ دنیا جہالت میں مبتلا ہے، اس کے بعد وہ دمشق میں آئے، تو وہاں
عیان بغداد اور دوسرے شہروں کے علماء کی ایک بہت بڑی جماعت نظر آئی، جس کو سلطان صلاح الدین
ی فیاضی اور قدر دانی نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا، ان میں بعض لوگوں سے اونھوں نے مناظرے کئے، اور
ن پر غالب آئے، اور یہاں بہت سی کتابیں تصنیف کیں، دمشق میں ان کی ملاقات شیخ عبداللہ بن ناتلی
سے ہوئی، جن کے متعلق وہاں دو فریق ہو گئے تھے، ایک ان کا موافق اور ایک مخالف تھا، خطیب دولعی ان کے
خالف اور بہت سے اعیان و اکابر اُن کے موافق تھے، لیکن اونھوں نے خود کیمیا سازی اور فلسفیانہ مباحث
کو چھیڑ کر اپنے آپ کو مطعون کر دیا، شیخ عبداللطیف بغدادی نے اون سے مل کر بہت سے علوم پر مباحثے
کئے، لیکن ان کو معمولی درجہ کا عالم پایا، اس لئے ان کے ساتھ ان کو جو حسن ظن تھا، وہ قائم نہیں رہا، اس لئے
ن کے یہاں آنا جانا کم کر دیا، پھر عبداللہ بن ناتلی نے ظاہر عکا میں سلطان صلاح الدین سے مل کر دولعی
کی شکایت کی، اور وہاں سے بیمار ہو کر واپس آئے، تو شفاخانہ میں داخل کر دیئے گئے، اور وہیں اون کا
نتقال ہو گیا، اور ان کی کتابیں دمشق کی پولیس نے اپنے قبضہ میں لے لیں، اس کے بعد شیخ عبداللطیف
بغدادی بیت المقدس کی زیارت کو گئے، اور اوس کی زیارت سے فارغ ہو کر ظاہر عکا میں سلطان صلاح الدین
سے ملنا چاہا، اور پہلے قاضی فوج بہاء الدین بن شداد سے ملاقات کی، وہ موصل ہی میں ان کی شہرت
سن چکے تھے، اس لئے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، اور کہا کہ عماد الدین کاتب کے یہاں چلیں، انکا
خیمہ بھی قاضی بہاء الدین کے خیمہ سے ملا ہوا تھا، وہ گئے تو اونھوں نے ان سے علم کلام کے چند مسائل
پر گفتگو کی، اور کہا کہ چلو قاضی فاضل کے یہاں چلیں، یہ ان سب کے ساتھ قاضی فاضل کی خدمت میں گئے، تو
ان کو ایک نحیف الجثہ بزرگ نظر آئے، جو ہمہ تن قلب و دماغ تھے، وہ خود بھی لکھ رہے تھے، اور دو شخصوں
سے لکھوا بھی رہے تھے، اسی حالت میں اونھوں نے اُن سے قرآن مجید کے متعلق چند نحوی سوالات کئے اور بہت سے مسائل
پوچھے اور کہا کہ دمشق میں چلے جاؤ وہاں تم کو وظیفہ مل جائیگا، لیکن عبداللطیف بغدادی نے کہا کہ میں مصر جانا چاہتا ہوں، انھوں نے کہا

کہ فرنگیون نے چونکہ عکا پر قبضہ کرلیا ہے، اورمسلمانون کا کشت وخون کیا ہے، اس لئے سلطان پریشان خاطر ہے، لیکن اونھون نے کہا کہ مجھے مصر جانا ضروری ہے، توقاضی فاضل نے مصر مین اپنے وکیل ابن سنا الملک کو ایک مختصر سا رقعہ لکھدیا، اس لئے اوس نے ان کو ایک آرام دہ مکان مین اوتارا، اور اشرفیان اور غلہ لیکر آیا، اس کے بعد ارکان سلطنت کے یہان جاکر کہا، کہ یہ قاضی فاضل کے مہان ہین، اب ان پر ہدایا وصلات کی بارش ہونے لگی، ہر دسوین دن سرکاری مہمات کے متعلق قاضی فاضل کا ایک سلسلۂ دیوان مصر مین آتا تھا، اوراس مین خاص طور پر شیخ عبداللطیف بغدادی کے ساتھ عمدہ سلوک کرنے کی ہدایت ہوتی تھی، اونھون نے مسجد حاجب لولو مین قیام کیا، اور لوگون کو تعلیم دینے لگے، وہ مصر مین صرف تین آدمیون سے ملنے کے لئے آئے تھے، ایک یاسین سیمیائی، دوسرے موسیٰ بن میمون یہودی، تیسرے ابوالقاسم الشارعی، ان مین سب کے سب ان سے ملنے کے لئے آئے، اوران کو ان سب کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقع ملا، یاسین سیمائی محض ایک شعبدہ گر نکلا، اوس کی نسبت کہا جاتا تھا، کہ وہ جس مقدار مین چاہتا تھا، اور جس وقت چاہتا تھا، اشرفیون کا ڈھیر لگا دیتا تھا، اور نیل کے پانی کو خیمہ بنا دیتا تھا، اوراس کے نیچے اپنے رفقا کے ساتھ بیٹھتا تھا، موسیٰ بن میمون غیر محدود علم رکھتا تھا، لیکن سخت دنیا دار اور جاہ پرست تھا، اوس نے یہود کے لئے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام کتاب الدلالۃ رکھا تھا، اوس نے یہ کتاب اصول شرائع واصول عقائد کی اصلاح کے لئے لکھی تھی، لیکن درحقیقت اوس سے ان کی تخریب ہوتی تھی، لیکن ابھی تک ابوالقاسم الشارعی سے ملاقات نہین ہوئی تھی، اس کی تقریب یہ ہوئی، کہ وہ ایک روز مسجد مین بیٹھے ہوئے تھے، اوران کے گرد لوگون کا ایک بڑا مجمع تھا، اسی حالت مین ایک وجیہ شخص پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے آیا، اور سب لوگ اوس سے مرعوب ہوگئے، اور اوس کو سب کے اوپر بٹھایا، جب مجلس ختم ہوگئی، تو عبداللطیف بغدادی کے پاس مسجد کے امام نے آکر کہا کہ آپ اس شیخ کو پہچانتے ہین، یہ ابوالقاسم الشارعی ہین، اونھون نے ان کو گلے لگایا، اور کہا کہ مین آپ ہی سے ملنے کے لئے آیا ہون، اب وہ ان کو

اپنے مکان پر لے گئے، اور کھانا کھانے کے بعد گفتگو شروع ہوئی، تو ان کی دلی مراد پوری ہوئی، اونکی صورت اور سیرت دونون حکیمانہ تھی، دنیوی مال و اسباب مین سے بقدر کفاف پر قناعت کرلی تھی، اوس سے صحبت رہی، تو معلوم ہوا کہ وہ قدمار اور ابو نصر فارابی کی کتابون کے سب سے بڑے ماہر ہین، لیکن خود شیخ عبداللطیف بغدادی کو قدما، اور ابو نصر فارابی سے کوئی عقیدت نہ تھی، ان کا خیال تھا کہ حکمت کا خزانہ صرف شیخ بو علی سینا نے اپنی کتابون مین بھر دیا ہے، اس پر دونون مین بڑی بحثین رہین، شیخ عبداللطیف بغدادی اپنے عقیدہ پر شدت سے قائم تھے، اور وہ اس عقیدے کو بدلنا چاہتے تھے، اور اس غرض سے ابو نصر فارابی، اسکندر اور ثامسطیوس کی کتابین دکھاتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ بھی مذبذب ہوگئے، اسی حالت مین یہ خبر پھیلی کہ سلطان صلاح الدین نے فرنگیون سے صلح کر لی ہے، اور بیت المقدس مین واپس آگیا ہے، اس لئے عبداللطیف بغدادی بھی بیت المقدس مین آئے، اور جہان تک ممکن ہوسکا، قدمار کی کتابین ساتھ لیتے آئے، یہان سلطان صلاح الدین کی علمی مجلس مین اُن کو شرکت کا موقع ملا، اور اُس نے اُن کے لئے ۳۰ دینار ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا، سلطان کی اولاد نے بھی ان کے لئے وظائف مقرر کئے، اور اس طرح اون کے لئے سو دینار ماہوار کے وظائف مقرر ہوگئے، اب وہ دمشق مین واپس آئے، اور جامع دمشق مین لوگون کو تعلیم دینے لگے، اب قدمار کی کتابون کا بغور مطالعہ کیا، تو ان کا شوق بڑھتا، اور بو علی سینار کی کتابون کا شوق گھٹتا گیا، کیمیا سازی کی لغویت سے بھی ان کو واقفیت ہوئی، اور ان کے بیان کے موافق ان کو دو ہلاکت خیز گمراہیون سے جن مین تمام دنیا مبتلا تھی، نجات حاصل ہوئی، ایک بو علی سینا کی کتابین دوسرے کیمیا سازی کا شوق، اس کے بعد سلطان صلاح الدین کا انتقال ہوگیا، اور اس کی اولاد ادھر اودھر پھیل گئی، اور مصر کی شادابی اور سرسبزی کی وجہ سے ان مین اکثر لوگ مصر چلے گئے، لیکن شیخ عبداللطیف بغدادی نے دمشق ہی مین قیام کیا، اس وقت دمشق کا بادشاہ سلطان صلاح الدین کا بڑا لڑکا ملک الافضل تھا، ملک العزیز نے مصری فوجون کو لیکر دمشق پر چڑھائی کی، اور اپنے بھائی کو

محاصرے مین لے لیا لیکن اس کو کامیابی نہین ہوئی، اور وہ درد قولنج کے لاحق ہو جانے سے مرج الصفر ین چلا گیا، جب اس کو درد سے نجات حاصل ہوئی تو شیخ عبداللطیف بغدادی اوس سے ملنے کو گئے، تو وہ ان کو بھی ساتھ لیتا گیا، اور بیت المال سے بقدر ضرورت ان کا وظیفہ مقرر کر دیا، اب اونھون نے شیخ ابوالقاسم شارعی کے ساتھ قیام کیا، اور شب و روز ان سے صحبت رہنے لگی، یہان تک کہ شیخ ابوالقاسم شارعی نے انتقال کیا،

اس زمانہ مین ان کا مشغلہ یہ تھا کہ صبح سے چار گھنٹے تک جامع ازہر مین تعلیم دیتے تھے، دوپہر کے وقت لوگ ان سے طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے، دن کے اخیر حصہ مین پھر جامع ازہر میں آتے تھے، اور دوسرے لوگ اُن سے پڑھتے تھے، اور رات کو اپنا کام کرتے تھے، پھر ملک العزیز کا انتقال ہو گیا تو اس کے بعد بھی وہ ایک مدت تک مصر مین مقیم رہے، اور سلطان صلاح الدین کی اولاد کی طرف سے ان کو وظیفہ ملتا رہا، اسی زمانہ مین مصر پر قحط اور وبا کی مصیبتین نازل ہوئیں، اور اونھون نے اس کے متعلق ایک کتاب، کتاب الافادہ والاعتبار کے نام سے لکھی، جس مین اس قحط اور وبا کے چشم دید اور مستند لرزہ خیز واقعات درج کئے، اس کے بعد جب سلطان ملک العادل سیف الدین ابوبکر ایوب نے مصر و شام اور مشرق کے اکثر شہرون پر قبضہ کیا، اور سلطان صلاح الدین کی اولاد کے ہاتھ سے سلطنت نکل گئی، تو وہ بیت المقدس مین چلے آئے، اور وہان قیام کر کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف مین مشغول ہو گئے، پھر ۶۰۴ھ مین دمشق مین آئے، اور مدرسہ عزیزیہ مین تعلیم دینے لگے، اس سے پہلے ان کی شہرت علم نحو مین تھی، لیکن اب وہ طب مین مشہور ہوئے، اور اس فن میں بہ کثرت کتابین تصنیف کین، اس کے بعد مختلف شہرون کا سفر کرتے رہے، لیکن ان کا قیام زیادہ تر حلب مین رہا، اور وہان طب اور حدیث کا درس دیتے رہے، اور ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا، وہ حلب سے نکل کر دمشق مین دوبارہ قیام کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس سے پہلے بغداد کے راستے سے حج کے سفر کا ارادہ کیا تاکہ

وہان خلیفہ مستنصر باللہ کی خدمت مین اپنی چند تصنیفات پیش کر سکین، لیکن بغداد مین پہنچکر بیمار ہوئے، ۱۲ ار محرم ۶۲۹ھ مین انتقال کیا، اور بہ مقام وردیہ اپنے باپ کی قبر کے پاس مدفون ہوئے،

شیخ عبداللطیف بغدادی سے علامہ ابن ابی اصیبعہ کے خاندانی تعلقات تھے، علامہ ابن ابی اصیبعہ کے دادا جس زمانہ مین مصر مین تھے، اسی زمانہ مین شیخ عبداللطیف بغدادی بھی مصر میں تھے، اور اس بنا پر دونون مین گہرے دوستانہ تعلقات تھے، اور علامہ ابن ابی اصیبعہ کے باپ اور چچا اون سے علم ادب کی تعلیم حاصل کرتے تھے، علامہ ابن ابی اصیبعہ کے چچا نے اُن سے ارسطو کی کتابین بھی پڑھی تھین، وہ آخری بار دمشق مین آئے، تو خود علامہ ابن ابی اصیبعہ نے بھی دیکھا، ان کا بیان ہے، کہ وہ نحیف الجثہ میانہ قد آدمی تھے، اور ان کو اپنے علم و فن پر بڑا ناز تھا، وہ اپنے زمانہ کے علما اور بہت سے علماے قدیم کی تنقیص کیا کرتے تھے، اور اس مین حدِ اعتدال سے گذر جاتے تھے، وہ علماے عجم بالخصوص شیخ بوعلی سینا پر بہت زیادہ اعتراضات کیا کرتے تھے،

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے شیخ عبداللطیف بغدادی کے بہت سے تعلیمی خیالات نقل کئے ہین، جو غور سے سننے اور پڑھنے کے قابل ہین، وہ فرماتے ہین، کہ تم کو اپنی سمجھ پر کتنا ہی اعتماد ہو، لیکن محض کتب بینی سے علم نہ حاصل کرو، بلکہ ہر علم کو دو اوستادون سے حاصل کرو، اگر ایک استاد ناقص ہو تو جو کچھ علم اوس کے پاس ہے، اوس کو حاصل کر لو، پھر اوس سے زیادہ باکمال اوستاد مل جائے، تو اوس کو چھوڑ دو، جب کوئی کتاب پڑھو تو اوس کو حفظ یاد کر لو، یہان تک کہ اگر اوس کتاب کا وجود بھی باقی نہ رہے، تو تم کو اسکی پروانہ ہو، جب کوئی کتاب پڑھو، تو اوس کے ساتھ دوسری کتاب نہ پڑھو، بلکہ جو وقت دوسری کتاب کے پڑھنے مین صرف کرنا چاہتے ہو، وہ اسی کتاب مین صرف کرو،

ایک ساتھ دو علم کی تعلیم نہ حاصل کرو، بلکہ سال دو سال تک صرف ایک ہی علم کی تحصیل مین معروف رہو، جب اوس سے فارغ ہو جاؤ، تو دوسرے علم کی طرف توجہ کرو، جب کوئی علم حاصل کر چکو تو صرف

اسی بنا پر قناعت نہ کرلو، بلکہ بحث و مباحثہ، غور و فکر، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے اوس کو ترقی دیتے رہو،

جب کسی علم کی تعلیم دو تو اوس کے ساتھ دوسرے علوم کی آمیزش نہ کرو، کیونکہ ہر علم مستقل حیثیت رکھتا ہے، اس لئے جو شخص اوس کے ساتھ دوسرے علم کی آمیزش کرتا ہے، وہ گویا ایک زبان کی تعلیم دوسری زبان کے ذریعہ سے دیتا ہے،

"انسان کو علم تاریخ وسیر کی تعلیم بھی حاصل کرنی چاہئے تاکہ اوسکو گذشتہ قوموں کے عیب و ہنر سے بھی واقفیت حاصل ہوجائے"

انسان کو صدر اوّل کی روش اختیار کرنی چاہئے، اس کیلئے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو پڑھنا چاہئے، اس طرح جب اوس کو معلوم ہو جائے گا، کہ خورد و نوش، وضع لباس، صحت و مرض وغیرہ مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طرز تھا، اور آپ اپنے اصحاب، ازواج مطہرات اور دشمنون کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے، اور وہ اس پر تھوڑا بہت بھی عمل کریگا تو ایک سعادتمند انسان ہو جائیگا،

اپنی ذات سے ہمیشہ بدگمان رہو، اور اپنے خیالات علما کے سامنے پیش کرتے رہو، جس شخص نے علما کے دروازون پر ٹھوکرین نہین کھائین، وہ علم و فن کے میدان مین کبھی ثابت قدم نہ رہے گا،

اگر دنیا تم کو حاصل نہ ہو تو رنجیدہ خاطر نہ ہو، کیونکہ اگر وہ تم کو حاصل ہو جائے گی، تو کسب فضائل مین حائل ہو گی، کیونکہ دولت مند لوگ علم کی تحصیل مین بہت کم جد وجہد کرتے ہین، البتہ اگر وہ بہت زیادہ بلند ہمت ہون یا تحصیل علم کے بعد ان کو دولت حاصل ہو جائے، تو یہ دوسری بات ہے، مین یہ نہین کہتا کہ دنیا طالب العلم سے منہ موڑ لیتی ہے، بلکہ وہ خود اوس سے منہ موڑ لیتا ہے، کیونکہ وہ صرف تحصیل علم مین مشغول رہتا ہے، اس لئے وہ دنیا کی طرف متوجہ ہی نہین ہوتا، دنیا حرص و طمع اور بڑے حیلے حوالے سے حاصل ہوتی ہے، لیکن چونکہ وہ حصول دنیا کے تمام اسباب سے بے پروا ہو جاتا ہے، اس لئے وہ اوس کو حاصل نہین ہوتی، اس کے علاوہ ایک طالب العلم ذلیل پیشون کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے تجارت

نسمون کو اپنے رتبہ سے گرا ہوا پاتا ہے، ارباب دنیا کے سامنے سرنہین جھکاتا، دنیا انہی طریقون
ں ہوتی ہے، اور اس مین بڑا وقت صرف کرنا پڑتا ہے لیکن ایک شخص جو طلب علم مین مصروف ہے
اردوسر مین مبتلا نہیں ہوسکتا، اس لئے وہ چاہتا ہے، کہ دنیا یونہی بلا وجہ مل جائے، تو کیا یہ ظلم
ہ ؟ البتہ ایک آدمی جب کسی علم مین پوری دستگاہ حاصل کرلیتا ہے اور اس مین مشہور ہوجاتا ہے تو
سے اوس کی مانگ ہوتی ہے، اور اس کے سامنے عہدے پیش کئے جاتے ہین، اب دنیا اوس کے سامنے
بجود ہو کر آتی ہے، اور اس حالت مین آتی ہے، کہ اوسکی عزت، اور اس کا دین محفوظ و برقرار ہوتا ہے
ایک خوشبو ہوتی ہے، جو پکار کر صاحب علم کا نام بتاتی ہے، اس مین ایک روشنی ہوتی ہے، جو
علم کا پتہ دیتی ہے، مشک کا تاجر اور اوس کا سرمایہ چھپا نہیں رہ سکتا، جو شخص اندھیری رات
ل لیکر چلتا ہے وہ مخفی نہیں رہ سکتا، پانی کے چشمے ایک بار خشک ہوجاتے ہین، پھر جوش مارنے
ن، یہی حال علم کا بھی ہے کہ اوس مین جزر و مد ہوتا رہتا ہے،

علم ایک قوم سے نکل کر دوسری قوم مین اور ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک مین جاتا ہے، اوسی
رح چلتا پھرتا رہتا ہے،

شیخ عبد اللطیف بغدادی نہایت کثیر التصنیفات ہین، اور حدیث، تفسیر، علم کلام، طب، فلسفہ
شعر و ادب، تاریخ غرض ہر فن پر کتابین لکھی ہین، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے ان کی تصنیفات کی فہرست
صفحون مین درج کی ہے، اور ان مین بہت سی کتابین اچھوتے مضامین پر ہین، افسوس ہے کہ
فلسفیانہ تصنیفات مین کوئی کتاب ابتک شائع نہین ہوئی، ورنہ امام غزالی، امام رازی، اور
برکات بغدادی کے ساتھ فلسفۂ ارسطو اور فلسفہ ابن سینا کے مخالفین مین ایک اور معزز نام کا
نہ ہوجاتا، اور فلاسفۂ قدیم کے بہت سے مسائل و نظریات منظر عام پر آجاتے،

کچھ تفسیر رازی کے متعلق

از
مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دار المصنفین

اردو زبان مین غالباً سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے یہ راز فاش کیا، کہ تفسیر کبیر مکمل امام رازی کی کی تصنیف نہین ہی، بلکہ اس کی تکمیل شمس الدین خلیل دمشقی اور نجم الدین قمولی نے کی ہے،

ایک سلسلۂ تحقیق مین اس مبحث سے متعلق بعض نئی چیزین سامنے آئین، وہ اس لئے پیش خدمت ہین کہ شاید دوسرے اہل علم کی نظرون مین بھی اور کچھ باتین ہون، جو منظر عام پر آسکین!

(۱) پہلی بات یہ ہو کہ تکملہ محض شمس الدین خلیل دمشقی اور نجم الدین قمولی کا مرہون منت نہین ہے، بلکہ ان کے سوا اس خدمت مین اور لوگ بھی شامل ہین، کتب خانہ خدیویہ مصر کی فہرست مین ہی،

ثم کمله جماعة منهم شهاب الدين خليل الخويى الدمشقى المتوفى لسنة ٦٣٩ ونجم الدين احمد بن محمد القمولى [۱]	امام رازی کی تفسیر کا تکملہ ایک جماعت نے کیا، ان میں سے شہاب الدین خلیل دمشقی اور نجم الدین قمولی ہین،

افسوس ہو کہ فہرست کے مرتب نے اپنا ماخذ نہین تبلایا، ورنہ جماعت کا شاید کچھ اور سُراغ لگتا؟

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ آج تک یہ امر تحقیق طلب ہو کہ اس تفسیر مین تکملہ نگارون نے کہان سے کہان تک لکھا ہے،؟ فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر کے مرتب نے سید مرتضیٰ شارح قاموس اور سید مرتضیٰ نے شرح شفا، خفاجی کے حوالہ سے بیان کیا ہو کہ امام رازی نے سورۂ انبیا تک تفسیر لکھی تھی [۲]،

---

[۱] فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر جلد اول ص۲۱۳ [۲] فہرست ،، ص۲۱۳،

مولانا شبلی مرحوم نے اس سے اختلاف فرمایا ہے، ان کا ارشاد ہے کہ سورۂ فتح تک امام صاحب کی تفسیر کا لکھا جانا یقینی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ اس سورہ کی تفسیر کے خاتمہ مین لکھا ہے کہ ۶۰۳ھ مین تمام ہوئی، اور امام کی عادت ہے کہ ہر سورہ کی تفسیر ختم ہونے کی تاریخ لکھ دیتے ہین، امام نے ۶۰۶ھ مین وفات پائی ہے، اس لئے ۶۰۳ھ ان کی زندگی کا زمانہ ہے،

اس سورہ کے بعد پھر کہیں اس قسم کی تصریح نہین ملتی، جس سے ثابت ہوتا ہے، کہ یہین سے تکملہ نگارون کا سلسلہ شروع ہوتا ہے[۵]

لیکن اس رائے کے قبول کرنے مین دقت یہ ہے کہ سورۂ فتح سے پیشتر کی بعض تفسیری عبارتین صاف بتلاتی ہین، کہ امام رازی اس حصۂ تفسیر کے مصنف نہین ہین، مثلاً سورۂ یٰسین کی تفسیر کے آخر مین امام غزالی کا یہ قول درج ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ یٰسین کو قرآن کا قلب اس لئے فرمایا، کہ اس سورہ مین حشر ونشر کے اعتقاد کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے، پھر امام غزالی کی اس رائے کے متعلق تحریر ہے،

واستحسنہ فخر الدین الرازی رحمہ اللہ سمعتہ یترحم علیہ بسبب ھذا الکلام، (تفسیر کبیر ج، ص ۱۲۱ مطبوعہ)	اس کو امام رازی نے پسند فرمایا، امام غزالی کے اس کلام کی وجہ سے مین نے رازی کو ان پر دعاے رحمت کرتے ہوئے پایا،

ظاہر ہے کہ یہ حصۂ تفسیر امام رازی کے کسی دیکھنے والے ہی کا ہو سکتا ہے، اور ہمارے خیال میں شمس الدین خوئی شاگرد امام رازی ہین جن کا تذکرہ بعد کو آئے گا!

اسی طرح سورۂ بقرہ مین حروف مقطعات کے متعلق ایک تفصیلی بحث ہے، پھر سورۂ عنکبوت مین حروف مقطعات کے متعلق دوبارہ ایک مستقل بحث ملتی ہے، اس کے بعد سورۂ ص جس کے آخر مین امام رازی نے تاریخ اختتام درج فرمائی ہے، اس کے شروع مین لکھتے ہین کہ اگرچہ سورۂ بقر مین حروف مقطعات کے متعلق تفصیلی بحث گذر چکی ہے، مگر یہان بعض وجوہ کا ذکر کیا جاتا ہے،

---

[۵] مقالات شبلی جلد ۶ ص ۴۳،

اب سوال یہ ہو کہ سورۂ عنکبوت کی بحث کا امام نے تذکرہ کیون نہین فرمایا؟ حالانکہ وہان اس عنوان پر خصوصی بحث ہے، ہم سمجھتے ہین کہ سورۂ عنکبوت کی تفسیر بھی امام کی نہین ہے جس کا پہلا قرینہ تو یہی ہے کہ اگر انھون نے اس کو لکھا ہوتا، تو اس کا حوالہ ضرور دیتے، دوسرے یہ کہ سورۂ یٰسین کی تفسیر جس کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ امام رازی کی تفسیر نہین ہے،

اس کے شروع مین یہ عبارت ہے،

قد ذکرنا کلاماً کلیاً فی حروف التہجی فی سورة العنکبوت[1]	حروف تہجی کے متعلق سورۂ عنکبوت مین ہم نے ایک مفصل گفتگو کی ہے،

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نے سورۂ یٰسین کی تفسیر لکھی ہے، وہی سورۂ عنکبوت کا بھی مفسر ہے، یہ چیز بھی قابلِ لحاظ ہے کہ سورۂ یٰسین کا مفسر سورۂ عنکبوت کی بحث کا حوالہ تو دیتا ہے، لیکن سورۂ بقر جہان کئی صفحون مین یہ بحث ہے، اس کا حوالہ نہیں دیتا ہے، کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہو کہ سورۂ بقرہ کا حصہ تفسیر اس کا لکھا ہوا نہین ہے !

معلوم ایسا ہوتا ہو کہ امام رازی نے تفسیر کبیر کو مسلسل نہین لکھا، بلکہ مختلف اوقات مین مختلف حصے لکھے، اور ان باقی ماندہ حصون کو تکملہ نگارون نے پورا کیا،

اور اگر مولانا شبلی کے ارشاد کے بموجب تاریخ اختتام کے اندراج کو امام رازی کے تفسیری حصہ کی علامت قرار دیا جائے، تو سورۂ فتح سے پیشتر کی حسب ذیل سورتون کی تفسیر کا امام رازی کی طرف انتساب مشکوک ہو جائے گا، اس لئے کہ ان سورتون میں تاریخ کا اندراج نہیں ہے،

(۱) سورۂ فاتحہ (۲) سورۂ بقرہ (۳) سورۂ مائدہ (۴) سورۂ انعام (۵) سورۂ اعراف (۶) سورۂ حجر، (۷) سورۂ مریم (۸) سورۂ طٰہٰ (۹) سورۂ انبیاء (۱۰) سورۂ حج (۱۱) سورۂ مومنون (۱۲) سورۂ نور

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۷، ص۵۰،

(۱۳) سورۂ فرقان (۱۴) سورۂ شعرا (۱۵) سورۂ نمل (۱۶) سورۂ قصص (۱۷) سورۂ عنکبوت (۱۸) سورۂ روم (۱۹) سورۂ لقمان (۲۰) سورۂ سجدہ (۲۱) سورۂ احزاب (۲۲) سورۂ سبا (۲۳) سورۂ فاطر (۲۴) سورۂ یٰسین (۲۵) سورۂ محمد،

ہمارے خیال میں امام رازی کے حصۂ تصنیف اور تکملہ نگارون کے حصۂ تصنیف مین اسی وقت امتیاز کیا جا سکتا ہے جب کہ تفسیر کبیر کا ایک ایک حرف پڑھا جائے، مصنفین نے جا بجا اپنے اپنے عہد کے علما و مشائخ کا تذکرہ کیا ہے، ان علما و مشائخ کے حالات تلاش کئے جائین، اس طرح زمانہ کی تعیین ہو جائے گی، اور تعیین زمانہ کے بعد مصنف کا معلوم ہو جانا مشکل نہین ہے، مثال کے طور پر سورہ (ق) مین آیت وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِیْدِ کی تفسیر مین ایک مصری عالم امام زین الدین[1] کا نام لیا گیا ہے، اب تک ہم امام زین الدین کی شخصیت کا پتہ نہ چلا سکے، لیکن ظاہر ہے کہ ان کے حالات کے معلوم ہو جانے کے بعد زمانۂ تصنیف اور مصنف کا پتہ چلانا کیا مشکل ہے!

تفسیر رازی کے تکملہ نگار (۱) تفسیر رازی کے پہلے تکملہ نگار قاضی القضاۃ شمس الدین احمد بن خلیل بن سعادہ بن جعفر بن عیسی المہلبی الشافعی ہین، یہ شوال ۵۸۳ھ مین پیدا ہوئے، خراسان میں علم کلام پڑھا، فقہ امام رافعی سے اور مناظرہ علاؤ الدین طاووسی سے حاصل کیا، موید طوسی سے بھی نفع اٹھایا، اور ابن زبیدی اور ابن صلاح سے بھی استفادہ کیا، خود ان کے حلقۂ درس سے بھی جلیل القدر اہل علم پیدا ہوئے، مثلاً تاج الدین ابن ابی جعفر ابو عمرو بن حاجب، جمال محمد بن الصابونی، خود ان کے بیٹے قاضی القضاۃ شہاب الدین محمد، یہ ان کے مشاہیر تلامذہ میں سے ہین[2]

شمس الدین کو امام رازی سے شرف تلمذ حاصل تھا یا نہین؟ اس کے متعلق سبکی نے دو قول نقل کئے ہین، کہ بعض کے نزدیک یہ امام رازی کے شاگرد تھے، اور بعض کے نزدیک قطب مصری شاگرد رازی

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۷ ص ۴۴۲، اس موقع کے الفاظ یہ ہین، ھٰذا وجہ جید مستفاد من الامام زین الدین ادام اللہ فوائدہ [2] طبقات شافعیہ ج ۵ ص ۸،

کے شاگرد تھے، لیکن ابن ابی اصیبعہ (۶۶۸ھ) جو شمس الدین خوئی کے شاگرد ہیں، اوران سے تبصرہ ابن سہلان پڑھا ہے، ان کا بیان ہے کہ شمس الدین امام رازی کے شاگرد تھے،[1] (۲) ممکن ہو کہ دونوں سے پڑھا ہو،

بہرحال یہ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے، طب کے پورے واقف کار تھے، سلطان ملک معظم عیسیٰ بن الملک العادل کے زمانہ میں شام تشریف لائے، بادشاہ چونکہ خود صاحب علم تھا، اس نے ان کی بہت قدر کی، وظیفہ مقرر کیا، عرصہ تک ساتھ رہا، پھر دمشق میں ان کے قیام کا انتظام کر دیا، یہ دمشق میں قاضی القضاۃ بھی ہو گئے تھے!

بہت متواضع تھے، مزاج میں نرمی تھی، گفتگو بہت شیریں ہوتی، حیا کا غلبہ تھا، مروت طبیعت بن گئی تھی، شکل و شباہت بھی بہت اچھی تھی،

دمشق میں دق کے مرض میں، رشعبان ۶۳۷ھ کو انتقال ہوا،[2] اس حساب سے چون[4] سال کی عمر ہوئی،

ان کے نام اور سنہ وفات میں کسی قدر غلط فہمی ہوئی ہے، جس کا ازالہ مناسب ہے، کشف الظنون[3] فہرست کتب خانہ خدیویہ[4] اور مقالات شبلی[5] میں بجائے شمس الدین کے ان کا نام شہاب الدین درج ہے، حالانکہ صحیح نام شمس الدین ہے، شہاب الدین ان کے بیٹے کا نام ہے، چنانچہ طبقات شافعیہ، طبقات الاطبار، اور شذرات الذہب وغیرہ میں ان کا نام شمس الدین ہی مذکور ہے، اور ان کے بیٹے کا نام شہاب الدین تبلایا گیا،

سال وفات میں یہ غلطی ہوئی ہے کہ کشف الظنون میں ۶۳۹ھ درج ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی یہی سنہ لکھا ہے، لیکن شذرات الذہب[6] اور طبقات الاطبار[5] میں ہے کہ شعبان ۶۳۷ھ میں ان کا

---

[1] طبقات الاطبار ج ۲ ص ۱۷۱ [2] ایضاً ر [3] کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۲۲ [4] فہرست خدیویہ جلد ۳ ص ۱۱۳ [5] مقالات شبلی جلد ۲ ص ۴۲

[6] ج ۵ ص ۱۸۳، ابن عماد حنبلی م ۱۰۸۹ھ نے شذرات میں ۶۳۷ھ میں وفات پانے والوں کے سلسلہ میں قاضی القضاۃ شمس الدین کا تذکرہ کیا ہے، مگر حیرت انگیز یہ ہے کہ اسی پانچویں جلد میں ص ۲۲۴ میں ۶۹۳ھ میں وفات پانیوالوں کے ضمن میں بھی ان کا ذکر ہے، لیکن وہاں بھی سال وفات ۶۳۷ھ ہی درج ہے [5] جلد ۲ ص ۱۷۱،

انتقال ہوا ہے، البتہ سبکی نے، رشعبان ۶۸۰ھ لکھا ہے[1] معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے غلطی سے ثلاثین کو ثمانین لکھدیا ہے،!

اس سلسلہ میں ایک تیسری چیز کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے، وہ یہ کہ مولانا شبلی مرحوم نے بحوالہ کشف الظنون تحریر فرمایا ہے، کہ شمس الدین کے تکملہ کا نام واضح تھا، مولانا مرحوم کو اس میں تسامح ہوا، صاحب کشف الظنون نے اس تکملہ کا نام واضح نہیں بتلایا ہے، بلکہ تفسیر رازی کے خلاصہ کا نام واضح بتایا ہے، پوری عبارت یہ ہے،!

وصنف الشیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولی تکملۃ لہ وتوفی ۷۷۷ھ سبع وسبعین و سبع مائۃ وقاضی القضاۃ شہاب الدین بن خلیل الخوی الدمشقی کمل ما نقص منہ ایضاً وتوفی ۶۳۹ھ تسع وثلاثین وستمائۃ، واختصرہ برہان الدین محمد بن محمد النسفی المتوفی ۶۸۷ھ سبع وثمانین و ست مائۃ وسماہ الواضح،[2]

شیخ نجم الدین قولی متوفی ۷۷۷ھ نے اور شہاب الدین دمشقی متوفی ۶۳۹ھ نے اس کا تکملہ لکھا، اور برہان الدین محمد بن محمد نسفی نے اس کا خلاصہ کیا، اور اس کا نام واضح رکھا،

الفوائد البہیہ ص ۲۰۰ میں بھی نسفی کو تفسیر رازی کا خلاصہ نگار بتایا گیا ہے. کشف الظنون ج ۲ ص ۴۷۷ میں ایک دوسرے خلاصہ نگار محمد بن القاضی کا بھی ذکر ہے، اس خلاصہ نگار نے کچھ اضافے بھی کئے ہیں، کتبخانہ

---

[1] طبقات شافعیہ جلد ۵ ص ۳۳، [2] کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۷۷،

خدیویہ مین تفسیر رازی کا ایک ناقص خلاصہ موجود ہے، مگر مصنف کا نام معلوم نہین![1]

تفسیر قمی نیشاپوری بھی تفسیر رازی کا خلاصہ ہی ہے!

(۲) تفسیر رازی کے دوسرے تکملہ نگار احمد بن محمد بن ابی الحزم مکی بن یاسین القمولی نجم الدین ہین[2]، سالِ پیدائش متعین طور سے معلوم نہین، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی[3]، اور سبکی[4]، وفات کے وقت اِن کی عمر ۸۰ سال کی بتلاتے ہین، اور ان کی وفات رجب ۷۲۷ھ مین ہوئی ہے، اس حساب سے سالِ پیدائش ۶۴۷ھ ہوتا ہی، یعنی شمس الدین خوئی کی وفات کے دس سال بعد یہ پیدا ہوئے !

اِن کے سال وفات مین بھی کسی قدر غلط فہمی ہوئی ہے، کشف الظنون مین ۷۷۷ھ ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی یہی سنہ وفات لکھا ہے[5]، لیکن یہ صحیح نہین ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی[6]، ابن عماد حنبلی[7]، علامہ سبکی[8]، حافظ جلال الدین سیوطی[9]، اور ان سب سے بڑھ کر کمال الدین ابوالفضل جعفر بن ثعلب بن جعفر الادفوی ۷۴۸ھ، جو نجم الدین قمولی کے نہ صرف ہم عصر بلکہ ہمدم و ہمراز بھی تھے، وہ بھی سنہ وفات رجب ۷۲۷ھ بتلاتے ہین[10]،

نجم الدین قمولی قاضی القضاۃ بدر الدین جماعہ کے تلامذہ مین سے تھے، بہت صاحب علم و فضل تھے، مختلف مقامات مین عہدۂ قضا پر مامور ہوئے، اہلِ علم کا قول تھا کہ ان سے زیادہ مصر مین کوئی فقیہ نہین، ان کو مزاج مین بہت نرمی تھی، احباب کا بہت خیال رکھتے تھے، وظائف و اوراد کے پابند تھے، رات کو شب بیداری، اور دن کو کثرتِ ذکر سے اپنے اوقات کو پُرنور رکھتے تھے، ادفوی کا بیان ہو کہ مرض الموت مین، مین نے اون سے کہا کہ معمولات مین کچھ کمی کر دیجئے لیکن راضی نہ ہوئے، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف خاص مشغلہ تھا جب تک لکھنے سے معذور نہ ہوئے، برابر تصنیف کا کام جاری رہا[11]، رحمہ اللہ،

---

[1] فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد ۱ ص ۲۰۹ [2] الطالع السعید ص ۴۲ [3] درر کامنہ جلد اول ص ۳۰۴ [4] طبقات شافعیہ جلد ۵ ص ۱۹ [5] مقالات شبلی ج ۴ ص ۳۴ [6] درر کامنہ جلد اول ص ۳۰۴ [7] شذرات الذہب جلد ۶ ص ۷۷ [8] طبقات شافعیہ جلد ۵ ص ۱۹ [9] حسن المحاضرہ اول ص ۱۷۰ [10] الطالع السعید ص ۶۲ [11] ص ۶۴،

امام رازی کی دوسری تفسیری خدمات | تفسیر کبیر کے سوا امام رازی کی دوسری تفسیری خدمات سے عموماً لوگ واقف نہین ہین، ہمارے علم مین اس سلسلہ کی جو کتابین ہیں، ان کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا!

تفطی[۱] نے تفسیر کبیر کے سوا حسب ذیل تفسیرون کا پتہ دیا ہے:-

۱۔ تفسیر سورۂ فاتحہ،

۲۔ تفسیر سورۂ بقرہ، خالص عقلی حیثیت سے،

۳۔ تفسیر صغیر جس کا نام اسرار التنزیل وانوار التاویل ہے،

کشف الظنون مین بھی اسرار التاویل کا ذکر ہے، اور لکھا ہے کہ یہ نامکمل رہ گئی تھی[۲] یہ کتاب کتب خانہ بانکی پور مین موجود ہے[۳] علامہ ابو الوفا نصر ہورینی سنہ ۱۲۹۱ھ نے اپنی تفسیر سورۂ ملک مین اس سے نفع بھی اٹھایا ہے[۴] لیکن اس کو بجائے تفسیر کے علم کلام کا رسالہ کہہ سکتے ہین،

تفسیر سورۂ فاتحہ کے متعلق کشف الظنون مین ہے کہ یہ دو جلدون مین تھی، اور اس کا نام مفاتیح العلوم تھا[۵]

صاحب طبقات الاطبار نے بھی تفسیر سورۂ فاتحہ اور تفسیر سورۂ بقرہ کو تفسیر کبیر کے سوا مستقل تفسیر شمار کیا ہے، لیکن تاہنوز یہ امر تحقیق طلب ہے کہ واقعی تفسیر سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ موجودہ تفسیر کبیر سے الگ ہے یا اس مین شامل ہے؟ صاحب طبقات الاطبار نے ایک اور کتاب کا حوالہ دیا ہے، جس کا نام رسالہ فی التنبیہ علی بعض الاسرار المودعۃ فی بعض سور القرآن العظیم ہے!

کشف الظنون مین[۶] درۃ التنزیل وغرۃ التاویل کے نام سے ایک تفسیری کتاب کو امام رازی

---

[۱] اخبار الحکماء ص ۱۹۱ [۲] کشف الظنون ج اول ص ۹۵ [۳] مفتاح کنوز الخفیہ جلد اول صفحہ ۴۲ [۴] فہرست کتب خانہ خدیویہ ج اول ص ۱۴۷ [۵] کشف الظنون ج اول ص ۱۳۴ ج دوم ص ۴۶۲

[۶] کشف الظنون جلد اول ص ۴۸۳،

کے نام سے منسوب کیا ہو، اس مین قرآن مجید کی مکرر آیات سے بحث ہے! اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے[۱] لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جو امام رازی کی تصنیف ہے، یا ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الخطیب اسکافی کی کتاب ہے جس کا نام بھی یہی ہے!

کتب خانۂ مصر کی فہرست مین ہو کہ اس کتاب پر ایک ورق لگا ہوا ہے جس مین لکھا ہے کہ یہ کتاب ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الخطیب کا املا ہے، فہرست کے مرتب نے اس صفحہ کو جعلی قرار دیا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے نزدیک اس کتاب کا انتساب امام رازی کی طرف مشتبہ ہے، اس لئے کہ امام رازی کی طرف منسوب مصری نسخہ کا جسکا حوالہ فہرست مین ہے اور اسکافی کے نسخہ مطبوعہ کا خاتمہ بالکل ایک ہو اور وہ یہ ہو:

هذا آخر ما تكلمنا عليه من الآيات التى يقصد الملحدون التطرق منها الى عيبها،

البتہ یہ چیز لائق توجہ ہے کہ ان دونون کی ابتدا مین اختلاف ہے، مصری نسخہ منسوب بہ امام رازی کی ابتدا الحمد للہ حمد الشاکرین سے ہے، اور اسکافی کی درۃ التنزیل کی ابتدا ان کلمات سے نہین ہو!

---

[۱] فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد اول ص ۱۷۳،

تفسیر ابو مسلم اصفہانی

عربی معتزلہ کی مفقو دالخبر نادرالوجود عقلی تفسیر قرآن کے اجزا جو نہایت دیدہ ریزی سے امام رازی کی تفسیر کبیر سے جمع کئے گئے ہین، عمدہ ٹائپ مین چھپی ہو، قیمت :- عہ ضخامت ۱۰۳ صفحے،

حدائق البیان فی معارف القرآن

اس کتاب مین قرآن مجید کے متعلق بہت سے لفظی اور معنوی مباحث درج کئے گئے ہین جن سے عام و خاص سب فائدہ اٹھا سکتے ہین، اور قرآن مجید کے متعلق بہت سے معلومات حاصل کرسکتے ہین،

قیمت :- عہ، ضخامت ۲۴۲ صفحے

منیجر

استفسار و جواب

"درۃ التاج لغرۃ الدباج"

اور

علامہ قطب الدین شیرازی

جناب حافظ صاحب حافظ محمد (حافظ منزل) راندیر ضلع سورت | مکرم و مخدوم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاج اقدس بعافیت ہوگا، احقر بھی بفضلہ تعالیٰ مع الخیر ہے، عرصہ ہوا، کہ جناب راندیر تشریف لائے تھے، اس وقت مختصر سی ملاقات و زیارت ہوگئی تھی، اس کے بعد نہ ملاقات کا موقع ہوا، اور نہ ہی عریضہ ارسال کرنے کی نوبت آئی، گو اکثر جناب کا تذکرہ احباب کے سامنے آیا کرتا ہے، خصوصاً مجبور رنگونی کے ذریعہ خیریت مزاج گرامی معلوم ہوتی رہتی ہے، ایک خاص امر اس عریضہ کا باعث ہے، میرے ایک دوست کے پاس درۃ التاج مصنفہ علامہ محمود بن مسعود ابن المصلح الشیرازی ہے، یہ نسخہ قلمی ہے، اس کی دو جلدیں ان کے پاس ہیں، ایک جلد غالباً ریاست ٹونک کے کتب خانہ میں ہے، چونکہ صاحب حاجت ہیں، تو ان کا خیال ہوا کہ ممکن ہے اس نایاب کتاب کی قدر حیدرآباد میں ہو، اور ان کو اس کے صلہ میں کچھ رقم مل جائے، چنانچہ وہاں ایک دوست کو لکھا گیا، وہاں سے جواب آیا، کہ اس کے مصنف کون ہیں، کس فن کی کتاب ہے، کتابت کس

سنہ کی ہے، براہ راست لکھا جاوے، کتاب کو دیکھنے سے تصنیف کا سنہ معلوم نہین ہوا، اور نہ اس کی کتابت کا سال معلوم ہوتا ہے، مصنف کا نام تو مین اس عریضہ مین لکھ چکا ہون، ان کا زمانہ بادشاہ فیل شاہ بن الملک المعظم رستم کی حکومت کا ہے، زبان کتاب کی فارسی ہے، کسی خاص فن کی کتاب نہین ہے، اس مین منطق و فلسفہ، ریاضی، اقلیدس، اصول دین و فروع کا فلسفہ سب ہی کچھ ہے، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے بھی بہت ہی پسند فرمایا، اب آپ سے اس کے متعلق دو باتین عرض کرنی ہین،

ایک یہ کہ علامہ محمود بن مسعود و فیل شاہ کا زمانہ کونسا ہے، کس سنہ مین یہ حضرات تھے، درۃ التاج کا کہین ذکر ہے یا نہین، دوم یہ کہ مولانا احمد اللہ ندوی دائرۃ المعارف کو اس بارہ مین کچھ سفارش کے طور پر تحریر فرمادین، مین اس معاملہ مین لوجہ اللہ دلچسپی لے رہا ہون، محض یہ خیال ہے کہ مالک کتاب بہت حاجت مند شخص ہین، صاحب علم ہین، ان کی ضعیفی کا زمانہ ہے، نیز یہ کہ ایسی عمدہ جامع کتاب کسی اچھی جگہ پہنچ جائے، اور ان غریب کا کام بھی ہو جائے، اس سلسلہ مین اگر اور کوئی بہترین صورت ذہن مبارک مین آوے، تو ضرور توجہ فرمادین، آپ کو اجر عظیم ملے گا،

حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب نے جب اس کتاب کو ملاحظہ فرمایا، تو اونھون نے اپنا یہ خیال ظاہر فرمایا تھا، کہ اگر یہ کتاب حیدرآباد دائرۃ المعارف پہنچ جائے تو اچھی رقم مل سکے گی، بہرحال جناب والا کی توجہ گرامی سے امید قوی ہے کہ کوئی بہترین صورت نکل آئے گی، آپ کو اجر عظیم ملے گا، باقی سب خیریت ہے دعاؤن کا بیحد محتاج ہون،

والسلام

معارف:- محترم زادمجدکم،

السلام علیکم:- گرامی نامہ ملا، آپ کی کتاب درۃ التاج کے بیش قیمت ہونے مین کوئی

شبہ نہیں، یہ علوم عقلیات کی ممتاز تصانیف مین شمار کیجاتی ہے، لیکن اب یہ غیر مطبوعہ نہیں رہی، چند سال گذرے، یہ ایران سے رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت مین بڑے اہتمام سے کئی جلدون مین شائع ہو چکی ہے، اس کا مطبوعہ نسخہ ہمارے کتب خانہ مین بھی موجود ہے،

آپنے اس کے مصنف کا حال اور اس کا زمانہ دریافت فرمایا ہے، اس کے مصنف علامہ قطب الدین محمود ابن ضیاء الدین مسعود شیرازی ساتوین صدی مین افاضل روزگار مین سے تھے، علوم عقلیات مین ان کی قابل قدر تصانیف ہین، اور فلسفہ، حکمت، منطق، ریاضی اور ہیئت کی مختلف متون و شروح ہیں "قطب الدین شیرازی" یا "علامہ شیرازی" کے لقب سے یاد کئے گئے ہین،

علامہ قطب الدین شیراز کے ایک ذی علم خاندان مین ماہ صفر ۶۳۴ھ مین پیدا ہوئے، ان کا آبائی وطن شہر کازرون تھا، جو شیراز سے تین دن کی مسافت پر آباد تھا، چنانچہ ان کے والد شیخ ضیاء الدین مسعود ابن مصلح اسی نسبت سے کازرونی کہے گئے، وہ شیراز مین مقیم تھے، اور اپنے زمانہ کے مشہور اطباء و مشائخ صوفیہ مین شمار کئے گئے، انھیں بانی طریقۂ سہروردیہ حضرت شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد سہروردی سے بیعت و خرقۂ ارادت حاصل تھا، شیراز کے بیمارستان مظفری مین تدریس کی خدمت اور مریضون کے معالجہ مین مصروف تھے، ۶۴۸ھ مین اونھون نے اپنے صاحبزادے قطب الدین محمود کو ۱۴ سال کی عمر مین چھوڑ کر وفات پائی،

شیخ ضیاء الدین جب تک زندہ رہے، اپنے نوعمر صاحبزادے کی تعلیم و تربیت مین مصروف رہے، چنانچہ قطب الدین محمود نے اپنی ابتدائی تعلیم، اور علم طب کی علمی و عملی تحصیل اپنے پدر بزرگوار سے کی، نیز شفیق باپ نے اپنے نوعمر بچہ کو دس برس کی عمر ہی مین تبرکاً خرقۂ تصوف پہنایا، پھر شیخ وقت حضرت نجیب الدین علی بن بزغش شیرازی کے سپرد کیا، ان کے حلقہ مین وہ بیٹھا کئے، اور شیخ وقت نے بھی اسی کم عمری مین انھیں خرقۂ تصوف سے نوازا،

پھر والد بزرگوار کی وفات کے بعد صرف چودہ سال کی عمر مین یہ اپنے والد کی جگہ پر اسی بیمارستان

مظفری میں خدمت پر مامور کئے گئے، اور دیگر اطبار کی نگرانی، ہدایت اور شفقت سے عملی خدمات کے ساتھ فن کے علمی وعملی تجربے حاصل کرتے رہے، یہانتک کہ دس سال اسی طریقہ سے گذر گئے، اس کے بعد انھیں فن میں تبحر حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ مختلف اساتذۂ روزگار کے حلقۂ درس کا رُخ کیا، اور فن کی مشہور کتابیں ممتاز اہل علم سے پڑھیں، اس سلسلہ میں پہلے اپنے چچا شیخ کمال الدین ابوالخیر بن مصلح کازرونی سے کلیات قانون ابن سینا پڑھی، پھر اسی طرح مختلف اساتذہ شیخ شمس الدین محمد بن احمد کیشی، شیخ الکل شرف الدین زکی البوشکانی وغیرہ سے علوم کی تحصیل کی، اس زمانہ میں علوم عقلیات میں حکیم خواجہ نصیر الدین طوسی کا طوطی بول رہا تھا، چنانچہ شیخ قطب الدین محمود ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اشارات ابن سینا اور فن ہیئت کا درس لیا، اور مختلف علمی و نظری علوم کے مشکلات و شکوک اُن سے حل کئے، نیز مشہور زیج ایلخانی کی ترتیب میں خواجہ کا ہاتھ بٹایا،

اس کے بعد شیخ قطب الدین نے اُن مشہور شہروں کی سیاحت شروع کی جو اس زمانہ میں علم کے مرکز تھے، اور ہر مقام کے اکابر سے استفادہ کیا، اسی سلسلہ میں بغداد میں شیخ طریقت حضرت محمد بن سکران بغدادی المتوفی ۶۶۲ھ سے فیوض حاصل کئے، پھر روم پہنچے، اور مولانائے روم جلال الدین رومی المتوفی ۶۷۲ھ کی صحبت میں بیٹھے، پھر قونیہ میں وارد ہوئے، اور حضرت شیخ صدرالدین قونوی المتوفی ۶۷۳ھ کے حلقۂ ارادت میں بیٹھے، اور طریقۂ ارشاد و علوم شریعت و طریقت کی تحصیل کی، نیز حاکم روم معین الدین سلیمان پروانہ سے ان کے مخلصانہ روابط قائم ہوئے، وہ اُن سے غیر معمولی تعظیم و تکریم سے پیش آیا، اسی سلسلہ میں سیواس وملطیہ کی قضاءت کی خدمت پر مامور کئے گئے، نیز درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہوا، چنانچہ ان کی کتاب التحفۃ الشاہیہ اسی زمانہ کی تصنیف ہے،

اسی زمانہ میں انھوں نے بعض دوسرے سیاسی خدمات بھی انجام دیئے، چنانچہ ہلاکو کے لڑکے تکدار نے اسلام لے آنے اور احمد نام اختیار کر لینے کے بعد شاہانِ اسلام کے پاس اپنی جو سفارتیں بھیجیں، ان میں سے

مصر کی سفارت مین جو ملک قلاؤون الفی (۶۷۸ھ - ۶۸۹ھ) کے پاس گئی تھی، قاضی قطب الدین شیرازی بھی تھے، اور اس سلسلہ میں جو شاہی مراسلے ایک دوسرے کی طرف گئے، ان میں انھیں "اقضی القضاۃ" کے خطاب سے یاد کیا گیا ہے (ابن خلدون ج ۵ ص ۴۰۲، مختصر الدول ص ۵۰۷، شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۷۰)

علامہ قطب الدین شیرازی نے اس سفر میں شام میں کتاب الشفا، اور کتاب قانون کا درس دیا، اس طرح ان کے علمی خدمات جاری رہے،

اس کے بعد حاکم تبریز نے انھیں اپنے یہاں مدعو کیا، اور غیر معمولی ادب و احترام سے پیش آیا، آب انھون نے اسی شہر مین اقامت اختیار کر لی، اور علم و فن کی خدمت مین ہمہ تن مصروف ہو گئے، اور اپنے عہد کے شہرۂ آفاق اساتذہ مین شمار کئے گئے، اگرچہ وہ روم، مصر، شام و عراق کے حکمرانون مین بڑی منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، لیکن آخر عمر مین اونھون نے امرار کے دولت کدون سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تھا، اور درس و تدریس و تصنیف و تالیف مین مصروف رہتے تھے، وہ مذہبًا شافعی تھے، علامہ سبکی نے اسی حیثیت سے اپنی طبقات مین ان کا تذکرہ کیا ہے، ۷۶ برس کی عمر مین بماہ رمضان ۷۱۰ھ وفات پائی

ان کے حلقۂ درس سے بیشمار تلامذہ نے فیوض حاصل کئے، اور اپنے زمانہ مین ممتاز اکابر فضلا مین شمار کئے گئے، ان مین سے شیخ تاج الدین اردبیلی المتوفی ۷۴۶ھ قطب الدین محمد رازی بویہی صاحب شرح مطالع المتوفی ۷۶۶ھ، نظام الدین اعرج نیشاپوری صاحب شرح شافیہ معروف بہ شرح نظام، و تفسیر غرائب القرآن معروف بہ تفسیر نیشاپوری اور کمال الدین حسن بن علی الفارسی المتوفی ۷۱۸ھ وغیرہ ہیں

علامہ قطب الدین اپنے عہد میں علوم عقلیات کے بڑے ماہرین میں شمار کئے گئے ہیں اور مستند مورخین نے اسی حیثیت سے ان کا تعارف کرایا ہے، چنانچہ اسنوی انھیں "امام عصرہ فی المعقولات" کہتا ہے، یافعی نے "عالم العجم" کا لقب دیا ہے، اسی طرح ابو الفداء نے انھیں "امام و ماہر علوم ریاضی، منطق، فنون حکمۃ و طب و اصول فقہ و علم کلام" لکھا ہے،

علامہ قطب الدین عقلیات کے خشک موضوع سے وابستہ رہنے کے باوجود طبعاً نہایت شگفتہ مزاج تھے، ظرافت و بذلہ سنجی سے خاص لگاؤ تھا، ان کے دلچسپ لطائف و ظرائف بھی ان کے سوانح مین محفوظ ہین، ذوق شعری سے بھی مناسبت تھی، فارسی کلام کے کچھ نمونے کتابون مین ملتے ہیں،

علوم کی خدمت کے ساتھ خاصہ وقت عبادت و ریاضت مین بھی گذارتے، اور لباس صوفیانہ زیب تن رکھتے تھے، تصنیفات کے سلسلہ مین یہ عادت تھی، کہ عموماً روزے رکھ کر مسودے لکھتے اور شب بیداری کرکے مسودہ کو مبیضہ مین منتقل کرتے تھے،

علامہ قطب الدین شیرازی کے مفصل سوانح حیات کے لئے ملاحظہ ہو الدرر الکامنہ ابن حجر ج ۴ ص ۳۳۹ طبقات الشافعیہ سبکی ج ۶ ص ۲۴۸، دول الاسلام ذہبی ج ۲ ص ۱۶، مرأۃ الجنان یافعی جلد ۴ ص ۲۴، بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص ۳۸۹، ابو الفدا ج ۴ ص ۶۵، الفوائد البہیہ مولانا عبدالحی ص ۵، ابن خلدون جلد ۵ ص ۵۴۶، تاریخ گزیدہ ص ۸۰۹، دیباچہ درۃ التاج سید محمد مشکوٰۃ (بحوالہ روضات الجنۃ ج ۴ ص ۲۱۴، وصاف الحضرۃ ج ۱ ص ۵۱، شرح حکمۃ الاشراق ص ۷، جامع التواریخ رشیدی ج ۱ ص ۶۳، حبیب السیر ج ۳ ص ۶، وغیرہ) نیز ریو نے فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم، وضمیمہ فہرست مخطوطات عربی جلد ۲ ص ۴۳۴ مین اور ایتھ نے فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس ج ۱ ص ۴۹۴ و ۱۲۱۰ مین مصنف کے سوانح و تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے، نیز ہفت اقلیم امین رازی سے ان کے حالات کا خلاصہ درج اور سفینۃ الاولیاء سے بعض اقتباسات نقل کئے ہین،

اسی طرح ان فہرستون مین بعض دوسری کتابون کے ضمن مین بھی تذکرہ آیا ہے، نیز معجم المطبوعات الیاس سرکیس مین ان کی بعض مطبوعہ کتابون کے ضمن مین مختصر حالات مندرج ہیں اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون مین مختلف کتابون کا تذکرہ کیا ہے،

مختلف علوم مین حسب ذیل کتابین ان کی یادگار ہین،

۱۔ نھایۃ الادراک فی درایۃ الافلاک، اس مین علم ہیئت مین چار مقالے عربی مین قلمبند کئے گئے ہین، مختلف تذکرہ نگارون نے ذکر کیا ہے، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون مین بھی تذکرہ آیا ہو کتبخانہ خدیویہ مصر (ج ۵ ص ۲۲۵) اور مدرسہ سپہ سالار ایران مین اس کے نسخے موجود ہین، یہ غالباً علامہ قطب الدین کی سب سے پہلی تصنیف ہی، جو محمد بن صاحب السعید بہاء الدین محمد جوینی حاکم اصفہان کے نام سے معنون کی گئی ہو،

۲۔ التحفۃ الشاھیہ بھی عربی زبان مین فن ہیئت مین ہے، امیر شاہ محمد بن الصدر السعید تاج الدین معتز بن طاہر کے نام سے معنون ہے، ہفت اقلیم امین رازی مین اس کا ذکر آیا ہے، یہ قضات سیواس کے زمانہ کی تصنیف ہے، سید شریف اور ملا علی توشجی نے اس پر حاشیہ اور اسکی شرح لکھی ہے شرح توشجی کا نسخہ کتب خانہ خدیویہ مین موجود ہے، اصل کتاب کے نسخے بھی کتب خانہ ملی معارف طہران (فہرست کتب خانہ مذکور ج ۱ ص ۱۵۵) اور مدرسۂ سپہ سالار مین موجود ہین،

۳۔ شرح حکمۃ الاشراق کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ ۱۳۱۵ھ مین طہران سے چھپ چکی ہے، مصنف نے اس کو جمال الدین علی بن محمد الاستجردانی کے نام سے معنون کیا ہے، معجم المطبوعات مین بھی اس کا ذکر آیا ہے،

۴۔ مفتاح المفتاح، یہ علامہ سکاکی المتوفی ۶۲۶ھ کی مشہور تصنیف مفتاح العلوم کی شرح ہی امین رازی نے ذکر کیا ہے، حاجی خلیفہ نے اس کو اس کتاب کی بہترین شرحون مین شمار کیا ہے، (جلد ۲ ص ۴۰۰) مصنف نے اس کو خواجہ ہمام الدین ابن ہمام المتوفی ۷۱۳ھ کی خواہش سے لکھا تھا، اس کے نسخے دار الکتب مصریہ اور مدرسۂ سپہ سالار مین موجود ہین،

۵۔ التحفۃ السعدیہ "شرح کلیات ابن سینا" کے نام سے بھی معروف ہی، ہفت اقلیم اور دوسرے تذکرون مین اس کا ذکر آیا ہے، حاجی خلیفہ نے اس کو قانون کی بہترین شرح قرار دیا ہو، (ج ۲ ص ۲۱۰) یہ تصنیف خواجہ سعد الدین کے نام سے معنون ہے، مدرسۂ سپہ سالار مین اس کا نسخہ بھی محفوظ ہے، المغنی فی

شرح المعجز کازرونی کے مآخذ مین ہے، (برٹش میوزیم)

۶- شرح مختصر الاصول ابن حاجب مصنف نے اس کا تذکرہ مفتاح المفتاح اور التحفۃ السعدیۃ مین کیا ہے، حاجی خلیفہ کی نظر سے بھی اس کا نسخہ گذرا تھا،

۷- فتح المنان فی تفسیر القرآن معروف بہ "تفسیر علامی" (منسوب بہ علامہ قطب الدین) حاجی خلیفہ نے اس کو چالیس جلدون مین بتایا ہے، مصنف نے علوم عقلیات سے مناسبت رکھنے کے باوجود آیات کی تفسیر مین منقولات کے حدود سے تجاوز نہیں کیا ہے، اس کی پہلی جلد کتب خانہ خدیویہ مین موجود ہے،

۸- حاشیہ بر کشاف زمخشری، یہ دو جلدون مین ہو (کشف الظنون ج ۲ ص ۳۱۱)

۹- رسالۃ فی بیان الحاجۃ الی الطب وآداب الاطباء، اس کا ایک نسخہ جو ۹۱۳ھ کا مکتوبہ ہے کتب خانہ خدیویہ مین موجود ہے لیکن یہ رسالہ کسی نام سے موسوم نہیں، رسالہ کی اصل عبارت اسی فقرہ سے شروع ہوتی ہے، جو بطور اسم درج کیا گیا،

حاشیہ بر حکمۃ العین، علامہ نجم الدین قزوینی المتوفی ۶۷۵ھ کی حکمۃ العین پر یہ حاشیہ ہے جس کو شمس الدین محمد بن مبارک شاہ بخاری نے اپنی شرح حکمۃ العین مین تمام و کمال نقل کر لیا ہے، اور "فی الحواشی القطبیۃ المطہر" اپنی شرح سے اس کا امتیاز قائم رکھا ہے، شرح حکمۃ العین کا یہی نسخہ اس زمانہ مین طلبہ مین عام طور پر متداول ہے،

۱۱- درۃ التاج لغرۃ الدباج، مصنف کی یہی وہ تصنیف ہے جس کا قلمی نسخہ آپ کے دوست کے پاس اور مطبوعہ نسخہ ہمارے سامنے موجود ہے، یہ تصنیف امیر دباج بن فیل شاہ کی خواہش سے لکھی گئی، اور اسی مناسبت سے "درۃ التاج لغرۃ الدباج" کے نام سے موسوم کی گئی، چنانچہ مصنف نے مقدمہ مین دباج بن فیلشاہ کے علوی نسب مکارم اخلاق کا تذکرہ کر کے لکھا ہو،

"پس بموجب حکم مثال مطاع و فرمان مطاع کسر این اوراق اتفاق افتاد و بنام آن صاحب دولت

صاحب فکرت کیوان ہمت دوران فسحتِ فلک رفعت، ملک سیرت، متوجہ گردانید و آنرا درۃ التاج

لغرۃ الدباج نام نہاد" (ج ۱ ص ۲۱)

دباج بن فیلشاہ گیلان کا حکمران تھا، الدرر الکامنہ مین اس کو دباج بن قطلی شاہ کے نام و نسبت سے موسوم کیا گیا ہے، جو بلا شبہہ نسخہ کی غلطی ہے، اوس نے ۲۵ سال حکمرانی کی ۷۴۱؁ھ مین حج و زیارت کیلئے روانہ ہوا، دمشق کے قریب ۵۴ سال کی عمر مین وفات پائی، اور دمشق مین دفن کیا گیا، (الدرر الکامنہ جلد ۲ ص ۱۰۳)

آگے چل کر لفظ "دباج" ملوک گیلان کا لقب قرار پایا، چنانچہ ایتھ نے فہرست مخطوطات فارسی میں عبدالرزاق کی مطلع السعدین اور بعض دوسرے حوالوں سے دکھایا ہے کہ گیلان کے سلاطین نے یہ لقب اختیار کرلیا تھا، اوران کا یہ لقب شاہ اسمٰعیل صفوی کے زمانہ تک قائم رہا،

اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ جیسا کہ کتاب کے بعض داخلی شہادتون سے معلوم ہوتا ہے، ۶۹۳؁ھ سے ۷۰۵؁ھ کے اندر ہے، یہ ابن سینا کی کتاب الشفاء کے طرز پر فارسی زبان مین لکھی گئی، کتاب الشفاء اور درۃ التاج مین مصنّف کتاب کے نقطۂ نظر سے یہ بنیادی تصنیفی فرق ہے، کہ ابن سینا نے حکمتِ نظری کے تمام مباحث کی بنیاد منطقی اصولون پر رکھی ہے، اور علوم ریاضی کو مختصر جگہ دیا ہے، اور علامہ قطب الدین نے اس کے برعکس علوم ریاضی پر مسائل کی بنیاد رکھی ہے، اور منطقی مباحث کو اختصار سے لیا ہے، پھر دوسرا فرق یہ ہو کہ ابن سینا کی کتاب الشفاء مین فلسفۂ مشائین کی ترجمانی کی گئی ہی، اور درۃ التاج مین فلسفۂ اشراقین کو پیش کیا گیا ہے، نیز اس مین کتاب الشفاء سے حکمتِ عملی کا ایک مستقل باب زیادہ ہے جس مین عبادات، فقہ و سلوک عرفا مندرج ہین،

اصل کتاب کا اندازہ اس کے ابواب و فصول کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے، کتاب "فاتحہ" سے شروع ہوتی ہے، جو تین فصلون پر مشتمل اور ہر فصل تین اصولون مین منقسم ہے:-

اصل اول "علی الاطلاق فضیلت علم" کے بیان مین جس مین کتاب وسنت سے علم کے فضائل دکھائے ہین، اور عقلی دلائل سے انھین ثابت کیا ہو، پھر اصل دوم فضیلتِ تعلّم، اور اصل سوم "فضیلتِ تعلیم" کے بیان مین ہے، اوران مین آیات، احادیث، آثار واخبار دلائل میں جمع کئے گئے ہین،

اس کے بعد دوسری فصل "حقیقتِ علم" کے بیان مین ہے، اور یہ بھی چند اصول مین تقسیم ہو،

اصل اول "حقیقتِ علم" کی تفصیل مین اصل دوم، تصورِ علم بدیہی ہے، یا کسبی؟ اگر کسبی ہے تو اُسکی تحدید ممکن ہے یا ناممکن؟ اصل سوم، علم کی تحدید کا ممکن لیکن اس کی تعریف کا دشوار ہونا،

فصل سوم "تقسیم علوم" کے بیان مین، اور یہ بھی تین اصول مین منقسم ہے، اصل اول علم جو کہ مورد تقسیم بن سکے، اصل دوم علم کی تقسیم حکمی وغیر حکمی مین، اور غیر حکمی کی تقسیم علوم دینی وغیر دینی مین، اصل سوم علوم حکمی و دینی اوران کی تقسیمون کے بیان مین،

اس کے بعد اسی فاتحہ کتاب" مین کتاب کے ابواب ومسائل کی فہرست مصنف نے درج کی ہے اس سے کتاب کے مباحث نگاہ کے سامنے آجاتے ہین، مصنف نے باب" کے لئے "جملہ" کا لفظ اختیار کیا ہے، چنانچہ کتاب حسب ذیل جملون یا بابون مین تقسیم ہو :-

جملہ اول، فن منطق مین جو سات جداگانہ مقالون مین تقسیم ہو،

جملہ دوم، فلسفۂ اولیٰ کے بیان مین، یہ دو فنون مین تقسیم کیا گیا، فنِ اول امور عامہ کے بیان مین جس مین سات مقالات ہین، فنِ دوم اعراض وجودی واعتباری کے بیان مین یہ بھی سات مقالات مین ہی،

جملہ سوم، علم اسفل یعنی علم طبیعی کے بیان مین، یہ بھی دو فنون مین تقسیم کیا گیا، فن اول اجسام طبیعی فنِ دوم نفوس وصفات اوران کے آثار کے بیان میں ہے، دونون فنون بھی حسب معمول سات سات مقالون پر مشتمل ہین،

جملہ چہارم، علم اوسط یعنی علوم ریاضی مین، یہ چار فنون مین تقسیم ہے، فن اول اقلیدس (۹ مقالات)

فنِ دوم مجسطی (۳ مقالات) فنِ سوم ارثماطیقی (۴ مقالات) فنِ چہارم علم موسیقی (۵ مقالات)

جملۂ پنجم علم اعلیٰ یعنی علم الٰہی ہیں، یہ دو فنون ہیں، فنِ اول عقل اور اس کے آثار عالم جسمانی وروحانی (۶ مقالات) فنِ دوم، واجب الوجود و حدانیت نعوت جلال الٰہی، کیفیت فعل وغیرہ، (۷ مقالات)

اس کے بعد خاتمہ کتاب ہے جو چار اقطاب پر مشتمل ہے۔

قطب اول اصولِ دین،

قطب دوم فروعِ دین،

قطب سیوم حکمتِ عملی،

قطب چہارم سلوک،

پچھلے ابواب کی طرح ان اقطاب میں بھی تحتانی مقالات، مقدمات و مسائل مندرج ہیں،

مذکورۂ بالا اجمالی فہرست سے اس کتاب کے گوناگون مباحث و مسائل کا ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس تصنیف کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے علمی مسائل، اور اس کی فلسفیانہ موشگافیان، دینی فہم وادراک کے تابع نظر آتی ہیں، اس لئے فلاسفہ وارباب عقل اس کی راہ سے دین کے رشتہ کو پا سکتے ہیں، اور یونانی فلسفہ وحکمت سے متاثر دماغون میں دینی مباحث و مسائل کے دلائل مستحضر ہو سکتے ہیں اسلئے طبقہ عقلا کیلئے یہ ایک سودمند تصنیف قرار پا سکتی ہے،

اس کتاب کے قلمی نسخے یورپ کے مختلف کتب خانون میں موجود ہیں، برٹش میوزیم میں اس کا نمبر ۱۶۶۵۹ ہے، ریونے اس نسخہ کا مفصل حال لکھا ہے (فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ج ۲ ص ۴۳۴) نیز انڈیا آفس میں یہ دو نمبرون ۲۲۱۹ و نمبر ۲۲۲۰ میں موجود ہے، اسی طرح وائنا اور برلن کے کتب خانون میں اس کے نسخے موجود ہیں اور مختلف ممتاز مستشرقین نے مصنف اور اس کی اس تصنیف کے حالات مختلف فہرستون میں لکھے ہیں (فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس جلد ا ص ۴۹۷، ۱۲۱۰ وغیرہ)

اگر علامہ قطب الدین شیرازی کی دوسری تصنیفات کے متعلق بھی جستجو کیجائے تو غالباً یورپ کے مختلف

کتب خانون میں ان کا سراغ لگ سکتا ہے، اور ان کے متعلق مزید معلومات مہیا ہو سکتے ہیں،

ہندوستان کے اہلِ علم کے درمیان بھی علامہ شیرازیؒ کی تصنیفات متداول رہی ہیں، چنانچہ مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی مرحوم نے اپنے ایک تعلیق میں ان کی شرح القانون شرح المختصر، شرح المفتاح، التحفۃ اور نہایۃ الادراک وغیرہ کے مطالعہ کا تذکرہ کیا ہے (تعلیق بر الفوائد البہیہ ص ۵) اس لئے یقین ہے کہ ہندوستان کے مختلف کتب خانون میں بھی ان کی تصنیفات محفوظ ہون گی، آپ بانکی پور، رام پور، اورنٹیل کالج لاہور، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، وغیرہ کی فہرستون سے ان کا سراغ لگا سکتے ہیں،

درۃ التاج کا یہ مطبوعہ نسخہ بھی پانچ قلمی نسخون سے ترتیب پایا ہے، اور بڑے اہتمام سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، اس کے مصحح سید محمد مشکات نے اس پر ایک پرمعلومات مقدمہ لکھا ہے، اور اس کو علٰحدہ علٰحدہ چند جلدون میں شائع کیا ہے، ہمارے یہان اس کی پانچ جلدین جو سوا سوا سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحون پر مشتمل ہین، موجود ہین، پانچوین جلد مین جملہ پنجم کے علم الٰہی کے مباحث ہین، اس کے معنی یہ ہین کہ چھٹی جلد خاتمہ کتاب اور اس کے چارون اقطاب کے مباحث پر مشتمل ہوگی، معلوم نہین آپکے دوست کے پاس اس کی جو دو جلدین ہین، ان مین کہان تک کے مباحث موجود ہین، بہرحال جیسا کہ آپ کو معلوم ہوا، یہ کتاب مطبوعہ کتب مین سے ہے، اس لئے آپکے نسخہ مین جو ندرت ہو سکتی ہے، وہ اس نسخہ کی ذاتی ہوگی، اس کے مطبوع ہونے کی وجہ سے دائرۃ المعارف حیدرآباد مین شاید اس کے لئے گنجایش نہ ہو، البتہ قلمی کتابون کے شائقین آپکے نسخہ کی قدر کر سکتے ہین، ہو سکتا ہے کہ یہ سطرین جب معارف مین شائع ہون تو ان کے پڑھنے والون مین سے کوئی صاحبِ ذوق ایسے نکل آئین، جو آپ کے دوست کے اس نسخہ کی قدردانی فرمائین، اور ان کی نگاہ توجہ سے یہ نسخہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائے اور آپکے دوست کی وقتی ضرورت بھی پوری ہو جائے، والسّلام

"س"

ادبیات

ذوق وشوق!

از جناب انور کرمانی لاہور

سیلِ بلا کو بڑھ کے روک تندیِ موج سے نہ ڈر ۔۔۔ منزلِ ذوق وشوق کی موت بھی اک ہے رہگذر
قیدِ مکان ولامکان توڑ گیا میرا جنون ۔۔۔ رازِ حیات پالیا، اپنی خودی مین ڈوب کر
دل کی متاع بے بہا، عشق کا جذبۂ بلند ۔۔۔ میری یہ آہِ نیم شب، میرا یہ نالۂ سحر
عزمِ حسین سے ہے فاش، معنی لاالہ کا راز ۔۔۔ اب بھی لبِ فرات سے آتی ہے بانگ لاتخف
نکتۂ راہِ اہلِ ہوش و کیف کھول کر گیا بیان کرو ۔۔۔ عقل کا مدعا خبر، عشق کی آرزو نظر
آتشِ گل بھڑک اٹھی شعلہ نواہے عندلیب ۔۔۔ کس کے نفس کے سوز سے صحنِ چمن ہو پُرشرر
معرکۂ وجود مین راز یہی بقا کا ہے! ۔۔۔ زندۂ جاودان ہے وہ جس کی نظر ہو خودنگر
اٹھنے کو ہے وہ انقلاب، سینۂ کائنات سے ۔۔۔ جس کے لئے ہین مہر و ماہ چشم براہ سربسر

یون دلِ ناصبور ہے سینے مین پائمالِ غم!
طائرک بہار ہو جیسے کوئی شکستہ پر

غزل

از جناب رمز گنوری

دل ودماغ پہ چھایا ہوا ہے رنگِ جمود ۔۔۔ ادھر بھی دیکھ لے اونرگسِ خمار آلود
نگاہِ شوق سے مستور دل مین ہے موجود ۔۔۔ کہ اوس کی ذات ہے آئینہ دارِ غیب وشہود

خوشا یہ دورِ محبت یہ ساعتِ مسعود
وہ سامنے ہین مرے اور مین ہون محوِ سجود

تجلیون کی یہان تک ہوئی فراوانی
کہ دامنِ نگہ شوق ہوگیا محدود

تصرفِ نگہ مست اے معاذ اللہ
کہ آج توبہ مری ہوگئی شراب آلود

مین اوس کو دیکھ کے دیوانہ ہوتا جاتا ہون
سنبھال اب مجھے نیرنگیٔ طلسم نمود

سرشکِ غم کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے
بھرے رہین مرے دامن مین گوہرِ مقصود

یہ سرد سرد ہوائین یہ چاندنی راتین
پلادے ساقی ہوش اب آتشِ بے دود

اب آستان پہ اجازت ہو ایک سجدے کی
کہ دل سے تا بہ جبین آگیا ہے ذوقِ سجود

بنادے عالمِ باطن کو عالمِ ظاہر
کہ ہر مقام سے مین چاہتا ہون تیری نمود

محبت اصل حقیقت ہے چھپ نہین سکتی
کہ تہ مز کوششِ اخفائے راز ہے بے سود

بھول گئے!

از جناب شفیع منصور ایم اے شملہ

اب رنگ بہاران کیا کہئے، سب رنگ بہاران بھول گئے
شب ہاے خزان کی ظلمت مین ہم صبح گلستان بھول گئے

سب بھول گئے کچھ یاد نہین کیون مہر بلب ہین کیا کہئے
کچھ تو ہی بتادے ہم کیا کیا اے محفلِ جانان بھول گئے

اک روز جوان کے شانے پر بکھری تھی وہ خودمستی مین
ہم شامِ غم الفت کی قسم وہ زلفِ پریشان بھول گئے

کچھ دیکھا تھا ان آنکھون مین کیا دیکھا تھا اب کیا کہئے
کیا یاد کرین کچھ یاد بھی ہو سب دیدۂ حیران بھول گئے

اب یاد کرین ہم کیا اُن کو، اب یاد کرین وہ کیا ہم کو
سب خواب کی باتین تھین شاید وہ خوابِ پریشان بھول گئے

اب صحرا صحرا پھرنا کیا، اب رونا کیا اب ہنسنا کیا!
منصور وہ نورِ الفت کے وہ رنگ نمایان بھول گئے!!

مطبوعات جدیدہ

مانڈو، مترجمہ جناب مرزا محمد بشیر صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر،

قیمت مجلد سے رغیر مجلد عار، پتہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی،

شادی آباد عرف مانڈو (مالوہ) ایک قدیم تاریخی مقام ہے، جو کم وبیش ڈیڑھ صدی تک اسلامی حکومت کا دار السلطنت رہ چکا ہے، یہ حکومت سلطان محمد بن فیروز تغلق بادشاہ دہلی کے ایک امیر لاور خان غوری نے چودھوین صدی عیسوی کے آخر مین قائم کی تھی، سولھوین صدی کے نصف اول مین سلطان محمود خلجی پر اس سلسلہ کا خاتمہ ہوگیا، لیکن کبری دور تک جبتک مالوہ کا الحاق دلی کی مرکزی حکومت سے نہ ہوگیا یہان مختلف حکمران ہوتے رہے، ان مین دلاور خان غوری، ہوشنگ غوری، محمود خلجی اول، سلطان غیاث الدین اور باز بہادر نے شادی آباد مین بہت سے محلات، مسجدین، مدرسے، باولیان، حوض، تالاب اور دوسری عالیشان عمارتین بنوائین، جو اپنے دور کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھین، مانڈو کا عظیم الشان قلعہ خاص طور سے اہم تاریخی یادگار ہے، اس حکومت کے خاتمہ کے بعد مالوہ کی آب وہوا کی خوبی اور دلکش مناظر کی وجہ سے تیموری سلاطین کو بھی اس سے خاص تعلق رہا، اور وہ سیر وتفریح کے لئے وہان جایا کرتے تھے، شاہجہان کو خاص طور سے مالوہ کی آب وہوا پسند تھی، اس لئے تیموریون نے بھی یہان بعض عمارتین بنوائین، اور پرانی عمارتون کی مرمت کرائی، ان مین سے بعض عمارتین دست برد زمانہ سے کھنڈر بن چکی ہین، لیکن بعض محکمۂ آثار قدیمہ اور ریاست دھار کے بدولت ابتک قائم اور اپنی عظمت گذشتہ کی یاد دلا رہی ہین، جناب غلام یزدانی صاحب ناظم محکمۂ آثار قدیمہ ریاست حیدرآباد نے جنکو آثار قدیمہ سے خاص شغف ہے، ان عمارتون کا مشاہدہ کرکے انکے حالات مین انگریزی مین ایک کتاب "مانڈو دی سٹی آف جوائے" لکھی تھی، جو آکسفورڈ یونیورسٹی

پریس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، مذکورۂ بالا کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے، اسمین مانڈو مین اسلامی حکومت کی مختصر تاریخ اور اس کے آثار قدیمہ کے مفصل حالات ہین بعض عمارتون کے فوٹو کے چربے بھی دیدیئے ہین، اور فنی نقطۂ نظر سے ہر عمارت کی تعمیری خصوصیات، اس کی موجودہ حالت اور جہان تک مل سکے ہین، ان کے تاریخی حالات دیئے ہین، اور جن کتابون اور تصانیف مین ان کا ذکر آیا ہے، ان کے بیانات بھی نقل کر دیئے ہین جس سے اس کتاب کی تاریخی قدر وقیمت بڑھ گئی ہے، مانڈو کے اسلامی دور کی تاریخ فراموش ہو چکی تھی، اس کتاب سے اس کی تجدید ہوگئی، اس کی اشاعت سے اردو مین ایک مفید تاریخی کتاب کا اضافہ ہوا،

مشرق بعید از جناب شاہد حسین صاحب رزاقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۴۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- عہ، پتہ :- دار الاشاعۃ سیاسیہ اشاعت منزل اردو گلی حیدرآباد دکن

ہندوستان سے مشرق بعید کی قربت کے باوجود اردو مین اس کے متعلق بہت کم معلومات ہین، جاپان کی حوصلہ مندیون نے مشرق بعید کی سیاست کو بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا ہے، اس کے پیش نظر جناب شاہد حسین صاحب رزاقی نے اس ضروری موضوع پر یہ کتاب لکھی ہے، کتاب کے شروع مین مشرقی ملکون پر قبضۂ اقتدار کے لئے یورپین حکومتون کی گذشتہ اور موجودہ کشمکش کی تاریخ اور اس کے نتائج بیان کئے ہین، اس کے بعد بحر الکاہل کے تمام بڑے بڑے جزائر اور اس کے ساحلی ملکون کی گذشتہ تاریخ و موجودہ حالات اور ان مین یورپین طاقتون کی مداخلت اور سیاست کی مختصر سرگذشت بیان کی گئی ہے، جس سے ان ملکون کے متعلق جملہ ضروری معلومات حاصل ہو جاتے ہین، کتاب مفید اور پڑھنے کے لائق ہے،

زندہ روس مرتبہ ادارۂ نیا ادب تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ :- کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

ترقی پسند ادیبون نے ایک خاص طرز کے نئے ادب کے علاوہ سوویٹ روس کے متعلق سنجیدہ لٹریچر فراہم کرنے کی بہت کم کوشش کی ہے، اس موضوع پر جو چند متفرق مضامین نکلے ہین، ان کو ادارۂ نیا ادب نے کتابی شکل

ین مرتب کر دیا ہے، یہ مضامین اشتراکیت کے مقصد سویٹ حکومت کے نظام، روسی کسانون اور مزدورون کی زندگی، ان کی تنظیم موجودہ روسی لٹریچر، افسانے، ڈرامے اور دوسرے فنون، اور دوران جنگ مین روسی ادیبون اور فن کارون کی قلمی خدمات وغیرہ سے متعلق ہین، ایک حصہ ان افسانون کا بھی ہے جن سے انقلاب روس اور موجودہ سویٹ زندگی کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، چند انقلابی ترانے بھی ہین، سجاد ظہیر صاحب کا مضمون نسبۃً زیادہ مفید ہے، اس کتاب سے سویٹ روس کے مختلف پہلوون کے متعلق متفرق معلومات حاصل ہو جاتے ہین،

مشاہیر کی بیویان (حصہ اول) از جناب طاہر رفعت، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۰، صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍، پتہ:- دار الاشاعت سیاسیہ حیدر آباد دکن،

اس کتاب مین یورپ کے چھ موجودہ مشاہیر، اسٹالن، مسولینی، چرچل، روزولٹ، جنرل فرانکو، ڈی ویلرا کی بیویون کے حالات ہین، یہ وہ اکابر ہین جن کو اپنے ملکون مین بادشاہون سے زیادہ عظمت وشان اور اختیارات حاصل ہین، اور انھون نے اپنی قوم و ملک کے لئے جو کارنامے انجام دیئے ہین، وہ دنیا کی نگاہون کے سامنے ہین، یہ حالات اس نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہین جن سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ان عورتون نے اپنے شوہرون کی خانگی، قومی وسیاسی زندگی مین کیسی رفاقت کی ہے، اور ان کی ترقی اور ان کے کارنامون مین ان کی بیویون کی رفاقت کا کتنا بڑا حصہ ہے، یہ حالات ان تعلیم یافتہ ہندوستانی خواتین کے لئے خاص طور سے سبق آموز ہین، جن کا مقصد تعیش اور آزادی کے سوا اور کچھ نہین ہے، اس سے ان کو معلوم ہوگا کہ دنیا کے بڑے بڑے اور نامور اشخاص کی بیویون نے ان کی زندگی کے مختلف مراحل مین کس دلسوزی سے رفاقت کی ہے، کتاب مفید اور دلچسپ ہے، دوسرا حصہ مشاہیر مشرق کے حالات مین ہوگا،

دیوان بہرام، مرتبہ جناب مسلم ضیائی، ایم اے، تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۱۲؍ غیر مجلد ۸؍، پتہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی،

اس زمانہ مین جب کہ اردو ہندی کا مسئلہ نہ پیدا ہوا تھا، اور سارے ملک کی مشترک اور ملکی زبان اردو

سمجھی جاتی تھی، پارسی، یورپین اور انگلو انڈین تک اردو زبان سے دلچسپی رکھتے تھے، اور جن کو شعر و سخن کا مذاق تھا وہ اس میں شاعری کرتے تھے، ان کی شاعری کے نمونے اردو میں موجود ہیں، انہی میں ایک پارسی شاعر بہرام جی جاماسپ جی دستور تھے، ان کا زمانہ کچھ بہت قدیم نہیں ہے ۱۸۹۵ء میں ان کا انتقال ہوا، وہ اردو میں صاحب دیوان تھے، جناب سلیم ضیائی نے ایک مقدمہ کے ساتھ اس دیوان کو مرتب اور انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے، دیوان خاصہ ضخیم ہے، گو کلام زیادہ و بلند نہیں ہے، لیکن ایک پارسی کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہے اور بہت سے اشعار تو نہایت صاف اور شستہ ہیں، کلام کا رنگ وہی قدیم ہے جو اس زمانہ میں رائج و مقبول تھا،

حسن ادب و دیگر افسانے، از جناب شوق امرتسری تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ہے، پتہ ملک محمد عارف خان پبلشر کشمیری بازار لاہور،

ترقی پسند ادب کے ذریعہ جس قسم کے پست و مخرب اخلاق افسانوں کی اشاعت ہو رہی ہے، وہ مخفی نہیں، عورتیں فطرۃً کمزور اور ذکی الحس ہوتی ہیں، اسلئے ان پر اس لٹریچر کا نہایت ناگوار اثر پڑ رہا ہے اور بعض نوجوان تعلیم یافتہ لڑکیاں اس ادبی فریب میں گرفتار ہو کر اس ادنیٰ درجہ کے پست افسانوی رومان کو اصلی زندگی سمجھنے لگتی ہیں جس کے نتائج نکلا ہونے کے سامنے آتے رہتے ہیں، جناب شوق امرتسری نے اسکی اصلاح کیلئے یہ اخلاقی افسانے لکھے ہیں، ان میں عورتوں کی اخلاقی و مذہبی تربیت اور ان کی سیرت کی اصلاح و تعمیر کو خاص طور سے پیش کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ افسانے قابلِ قدر ہیں لیکن ان میں دلچسپی و دلکشی کے بجائے واقعہ نگاری کا رنگ آگیا ہے، اخلاقی نصائح یوں ہی کچھ خوشگوار نہیں ہوتے، اس لئے جب تک ان کو دلکش انداز میں پیش نہ کیا جائے اس وقت ان کا اثر نہیں ہوتا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اس کا مقابلہ ترقی پسند ادب جیسے پُر فریب لٹریچر سے ہو،

خانقاہ، از جناب ایم اسلم تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۶۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ:- عبد الحق اکیڈمی اشاعت منزل اردو بازار حیدرآباد دکن،

خانقاہ جناب ایم اسلم کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے، ان کے افسانے تعارف و تبصرہ سے مستغنی ہیں، ان افسانوں میں مصنف کی تمام افسانوی خصوصیات موجود ہیں، اور حسن انشا، اور حسن تخیل دونوں لحاظ سے دلچسپ اور پڑھنے کے لائق